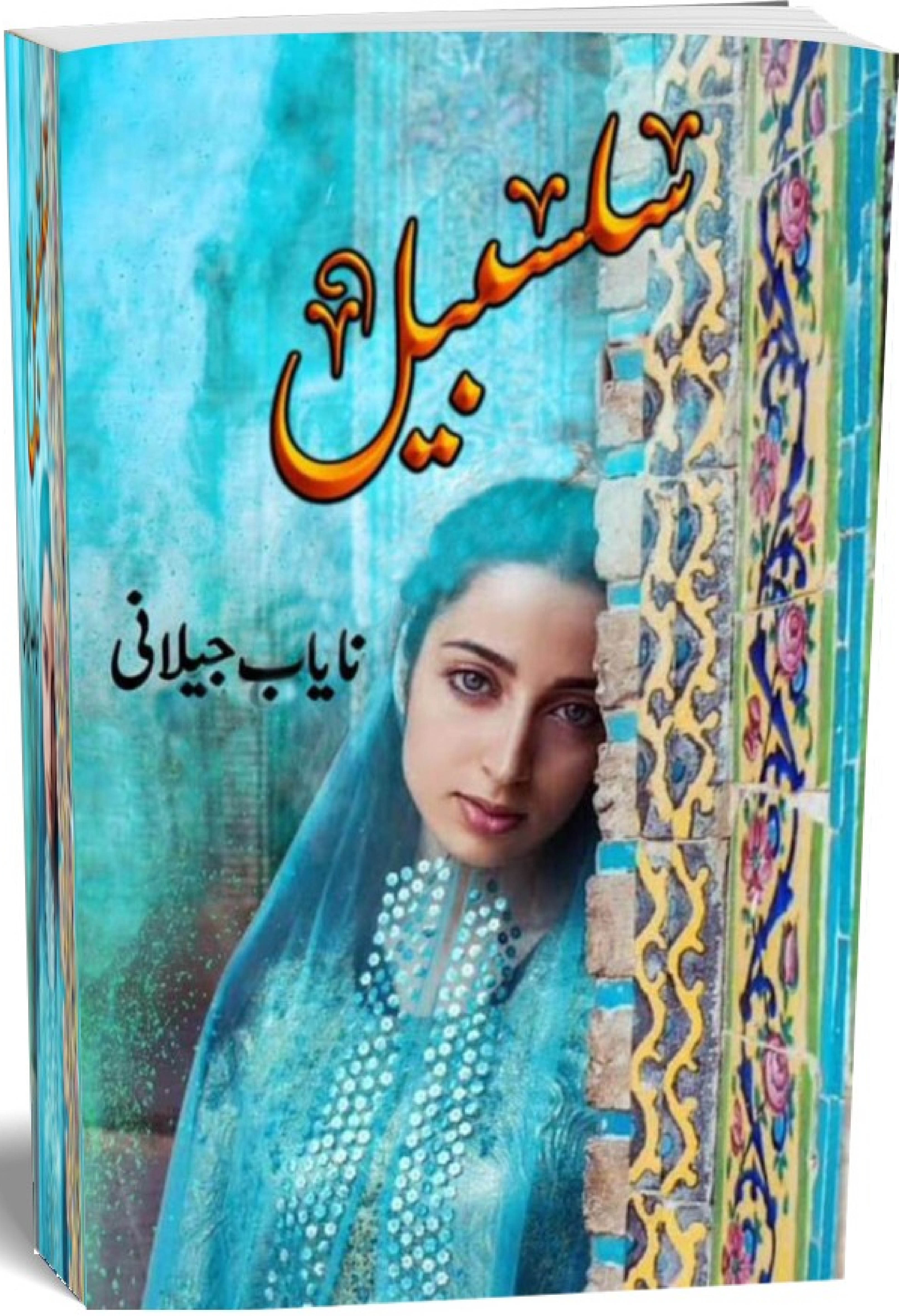
سلسبیل
نایاب جیلانی

سلسبیل

نایاب جیلانی

قسط نمبر 1

میکلوڈ روڈ پر لکشمی انشورنس کمپنی کی عمارت سے کچھ آگے سنیما ہے۔ سنیما سے ادھر ایک مکان چھوڑ کر ایک پرانی کوٹھی ہے۔ کوٹھی کافی کشادہ اور پرانی ہے۔ کتنا عرصہ تو غیر آباد پڑی رہی تھی۔ آج کل یہاں کوئی ڈاکٹر رہ رہا تھا۔ بہت ہی وجیہہ...... اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں۔ انتہائی سفید اور انتہائی خوب صورت، پوری کالونی کے فلیٹس کی لڑکیاں بالکونیوں سے لٹک لٹک کر ان دو بچیوں پہ فدا ہوتی نظریں وارا کرتی تھیں۔

ڈاکٹر امریکہ سے آیا تھا۔ کسی بڑے اسپتال میں جاب کرتا تھا۔ صبح بیٹیوں کو ساتھ ہی لے کر جاتا تھا اور اکثر رات گئے واپسی پر نیند میں اتری پریوں کو کندھے سے لگائے گاڑی سے نکالتا۔ اس منظر کو دنیا کا حسین ترین منظر کہا جا سکتا تھا۔ ایک باپ کی اپنی بیٹیوں سے والہانہ محبت......

شافیہ نے اس پدرانہ محبت کا ذائقہ کبھی نہیں چکھا تھا۔ اس لیے شافیہ کی نگاہوں کا مرکز سوائے ان دو پریوں کے اور کون ہو سکتا تھا؟

وہ کالونی کی باقی لڑکیوں کی طرح بچیوں کے باپ پر فدا ہرگز نہیں تھی۔ شافیہ کے بابا کی دوسری بیوی سمیرا اس کی سنکی بڑھیا مسز نرجس خیام کی بھتیجی ہوا کرتی تھی۔ سمیرا کے اصرار پر شافیہ کے بابا فرمان اپنا اچھا بھلا مکان بیچ کر یہاں اس کالونی میں کرائے دار بننے آ گئے تھے۔ جو کالونی مسز نرجس خیام کی ملکیت تھی۔

سمیرا انجانے کس لالچ میں یہاں منتقل ہوئی تھی؟ شاید اس لیے کہ نرجس خیام اپنی جائیداد سمیرا کے نام کر دیں گی؟

ایسا ہوتا کچھ دکھائی تو نہیں دیتا تھا۔
سمیرا نے کوئی دس ہزار خواب ایسے دیکھے تھے جس میں اس نے اپنی پھوپھی کو مرتے دیکھا تھا۔
کئی سو مرتبہ مرزا تمام بیگ کو پھیلی فائلوں کے ہمراہ دیکھا تھا جس میں وہ بیرسٹر خیام اور سمیرا کی پھوپھی نرجس کی تمام پراپرٹی سمیرا کے نام کرتے دکھائی دیے تھے۔
مگر یہ خواب ابھی تک تعبیر سے کوسوں دور تھا۔
سمیرا نیند سے بیداری پر صدمے سے دوچار ہو جاتی تھی۔ کئی کئی گھنٹے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ خواب تھا یہ حقیقت......
شافیہ کو نہ تو سمیرا کے لالچ سے دلچسپی تھی اور نہ پراپرٹی سے۔ اسے دلچسپی تھی تو بس سنکی نما اس بڑھیا سے جو شافیہ کا کل جہان تھی۔ نرجس خیام شافیہ کی کل کائنات تھیں۔ اس نے زندگی کا بہت سارا وقت ان کی ممتا بھری آغوش میں گزارا تھا۔
شافیہ کو ان سے لافانی محبت تھی اور نرجس خیام کو اپنی سوتن کے بیٹے ہشام عیسیٰ سے۔
شافیہ حیران ہوتی تھی کہ کوئی کیسے اپنی سوتن کے بیٹے سے اتنی شدید محبت کرسکتا ہے؟ وہ بھی بن دیکھے، بن ملے......آواز سے آواز تک۔ نرجس خیام اپنے بیٹے کی وطن واپسی کے دن گن گن کر گزار رہی تھی۔

''ہشام آئے تو میں جاؤں۔''
شافیہ نے اکثر انہیں کہتے سنا تھا۔
بھلا کہاں جاؤں؟ شافیہ تب سمجھ نہیں سکتی تھی۔
ادھر سمیرا چاہتی تھی مسز نرجس راتوں رات اگلے جہاں کی سیر پہ نکل جائیں اور ہشام کے آنے سے پہلے پہلے وہ تمام پراپرٹی بیچ باچ کر ملک بدر ہو جائے۔ سمیرا کے خطرناک سپنوں کا ابھی کسی کو کوئی گمان نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھی بس پھوپھی کسی نہ کسی طرح ''مرحومہ'' ہو جائیں اور وہ بہت دھڑلے سے تمام پراپرٹی (کوٹھیوں، فلیٹس، دکانوں) پر قبضہ کرلے گی۔ فلیٹ کا کرایہ بھی نہیں ادا کرنا پڑے گا۔ یہ

سارے خواب تب زوال پذیر ہوئے جب ایک سفید خوب صورت ٹھنڈی سرنگ نما جہاز سے بڑھیا کا بیٹا اتر آیا۔

سمیرا کے سینے پر تب سانپ لوٹ گئے تھے۔ جس پھوپھی کا وہ اس کی زندگی میں سوگ منانا چاہتی تھی۔ اس کی قل کے بغیر ہی واپس لوٹ آئی۔

''ساری زندگی پوچھا تک نہیں۔ پلٹ کر دیکھا نہیں اور اب بڑھیا کے مکانوں، دکانوں پر قبضہ کرنے آ گیا ہے۔'' سمیرا کا مارے صدمے کے برا حال ہو گیا۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ بڑھیا نے چار سال خدمت کروائی۔ جب چاہتی سمیرا کو گالیاں نکال کر گھر سے دفعان کر دیتی تھی۔ جاتے سمے گلے کی چین، کانوں کے بالے اور چار موتی انگوٹھیاں بھی خیرات کر گئی۔ ایک شب وکیل نے آ کر سمیرا کے ارمانوں پر مزید شب خون مارا۔

''مسز نرجس خیام عیسیٰ اپنی تمام منقولہ غیر منقولہ جائیداد اپنے بیٹے ہشام عیسیٰ کے نام منتقل کر گئی تھیں۔''

اس کے بعد سمیرا کے آنسو گرے ہی نہیں اور جو مرحومہ کو کوسنے دیے۔ ان کا حساب شمار نہیں تھا۔

☆......☆......☆

ہشام عیسیٰ کی یہ پرانی کوٹھی بہت ساری حسیناؤں کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ جس کا ایک حصہ نہایت ہی خستہ حال تھا۔ شاید ایک زمانے میں یہ پرانا حصہ مہمان خانہ رہا ہو۔ محترمہ نرجس خیام اردو کی پروفیسر ہوا کرتی تھیں۔ ایک زمانے تک ان کے شاگرد یہاں تسلسل سے آیا کرتے تھے۔ کوٹھی کے ایک طرف الگ سے چار کمروں کا مکان تھا۔ جس میں شاید نوکروں کا بسیرا تھا۔ علی بخش، رحمان، دیوان......

کوٹھی کی دیوار بھی سیلی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ سے اکھڑا پلستر بتاتا تھا کہ سالوں میں ان دیواروں پہ توجہ نہیں کی گئی۔ مکین جیسے اپنے مکان سے ہی بے نیاز تھے۔ منڈیر کی اکھڑی ہوئی اینٹیں اکثر تیز آندھی کا زور نہ سہتے ہوئے نیچے آ گرتی تھیں جن کو دیوان صبح سویرے طوفان تھمتے ہی اٹھا رہا ہوتا تھا۔

کوٹھی کے صحن میں چارپائی ہمیشہ بچھی رہتی تھی۔ یہ چارپائی نرجس خیام نے کبھی نہیں اٹھوائی

تھی۔ شاید اس چارپائی سے محترمہ کے مرحوم شوہر کی یادیں وابستہ تھیں۔

ایک زمانے میں بیرسٹر خیام عیسیٰ چارپائی کی اجلی چادر پہ فراش ہوا کرتے تھے۔ ململ کا کرتہ پہنے، تہبند باندھے، گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے حقہ گڑگڑاتے تھے۔ سرخ و سفید رنگت، بھرا بھرا جسم، سر کے بال کچھ سفید، کچھ سیاہ، داڑھی گھنی۔ چارپائی کے سامنے بید کی کرسیاں تھیں۔ ان پر دو تین آدمی بیٹھ کر خبریں سنایا کرتے تھے۔

یہاں پر ادب، سیاست، مذہب، شاعری ہر موضوع پہ گفتگو ہوتی تھی۔ اندر سے دیوان شیشے کے تھرموس میں قہوہ بھر بھر کے لایا کرتا تھا۔

کبھی کبھار خیام عیسیٰ اداس ہو جایا کرتے تھے۔ اپنی فرنگن بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے بیٹے کے نام انگریزی میں خطوط بھی لکھا کرتے تھے۔ تب نرجس خیام محرابوں کی اوٹ میں کھڑے ہو کر اکثر دعا کرتی تھیں۔

''خدارا! خیام عیسیٰ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ خدارا! ہشام لوٹ آئے۔'' یہ ایک محبت کرنے والی بیوی کے اپنے شوہر سے شدید محبت کے ضابطے تھے۔

نرجس خیام ایک سخت گیر استاد تھیں۔ جن دنوں سمیرا کا کوٹھی میں قیام تھا۔ ان دنوں شافیہ اکثر نرجس خیام کے زیر عتاب رہتی تھی۔ وہ اسے ایف اے کی اردو پڑھاتے ہوئے زور سے چپت لگا دیتی تھیں۔ ایک دفعہ گورنمنٹ کالج کی چار پانچ لڑکیاں حاضری کے لیے تشریف لائیں۔

کالج کی مخلوق اور بنے سنورے نا...... یہ کس قاعدے میں لکھا ہے؟ پاؤڈر کے غازے، ابروؤں کے خم، زلفوں کے بل، ہونٹوں کے رنگ و لعلین نے نرجس خیام کو آگ بگولا کر دیا تھا۔ ان کی گندمی رنگت میں سرخیاں اتر آئی تھیں۔ چاروں گل چہرہ اور نازک اندام۔ ان میں ایک سمیرا کی بیٹی عریشہ بھی شامل تھی۔ انہوں نے سب کی کلاس لے ڈالی تھی۔

''سادگی میں خوب صورتی، اور حیا میں حسن ہے۔ ساری کی ساری بے حیا...... ماؤں نے تربیت کیا کی ہے۔ کچھ اس بچی شافیہ سے سیکھ لو۔''

تب سے لے کر اب تک عریشہ کی نظروں میں شافیہ کا وجود چبھتا تھا۔ ایک کانٹے کی طرح۔ ایک پھانس کی طرح۔

یہ پھانس تب بڑھی تھی۔۔ جی ہاں، جب ایک شب بہت ہی اچانک ہشام عیسیٰ کا زندگی میں پہلی مرتبہ پاکستان نزول ہوا تھا۔

☆......☆......☆

جاڑے کے دن تھے۔ اور راتیں خنکی میں غرق...... دن کو کاموں کا انبار ہوتا تھا اور رات کو نرجس خیام جن کو سب ''جی جی'' کہتے تھے ان کے ساتھ وقت گزرتا۔ ان کے پیروں کی مالش اور ٹانگیں دبانا، کوئی کتاب پڑھ کر سنانا، پھر کسی غلطی پر گھنٹوں ان کی ڈانٹ سننا۔

سمیرا نے بوریا بستر سمیٹا اور عریشہ، شافیہ کو ہمراہ لیے پھپھی کے گھر آ دھمکی تھیں۔ جی جی کو ان کی آمد ناگوار نہیں گزری۔ البتہ جی جی کو سمیرا کے شوہر سے الرجی تھی۔ بھتیجی کو پاس رکھ لیا اور اس کے شوہر کو فلیٹ دے دیا۔ جس کا کرایہ وہ باقاعدگی سے وصول کرتی تھیں۔ جس پر سمیرا کو بہت تپ چڑھتی تھی۔ مگر جی جی کے مرنے تک وہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہتی تھی۔

جی جی کے پرانے نوکروں میں دیوان کا درجہ اور احترام سب سے زیادہ تھا۔ دیوان چالیس سال سے یہاں ملازمت کر رہا تھا۔ جب آیا تو مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ اب داڑھی مونچھیں سفید ہو چکی تھیں۔ داڑھی تو خیر منڈوا دی تھی۔ مونچھوں پر خضاب لگایا کرتا تھا۔ یہ خضاب اکثر اڑا ہی رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے مونچھوں کی رنگت عجیب تھی۔

شاید خاکستری یا شاید اگرئی......؟

جی جی اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں خاص ضابطوں کی پابند تھیں۔ وہ گھر کا سارا حساب کتاب خود رکھتی تھیں۔ اپنی سب شاگردوں کے خطوط کا جواب لکھتی تھیں مگر خود سے صرف ہشام کو خط لکھا کرتی تھیں۔ اردو کی پروفیسر تھیں۔ اکثر انگریزی میں خط لکھتے جھنجھلا جاتی تھیں مگر اپنے مرحوم شوہر کے بعد انہوں نے ہشام کو خط لکھنا ترک نہیں کیا تھا بلکہ اپنے مرحوم شوہر کے بعد اس روایت کو ہمیشہ برقرار

رکھا۔ انہیں ہشام کے جوابی خط کا بھی انتظار رہتا تھا۔ حالانکہ اس تیز رفتار زمانے میں خطوط کون لکھتا تھا۔ ٹیلی فون، ویڈیو کالز، ای میل کا زمانہ اور خطوط...... مگر یہ روایت جی جی کے گھر میں برسوں سے بڑے قرینے کے ساتھ چل رہی تھی۔ دوسری طرف تیز رفتار دنیا میں بیٹھا انسان بھی انتہائی فرصت سے مہینے کی آخری تاریخوں میں ایک خط لکھ کر روانہ کر دیتا تھا۔ شاید وہ ان دو لوگوں کو ان کی خوب صورت دنیا سے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ اور نہ وہ ان کو یہ شعور دینا چاہتا تھا کہ دنیا خطوں کے زمانے سے بہت آگے نکل چکی ہے۔

اکثر فون کی گھنٹی بھی بجتی تھی۔ جی جی اپنے تخت پہ بیٹھ کر ہی آواز دیتی تھیں۔

''شافیہ! فون اٹھاؤ...... کھونٹی سے لٹکی تار احتیاط سے اتارنا۔ فون میرے پاس لے آؤ۔ ہشام کی کال ہے۔ اس نمبر پر ہشام کے علاوہ اور کسی کی کال آ بھی نہیں سکتی۔''

جی جی کا چہرہ ہشام سے بات کرتے کرتے کئی رنگ بدلتا تھا۔ ان میں ہر رنگ محبت کا تھا اور سب سے گہرا رنگ ممتا کا رنگ تھا۔ جو ہر رنگ پر غالب آجاتا تھا۔

''کوئی سوکن کے بیٹے سے اتنی محبت کر سکتا ہے؟'' شافیہ اکثر سوچتی تھی۔

ایک دن جی جی نے شافیہ کو بتایا۔

''ہشام بیرسٹر صاحب کی بڑھاپے کی اولاد ہے۔ اگر ہماری وقت سے اولاد ہوتی تو ہشام جتنا ہمارا پوتا ہوتا۔''

ان کی آنکھیں ہشام کے نام پر چمک اٹھتی تھیں۔

''تو وہ پاکستان کیوں نہیں آتے؟'' ایک دن شافیہ نے دل کڑا کر کے سوال پوچھ ہی لیا تھا۔

''پہل تو وہ منحوس آنے نہیں دیتی تھی۔'' سوکن کا ذکر جی جی کو بیزار کر دیتا تھا۔

''اب اس کی ڈاکٹری کی پڑھائی کے مسائل ہیں۔'' وہ اداس ہونے لگتی تھیں۔

''ہشام آپ سے ملنے تو آتے ہی ہوں گے جی جی! چھٹیوں میں تو ضرور آتے ہوں گے۔'' شافیہ اشتیاق سے پوچھتی تھی۔

''نہیں تو......'' جی جی کا رنگ پھیکا پڑ جاتا۔

''آپ نے ان کو دیکھا تو ہوگا۔'' شافیہ کا اشتیاق اور بڑھتا۔

''ہاں، دیکھا تو ہے۔'' وہ تکیے کے نیچے سے تصویروں کا ڈھیر نکال کر شافیہ کے سامنے رکھ دیتی تھیں۔ بچپن سے جوانی تک کی ہر ہر تصویر جب وہ ایک خوبرو اور اکڑو سا جوان لگتا تھا۔ جی جی اور ان کے میاں کا کوئی عکس، ہشام کے چہرے پہ نہیں تھا۔

وہ ایک مغرور انسان لگتا تھا۔ شافیہ کا جانے کیوں دل بجھ سا گیا۔ ہشام کا جی جی سے اتنا ذکر سن رکھا تھا کہ اب ہشام کے نام سے عقیدت سی ہو چکی تھی اور یہ عقیدت بہت سے طریقوں میں ڈھل کر محبت میں ایسی بدلی کہ معصوم سی شافیہ کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی تھی۔ سمیرا کو شافیہ کا جی جی کی قربت میں وقت گزارنا غصہ تو دلاتا تھا مگر اس کا کوئی حل بھی نہیں تھا۔ اس کی اپنی بیٹی عریشہ اتنی کاہل اور ہڈ حرام تھی کہ جی جی سے مطلباً بھی بات کرنا گوارا نہیں کرتی تھی کجا کہ ان کا کوئی کام اپنے ہاتھ سے سرانجام دینا۔ سمیرا کی بہت کوشش رہی کہ عریشہ جی جی کا دل جیتنے کی کوشش کرے۔ کیا پتا عریشہ سے خوش ہو کر اپنا ایک فلیٹ ہی اس کے نام کر دیں۔ مگر عریشہ مطلب کی خاطر بھی یہ قربانی دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''مجھ سے نہیں بڑھیا کی خوشامد ہوتی۔ شافیہ اتنی خدمت تو کرتی ہے۔ شافیہ کی خدمت سے متاثر ہو کر اگر فلیٹ شافیہ کو ملا تو وہ ہمارا ہی ہوگا۔ بے فکر رہیں۔'' عریشہ کی بے خیالی اور لاپرائی میں کہی بات کچھ ہی مہینوں بعد کس انداز میں پوری ہونے والی تھی، یہ تو کسی کے وہم و گمان میں ہی نہیں تھا۔ جی جی شافیہ سے اتنا خوش ہوں گی کہ اپنی سب سے قیمتی چیز ہی شافیہ کے حوالے کر دیں گی۔

''تو اپنی ہڈ حرامی سے باز نہ آنا۔'' سمیرا حلق تک کڑوی ہو گئی تھی۔ عریشہ اور اس کا باپ دونوں کاہل، سست اور کام چور تھے۔

سمیرا کے پاس ایسا کوئی اسم نہیں تھا جسے پڑھ کر ان دونوں پر پھونکتی اور یہ دو لوگ کسی کام جو گے ہو جاتے۔

''کم سے کم پڑھائی ہی کر لے، اس منحوس شافو کو دیکھ...... یا تو جی جی کے چرنوں میں گھسی رہتی ہے یا کتابوں میں سر دیے پڑھتی رہتی ہے۔'' سمیرا نے عریشہ کو موبائل میں منہ دیے دیکھ کر لتاڑا تھا۔

''تو کون سا علامہ بن گئی ناں...... ایک ایف اے تو اس سے پاس نہیں ہو رہا۔'' عریشہ نے نخوت سے سر جھٹکا تھا۔

''ایف اے تم سے پاس نہیں ہو رہا تھا۔ مر مرا کے بی اے تک پہنچی ہو۔ وہ پڑھائی میں تم سے بہت اچھی ہے۔'' سمیرا نے اس کی آنکھیں کھولی تھیں۔ عریشہ کا منہ اتر گیا تھا۔

''میری بے عزتی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے مت دیا کریں۔''

''تم بھی ہوش کے ناخن لے لو۔ فیشنوں اور سہیلیوں سے فرصت نہیں تم کو......'' سمیرا دانت کچکچا کر رہ گئی تھی۔

''تو کیا کروں......؟'' عریشہ پھٹ پڑی۔

''کچھ نہ کرو...... بس اتنا احسان کرو کہ جی جی کی خیر خبر لیتی رہو۔ عنقریب ہشام آ رہا ہے۔ جی جی سے اتنا لگاؤ رکھو، اتنی خوشامد کرو کہ وہ ہشام کو مجبور کر دیں۔ یہاں رشتہ کرنے کے لیے......'' سمیرا کی پلاننگ سن کر عریشہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

''ماما......!'' عریشہ نے کھلا منہ بمشکل بند کیا اور بولی۔

''کون سے سپنے دیکھتی ہیں آپ......؟ وہ ہشام، یہاں کی کسی لڑکی سے جی جی کے کہنے پر شادی کر لے گا؟ نکل آئیے اس خوش فہمی سے۔ وہ یہاں کسی اور مقصد کے لیے ضرور آ سکتا ہے۔ شادی کے لیے ہرگز نہیں۔''

عریشہ نے جیسے ہنسی اڑائی تھی۔ بات اس کی اتنی غلط بھی نہیں تھی مگر خواب دیکھنے میں کون سا پیسہ خرچ ہونا تھا۔ سمیرا نے دل ہی دل میں خوب پلاننگ کر رکھی تھی۔ اسے امید تھی یہ گیم وہ آسانی سے کھیل سکے گی۔

مگر ان ہی دنوں سمیرا کی لاپروائی سے گیلری کا فانوس گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ جی جی کو اپنے گھر کی چیزوں سے بڑا پیار تھا۔ اور ویسے بھی جی جی ان لوگوں میں سے تھیں جو گلاس ٹوٹنے کو بھی بڑا نقصان سمجھتے تھے۔ یہ تو لاکھوں مالیت کا فانوس تھا۔ جو ان کے مرحوم شوہر فرنگیوں کے کسی دیس سے لائے تھے۔

''ساری زندگی کی تم نکمی اور ناکارہ ہو۔ فانوس ایسے صاف کرتے ہیں؟ بے عقل عورت! تم

سے سمجھدار تو یہ تمہاری بیٹی شافیہ ہے۔ اپنی ماں پہ پڑی ہے۔ صد شکر کہ تمہاری تربیت کا اثر نہیں۔ کچھ اس بچی سے تم دونوں ماں بیٹی سیکھ لو۔'' جی جی کے الفاظ سمیرا کو اپنی توہین لگے تھے۔ نوکروں اور شافیہ کے سامنے اتنی ذلت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اسی جذباتی وقت میں سمیرا نے اپنے فلیٹ پر واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سونے پہ سہاگہ جی جی نے جھوٹے منہ بھی نہیں روکا۔

''اٹھو عریشہ! سامان لاؤ۔ یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ سارا دن مفت کی خدمتیں کرو اور بے عزتی کا بار الگ سے اٹھاؤ۔'' سمیرا ابھی جی جی کی بھتیجی تھی۔ پارہ چڑھ گیا، جی جی کو ذرا پروا نہ ہوئی۔

''نہ بی بی! میں باز رہی ایسی خدمتوں سے۔ آئے دن نقصان، پیسے درختوں پر نہیں لگتے۔''

''آپ کی تو پیسے کی بھوک کبھی نہیں ختم ہوئی۔ اتنی دولت نجانے قبر میں لے کر جانی ہے۔ لاکھوں کے حساب سے تو کرایہ آتا ہے۔ نجانے تجوریاں بھر بھر کے کس کنویں میں دفنا آتی ہیں۔'' سمیرا نے بھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑے تھے۔

''ہشام کی پڑھائی سینکڑوں میں نہیں، ہزاروں ڈالروں میں ہوتی ہے۔ اتنی مہنگی پڑھائی ہے۔ پھر دوسرے اخراجات، مکان کے کرائے، نشئی ماں کا علاج...... مہینے کے آخر تک سارا جمع جتھا وہاں بھجوا دیتی ہوں۔ نوکروں کی تنخواہیں اور راشن کا خرچہ نکال کر بچتا ہی کیا ہے؟'' جی جی کا یہ انکشاف شافیہ کے لیے بڑا ہی حیران کن تھا۔ ایک دھماکا نما۔

''ہاں...... ہاں! سارا کچھ پھپھا اور آپ نے اس فرنگن کے بیٹے اور فرنگن پہ لگا دیا۔ ہشام نے کبھی یہاں آ کر تھوکا بھی نہیں، اس کی ماں سانپ بن کر لپٹی رہی اس کے ساتھ۔ ساری زندگی چار خطوط اور گنتی کی کالوں کے سوا ہشام نے آپ کو دیا ہی کیا ہے۔ خدمتیں کرنے کو ہم اور جائیدادیں بٹورنے کو ہشام۔'' سمیرا کے دل کی جلن زبان پہ آ ہی چکی تھی۔

''ہشام اپنی پڑھائی مکمل کر کے ہمیشہ کے لیے پاکستان آ جائے گا۔ یہ اس کا اپنے مرحوم والد سے وعدہ ہے۔ یہاں اپنا ہسپتال بنائے گا۔'' جی جی نے اپنی طرف سے سمیرا کا منہ بند کروانا چاہا تھا۔

''خواب سہانے ہیں۔ دیکھتی رہیں۔'' سمیرا کا جلن کے مارے برا حال تھا۔

''باپ کے مرنے پہ نہیں آیا۔ آپ کے جنازے کو خوب کندھا دے گا۔ ساری زندگی پرائی اولاد سے آس لگا کر بیٹھی رہی ہیں آپ۔ میرے بچوں کو اپنا نہیں سمجھا۔ ہم تو آپ کا خون بھی ہیں۔'' سمیرا کو بات کرتے یہ اندازہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی بات سننے والے کے دل پہ لگ رہی ہے یا جگر پہ......

جی جی کا رنگ اڑ گیا۔ جسم کپکپا گیا۔ شافیہ گھبرا کر ان کے قریب ہو گئی تھی۔ اس نے غیر ارادتاً جی جی کا کپکپاتا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ جی جی کو جیسے لمحوں میں ڈھارس پہنچی تھی۔ ان کے چہرے کی رنگت بحال ہونے لگی۔

''سمیرا......!'' جی جی جیسے ڈھے گئی تھیں۔

''ہاں، ہاں...... جا رہی ہوں۔'' سمیرا نے کسمسا کر کہا۔ ''مگر شافیہ کو ساتھ لے کر۔''

اگلا دھماکا جی جی کی جان کے لیے کافی تھا۔ ان کا منہ اتر گیا۔

''شافیہ چلی جائے گی......؟'' جی جی کا دل حلق میں آ گیا تھا۔ شافیہ ان کی کیفیت سمجھ رہی تھی مگر اس کے پاس جی جی کی تشفی کے لیے الفاظ کم پڑ گئے تھے۔ کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ سمیرا نے جو کہہ دیا ہے، وہ پتھر پہ لکیر ہے۔

''میں آ جاؤں گی۔'' شافیہ نے دل ہی دل میں جی جی کو تسلی دی تھی۔ لیکن اس کی یہ تسلی اتنی کارگر نہیں تھی۔

''نہ جاؤ......'' بالآخر جی جی نے کہہ ہی دیا۔

''آؤ شافیہ......'' سمیرا نے شافیہ کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور دہلیز پار کر لی۔ جی جی کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح تخت پر ڈھے گئی تھیں۔

☆......☆......☆

دن ویران اور شامیں اداسی پہ محیط تھیں۔

جی جی کی ساری مصروفیات ہشام کی تصویروں یا بیرسٹر صاحب کی یادداشتوں تک محدود ہو گئی تھیں۔ وہ اکثر پرانے البم اٹھا کر دیوان کے سامنے رکھ دیتی تھیں۔

''بیرسٹر صاحب گھر میں تو تہبند کرتا پہنتے تھے مگر دوروں پہ جاتے یا باہر نکلتے تو پتلون کوٹ زیب تن کرتے تھے۔ کبھی فراک کوٹ کے ساتھ شلوار اور ترکی ٹوپی پہنتے۔ ولایت جانے سے پہلے وہ پنجابیوں کا روایتی لباس پہنتے تھے۔ کبھی شیروانی اور چست پاجامہ بھی پہنتے تھے۔'' جی جی یادوں کی راہگزر پہ چلتے چلتے بہت دور نکل جاتی تھیں۔ ایک ایک تصویر میں ان کی یادیں بند تھیں۔

''بیرسٹر صاحب کھانا کم کھاتے تھے مگر خوب اچھا کھاتے تھے۔ ہشام بھی ایسا ہی ہے۔ کم کھانے کھاتا ہے مگر اچھا کھاتا ہے۔ مدت سے بیرسٹر صاحب کا دستور رہا کہ رات کو کھانا نہیں کھاتے تھے۔ صرف نمکین کشمیری چائے پہ اکتفا کرتے تھے۔ دستر خوان پر دو تین سالن ضرور ہوتے تھے۔ پلاؤ اور کباب انہیں بہت مرغوب تھے۔ شب دیگ تو بہت پسند تھی۔ جاڑے کے دنوں میں بڑے چاؤ کے ساتھ شب دیگ پکواتے تھے اور خشکے کے ساتھ کھاتے تھے۔ یاد ہے تم کو دیوان! پھلوں میں ان کو بس آم پسند تھے۔ آموں کی فصل میں لگن اور سینیاں بھر کے بیٹھ جاتے تھے۔ خود کھاتے، احباب کو کھلاتے، لطیفے کہتے، مشاعرے پڑھتے...... میرا ہشام بھی ایسا ہی ہے۔ اتنا ہی ہر دلعزیز، اتنا ہی محبت کرنے والا...... جانِ محفل...... دوسروں کے لیے ہر وقت تیار۔ خود کے لیے نہیں، دوسروں کے لیے جینے والا۔ انسان دوست، انسانیت سے محبت کرنے والا۔''

جی جی کی ہر بات بیرسٹر صاحب سے شروع ہوتی اور ہشام پہ آ کر ختم ہوتی تھی۔ دہلیز میں کھڑی رکابی میں کھیر لیے شافیہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ اس نے خوان کے نیچے سے رکابی نکال کر جی جی کے سامنے کی۔

''سلام جی جی!'' شافیہ کی مدھر آواز سے ہال کمرے کے ماحول کا سارا فسوں ٹوٹ گیا تھا۔

دیوان کے چہرے پر بھی مسکان کھل اٹھی۔

''شکر ہے بٹیا رانی آ گئی۔ جی جی صاحب بڑی اداس ہو رہی تھیں۔''

''میری شہزادی......!'' جی جی نے اپنی بانہیں پھیلا دی تھیں۔ اور شافیہ ان کی محبت بھری نرم گرم پرسکون آغوش میں سما گئی۔ جی جی کے وجود کی مہک نے اس کا حصار کر لیا تھا۔

''آپ سے میری امی کی خوشبو آتی ہے جی جی۔'' شافیہ کی آنکھوں میں نمی بھر گئی تھی۔

''پگلی! میں تیری ماں ہی تو ہوں۔'' انہوں نے اس کی صبیح پیشانی چوم لی تھی۔ شافیہ کو دیکھ کر انہیں کبھی اپنی بیٹی کی کمی کا احساس نہ ہوا تھا۔

''سمیرا بڑے کروفر سے تم کو مجھ سے چھین کر لے گئی۔ آج بھی اور بہت پہلے بھی۔ جب چار پانچ سال کی تھی تم۔ نکال دیا تھا اس نے تمہیں۔ نئی نئی شادی کے خمار میں تھی۔ ہوش سنبھالا تو اپنے کام کروانے کو لے گئی تھی۔ سمیرا کی خود غرضیوں کے قصے چہار جانب مشہور ہیں۔ اپنی بیٹی پچھلے شوہر سے ساتھ لے آئی اور شوہر کی بیٹی کو چلتا کیا۔ پورا خاندان اس سے ناراض رہا......'' جی جی کو بہت کچھ یاد آنے لگا تھا۔

شافیہ کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ یاد تو اسے بھی بہت کچھ تھا۔ مگر وہ فی الحال کچھ یاد کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''کیسے بھیج دیا اس فسادن نے تمہیں......؟'' جی جی کو کھیر کی کٹوری پکڑتے اچانک خیال آیا تھا۔

چاندی کے ورق سے سجی ٹھنڈی کھیر کا ذائقہ زبان میں گھلنے لگا تھا۔

''میری بیٹی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔'' جی جی نے دل کھول کر تعریف کی تھی۔ شافیہ مسکرادی۔

''چھپ چھپا کے آئی ہوں۔''

''تو کہاں گئی ہے ملکۂ فساد؟'' جی جی نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

''وہ اسود کی امی نے بلایا ہے۔'' شافیہ نے کچھ جھجکتے ہوئے بتایا تھا۔ اسود کی امی، جی جی کی بڑی بھتیجی تھی۔ سمیرا سے بھی دو ہاتھ آگے کروفر اور نخرے میں......اور مزاج سوا نیزے پر۔ اسود کا نام لیتے ہی شافیہ کا رنگ بدل گیا تھا۔ اسود تھا بھی ایسا۔ جسے دیکھ کر لڑکیاں سانس روک لیں۔ خوبرو اور بہت ہی لائق مگر نخرا اس میں بھی بلا کا تھا۔ جی جی کا ماتھا ٹھنک گیا۔

''فرح نے بلایا سمیرا کو......؟''

''خود بھی رات کو آئی تھی۔ آپ کو نہیں پتا جی جی! فرح خالہ نے اسود کے لیے میرا رشتہ مانگا ہے۔'' شافیہ نے سر جھکا کر دھڑکتے دل کے ساتھ بتایا تھا۔ اسود کا رشتہ شافیہ کے لیے آنا ایک معجزہ تھا۔ اسود ایسا لڑکا تھا جس کے خواب خاندان کی ہر لڑکی نے ضرور دیکھے تھے۔ پھر شافیہ جیسی لڑکی کے لیے

اسود کا رشتہ؟ جی جی کا ماتھا ایسے نہیں ٹھنکا تھا۔

''سمیرا ہونے دے گی یہ رشتہ؟''

''ابھی تک تو کوئی ہنگامہ نہیں...... دونوں بہنوں کی صلاح ہے یا نہیں...... کچھ پتا نہیں۔'' شافیہ نے آہستگی سے بتایا۔

''تم تو خوش ہو نا......!'' جی جی نجانے کیا ٹٹول رہی تھیں۔

''جی جی......!'' شافیہ نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تھے۔ ''جی جی......! مجھے نہیں پتا خوشی کیا ہوتی ہے؟ مجھے صرف اتنی خبر ہے کہ اسود کا میرے لیے رشتہ آنا بہت حیران کن ہے۔ اسود میرے لیے کیا ہے؟ میرے دل میں اس کے لیے کیا جذبات ہیں۔ وہ چاہے جانے کے لائق ہے۔ مگر میں نے اس کے خواب کبھی نہیں دیکھے۔ جی جی! میری اتنی اوقات نہیں ہے۔'' شافیہ کی آواز بھرا گئی تھی۔ ایک تواتر سے اس کے آنسو گالوں پہ پھسلنے لگے تھے۔ جی جی نے اس کا سر سینے سے لگا کر تھپتھپایا تھا۔

''اوقات کی بات ہی نہ کرو میری بچی...... مولا جب نوازنے پر آتا ہے تو سوکھی شاخوں کو سبزے سے بھر دیتا ہے۔ اس کے ہاں دیر ضرور ہے، اندھیر نہیں ہے۔ تمہاری خوشی سے عزیز کچھ بھی نہیں۔ پر میرا دل اس رشتے سے قدرے سہم رہا ہے۔'' جی جی اپنے سارے خدشات کو زبان نہیں دے سکی تھیں۔ حالانکہ وہ کہنا چاہتی تھیں کہ یہ رشتہ کسی سازش کا شاخسانہ ہوسکتا ہے۔ فرح اور سمیرا بغیر مطلب کے کسی کے منہ میں پانی تک نہیں ڈالتی تھیں، کجا کہ ایک ایسی لڑکی کا رشتہ لیتیں جس کی اہمیت ان کی نظر میں گھریلو ملازمہ سے زیادہ نہیں تھی۔

''جی جی! میں بھی خوف زدہ ہوں۔ اس خوف کی سمجھ ہے مجھے...... مگر میرے دل کو کسی طور بھی تو قرار نہیں ہے۔'' شافیہ نے لرزتی آواز میں کہا تھا۔ اس کے چہرے کی زردی اس کے خوف کی عکاسی کرتی تھی۔

''حوصلہ رکھو میری بچی......! خدا تعالیٰ تمہارے لیے بہترین فیصلہ کرے گا۔ وہ اپنے بندوں کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔ جو اس پہ توکل کرتے ہیں ان کو بھی اور جو اس پر توکل نہیں کرتے ان کو بھی......'' ان کا

ہاتھ شافیہ کے خوب صورت بالوں والے سر پہ ٹھہر گیا تھا۔

”میں نے تمہارے لیے ایک بہترین شخص کو سوچا تھا۔ مگر جو میرے رب کی رضا ہو......“ انہوں نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ ”وہ اتنا بہترین ہے...... اتنا شفیق ہے کہ بولے تو سکون کی ندیاں آس پاس بہنے لگیں۔ ایسا طبیب ہے کہ مریض کی نبض پہ ہاتھ رکھے تو اسے شفایاب کر دے۔ ایسا مسیحا کہ زخم اس کے لمس سے از خود مسیحائی کا اثر پا کر سلنے لگیں۔ اتنا مہربان جیسے جھکے آسمانوں کے ملائم بادل ہوں۔ سبھج سبھج دھرتی پہ برسیں...... نرم نرم بوندیں ٹپکائیں۔ پیاسی دھرتی کو سیراب کرتے جائیں۔ میں نے سوچا تھا، تمہارا ہاتھ میں اس کے ہاتھ میں دوں، مگر خدا کی مرضی......“

ان کی آنکھ سے ایک نرم قطرہ چپکے سے گرا اور شافیہ کے سیاہ بالوں میں کہیں کھو گیا تھا۔ اور شافیہ تھی کہ اپنے ہی سود و زیاں کے کتابچوں میں گم رہی۔ اسے خبر نہیں ہو سکی تھی کہ کوئی تھا جو اس کے لیے درد رکھتا تھا۔ کوئی تھا جو اس کے لیے رو رہا تھا۔ کوئی تھا جو اس کا منتظر بھی تھا۔ اور وہ کوئی کون تھا؟

☆......☆......☆

یہ ایک سحر انگیز رات تھی۔

ایک غفلت بھری نیند اور مدہوشی کا اثر تا حال نہیں ٹوٹا تھا۔ یہ کوئی طلسم کدہ تھا۔ یا کوئی جادو نگری تھی۔ سلسبیل نے خود کو اس حالت میں پایا کہ طلا کار اور مرقع کشتی میں سوار ہے۔ اور کسرتی بدن پری جمال ایک خوبرو لڑکی کی کوشش سے وہ کشتی ایک پتلی مگر بہت ہی دل کش نہر کے کنارے ابھی ابھی رکی ہے۔ نرم اور نظر فریب سبزے کو شفاف اور پاک و صاف پانی اپنی روانی میں چومتا ہے، نکلتا ہے، جھاگ اڑاتا ہے۔ بعض مقامات پر گھنے اور سایہ دار درخت ہیں۔ جو پیچیدہ اور خم دار زلفوں کی طرح نہر کی گوری مگر نم آلود پیشانی پر دونوں طرف سے جھکے پڑے ہیں۔ مگر جہاں پر کشتی آ کر کنارے لگی تھی وہاں ایک کشادہ مرغزار بھی تھا۔

اس خوب صورت ملاح کے کہنے پر جب وہ کشتی سے اتر کر سبزہ زار کی سیر کرنے لگی تب اس کی کمر کی ٹیسیں ہلکی ہو چکی تھیں۔

اور جو اس کے آنسو تھے وہ خشک تھے۔ ان آنسوؤں کی لکیریں شاید اس کے رخساروں کی جلد پہ جم چکی تھیں۔ اس نے مرغزار میں آ کر دیکھا، وہاں ایک پتلا اور برابر حاشیہ چھوڑ کر شگفتہ اور خوش رنگ پھولوں کا سلسلہ تھا۔ جو نہر کے دونوں جانب تا حد نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ پھولوں میں شادابی اور خوش رنگی کی وہی شان تھی جو صرف خودرو پھولوں میں نظر آتی ہے۔ اس قدرتی بہار کے ساتھ یہ لطف بھی تھا کہ نہایت لیاقت و دانائی سے چمن بندی کی گئی تھی۔

چمن کی بعض قطاریں تو ایسی تھیں جن میں ایک ہی قسم اور ایک ہی رنگ کے پھول تھے جیسے ایک ہی قوم اور ایک ہی وردی کی فوج مختلف کمپنیوں میں تقسیم ہوئی تا حد نظر پھیلی ہوئی تھی۔

زمین پر ایسی گل کاری کسی آنکھ نے نہیں دیکھی ہوگی۔ اتنی خوب صورتی، جیسے متوازی اور سرسبز و شاداب پہاڑوں نے اپنے حلقے میں کر لیا ہو۔ ایسی نہروں اور آبشاروں کی شان سے پانی کی چادریں لہریں بن کے پہاڑوں سے اتری نظر آتی تھیں۔ ان کے پانی نے پھولوں کی خوشبو سے متاثر ہو کر یا کسی اور وجہ سے گلاب، عنبر، مشک اور کیوڑے کی شان پیدا کر لی تھی۔ یہ نہریں زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ ہم تسنیم و سلسبیل ہیں۔

''سلسبیل......!'' کسی نے بڑی مدہم آواز میں اسے پکارا تھا۔ اتنی خوب صورت، نرم، دلنشیں، کسی پھوار کی طرح اترتی آواز اس کی سماعتوں کو بے انتہا بھلی معلوم ہوئی تھی۔ اس کا دل بے چین ہوا تھا...... شاید کسی نے اسے کبھی اتنی محبت سے نہیں پکارا تھا۔ اس لیے اس کا دل چاہا کہ کشتی بان اسے بار بار پکارتا رہے۔

''سلسبیل! آپ ٹھیک ہیں اب۔'' بہت خوب صورت، شستہ اور ملائم انگلش لیے لب و لہجہ تھا۔ اس کا دل چاہا وہ بولتا رہے۔ سلسبیل سنتی رہے۔ سنتی رہے۔ بس سنتی رہے......

''آپ آنکھیں کھول سکتی ہیں۔ خدا نے آپ کو نئی زندگی عطا کی۔ آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔'' وہی ملائم لہجہ، خوب صورت آواز......

خدا کی بہشت میں اتنے خوب صورت لہجے اور ایسی آوازیں بھی ہوں گی؟ وہ بہشت کی طلسماتی

دنیا سے باہر نہیں آنا چاہتی تھی مگر اس کا مسیحا......

اب اس نے شاید سلسبیل کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا تھا۔

''تم اب بالکل ٹھیک ہو۔ تم معجزانہ طور پر زندہ ہو اور تمہیں اپنی نئی زندگی پہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔'' وہی شہد آگیں لہجہ...... سلسبیل کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں شوق کا جہان آباد ہونے لگا۔ وہ پلکوں کی باڑ اٹھاتی اور نہایت خشوع اور وارفتگی سے اس حسین کشتی بان کو نظر بھر کے دیکھتی، جس کی آواز بہشت میں بھی اس کے ساتھ تھی۔

''میں ٹھیک ہونا نہیں چاہتی میرے مسیحا......! میں بس تمہاری آواز سننا چاہتی ہوں...... تم کس میٹھے دریا کا پانی ہو؟ تم نے انگبین کی نہر سے گھونٹ بھر کر اپنی زبان کو غسل دیا ہے؟ تم اتنا میٹھا کیسے بول لیتے ہو؟ میرے ساتھ تو کوئی بھی اتنا میٹھا نہیں بولتا۔ میں اپنے خاندان کی نفرت کا شکار ہوں۔ میں دھتکاری گئی ہوں۔'' وہ بولنا چاہتی تھی مگر اس کی آواز حلق میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ شاید چند سرکش آنسو اس کا بھرم توڑ گئے تھے۔ کہیں پس منظر میں چھوٹے نومولود بچوں کے ایک دم رونے کی آواز بھی آئی تھی۔ پھر قدموں کی چاپ، جیسے اس کا مسیحا کچھ دیر کے لیے دور چلا گیا ہو۔ سلسبیل نے اپنی سماعتوں کا سارا زور لگا دیا۔ وہ اپنے مسیحا کی آواز سننا چاہتی تھی۔ وہ کیا بول رہا تھا۔ وہ شاید نومولود بچوں سے مخاطب تھا۔ وہ شاید ان کی غذا کا بندوبست کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد بچوں کی آواز بند ہو گئی تھی۔ شاید ان کے معدوں میں غذا چلی گئی تھی۔

وہ ایک مرتبہ پھر مرغزاروں میں تھی۔ راستوں اور روشوں میں معجزہ نما کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ہر چمن کے ایک پہلو کو نہر دھوتی تھی۔ سڑکوں کی تعمیر میں سفید سنگ ریزے بچھے تھے۔ کوئی زمرد تھے، کوئی نیلم تھے۔ کوئی یاقوت تھے یا کوئی مرجان...... نغمہ سنج طیوران باغوں میں اڑ رہے تھے۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' سلسبیل نے گھبرا کر کسی سے پوچھا تھا۔

''یہ بہشت ہے۔'' کسی نے چلتے چلتے سر جھکا کر بتایا تھا۔

''یہاں نیکوکاروں اور ایمان داروں اور صبر کرنے والوں کو اپنے اعمال کا صلہ ملتا ہے۔'' یہ آواز

بہت دیر تک اس کی سماعتوں میں گونجتی رہی تھی۔

''مگر میں تو نیک نہیں ہوں، پھر میں یہاں کیوں ہوں؟''سلسبیل نے بھیگی آواز میں کسی دربان سے پوچھا تھا۔

''آپ کو کس نے کہا آپ نیک نہیں۔'' شاید دربان بولا تھا۔ یا شاید وہی سجیلا سا کشتی بان بولا تھا۔ جو اسے اس بہشت میں لایا تھا۔

''سارا جہان کہتا ہے۔'' وہ جیسے تھک گئی تھی۔

''سارا جہان کہتا رہے...... جو کہتا ہے بولتا رہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔'' اس کی میٹھی آواز کسی شفاف جھرنے کی مانند تھی۔ راحت دیتی ہوئی......

''فرق پڑتا ہے۔'' وہ جیسے چلانا چاہتی تھی مگر اس کی آواز گھٹ گئی تھی۔ شاید اس نے سلسبیل کے لبوں پر اپنی انگلی رکھی تھی۔ اتنا ملائم اور خوب صورت لمس تھا۔ سلسبیل کا دل لمحہ بھر کے لیے جیسے رک گیا۔

کسی نے اس کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھا تھا۔ سلسبیل نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ وہ اس کے بہت قریب تھا۔ اتنا قریب کہ اس کی خوشبودار سانسوں کی مہک اس کے نتھنوں سے ٹکراتی تھی۔ وہ اس کے اتنا قریب تھا کہ وہ اسے ہاتھ لگا کر محسوس کر سکتی تھی۔

''وہ کون تھا بھلا......؟''

''وہی خوبرو کشتی بان''

''یا سلسبیل کا مسیحا......؟''

اس کا دل رک رک کے چل رہا تھا۔ اس کا دل ٹھہر ٹھہر کے چل رہا تھا۔ وہ بہشت سے اس کے ساتھ دنیا میں چلا آیا تھا۔ یا دنیا سے اس کے ساتھ بہشت میں آ گیا تھا؟ وہ کہاں تھی؟ کس جگہ تھی؟ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''میں کہاں ہوں؟ اور تم کون ہو؟''سلسبیل نے بوجھل ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ کسی حسین خواب، کسی فطری خوب صورت منظر کی طرح جامع اور مکمل تھا۔ وہ بے پناہ دلکش تھا۔ اس کی

آنکھیں دنیا کی حسین ترین آنکھیں تھیں۔

''میں عیسیٰ ہوں......تمہارا مسیحا......اور تم سلسبیل ہو۔'' وہ اس کی سماعتوں میں شہد اتارتا رہا۔

''میں یہاں کیسے آئی ہوں؟'' سلسبیل نے اس کا ہاتھ تھام کر تعجب سے پوچھا تھا۔ یہ ایک نرم خوب صورت بستر تھا۔ یہ ایک خوب صورت والا تھا۔ جس کی شفاف کھڑکی کے اس پار سے کافوری شمع روشن تھی۔

''تم یہاں خود سے نہیں آئی۔ قدرت تم کو یہاں اٹھا لائی ہے۔'' اس نے کافوری شمع کی نرم نرم روشنی سے بچنے کے لیے آنکھیں ذرا سی چندھیالی تھیں۔

''مگر میں پہلے کہاں تھی......؟'' سلسبیل نے سوچنا چاہا تھا۔

اور پھر اسے پوری شدت کے ساتھ ایک ایک منظر یاد آ گیا تھا۔ وہ بہشت سے جیسے ایک الاؤ دہکے نرگ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ یادوں کا ایک اژدہام اسے دبوچنے کے لیے آ گیا تھا۔ اس نے شدت کرب سے آنکھیں موند لی تھیں۔

☆......☆......☆

''تمہارے کہنے پر میں نے اسود کا رشتہ طے کر دیا۔ ورنہ اس دو ٹکے کی شافیہ کو منہ لگانا گوارا نہیں کرتی میں......'' فرح نے نخوت سے کلر سے رنگے ہوئے بالوں کو جھٹکا تھا۔ اس لمحے فرح کی گوری کلائیوں میں سجے سونے کے کنگن بھی بج اٹھے تھے۔

''کون سا عمر بھر سہنا ہے اسے......بس ایک مہینے کی بات ہے۔ جی جی کی پوری نیت ہے کہ ہشام اور شافیہ کا رشتہ طے کر دیں جو کہ میں مر کر بھی نہیں ہونے دوں گی۔ اربوں کی جائیداد اس دو ٹکے کی شافیہ کو مل جائے گی، یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔ ہم ساری زندگی ترستے رہیں اور یہ اپنی مسکین صورت کے بل بوتے پر مہارانی بن جائے۔'' سمیرا نے زہرخند لہجے میں کہا تھا۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں خود غرضی کا طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

''جی جی ناک رگڑ کر عریشہ کا رشتہ مانگیں گی، دیکھنا تم......'' سمیرا نے نخوت سے کہا تھا۔

''بات جی جی کی تو ہے ہی نہیں...... اگر ہشام ہی نہ مانا تو...... ساری زندگی یورپ میں رہا ہے...... رنگ رنگ کی لڑکیوں سے دوستی ہو گی، وہیں کہیں کسی اپنے جیسی لڑکی سے شادی کرے، کیسے خواب دیکھ رہی ہو تم سمیرا......''

فرح کی بات میں وزن تھا۔ اسے اپنی بہن کی دماغی حالت پر بھی شبہ تھا۔ کسی ایسے لڑکے سے توقع لگا کر بیٹھی تھی جوان کے رہن سہن، طرز معاشرت اور ماحول میں قطعی ناموزوں تھا۔

''یہ تو تمہاری سمجھ کا مسئلہ ہے۔'' سمیرا نے ہاتھ جھاڑے تھے۔ ''یہی تو ہشام کو بھی سمجھنے میں مسئلہ ہے۔ جی جی اور ہشام کا رشتہ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ جتنا ہم نے اسے فرنگن کا بیٹا سمجھ کر انڈر اسٹیمیٹ کیا ہوا ہے...... ہمارے اندازوں سے بھی کہیں وہ الگ ہی دنیا کا باسی ہے۔ وہ بہت الگ ہے۔ جی جی کے لیے جان تک دے سکتا ہے۔ ایک زندگی تو اسے جی جی پر وارنے کے لیے ناکافی ہو گی۔ وہ جی جی کی محبتوں اور احسانوں کے نیچے دبا ہوا ہے۔ جی جی اسے ایک سانس میں بلائیں تو وہ دوسرا سانس یہاں آ کر لے۔ جی جی نے جس لڑکی کی طرف اشارہ کیا، ہشام اس سے ہی شادی کرے گا۔ اس لڑکی کو بسائے گا، اور وہی مالک و مختار ہو گی۔ تو پھر وہ لڑکی عریشہ کیوں نہیں ہو سکتی؟'' سمیرا کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''کیا گھاٹے کا سودا ہے آپا...... جائیداد ہاتھ آنے دو۔ دو فلیٹ ان میں سے تمہارے...... آخر اس پلاننگ کی کامیابی میں تمہارا بھی برابر کا ہاتھ ہے۔'' سمیرا نے فرح کو سبز باغ دکھا رکھے تھے۔

''ہشام شادی کر کے واپس چلا بھی گیا تو سب کچھ ہمارے ہی ہاتھ میں ہو گا۔'' سمیرا کا اعتماد قابل دید تھا۔ فرح کو بھی ہر چیز سرسبز دکھائی دے رہی تھی۔ بیٹھے بٹھائے کروڑوں کی جائیداد ہاتھ آ رہی تھی۔

''اب گیم تو ساری ہشام کے کورٹ میں ہے۔''

''گیم میرے ہاتھ میں ہے۔ اسود کا رشتہ اتنا پاور فل ہے کہ اس کے مقابلے میں جی جی ہشام کا رشتہ شافیہ کے لیے نہیں رکھیں گی۔ جی جی کے پاس عریشہ کے علاوہ اور کوئی آپشن ہی نہیں ہے۔'' سمیرا نے پرسکون انداز میں دونوں پاؤں صوفے پر رکھ کر پسارے تھے۔

''دیکھ لو...... میں تو تمہارے ساتھ ہوں۔ اسود اس رشتے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ اسے خبر بھی نہیں ہونے دینی۔ باقی معاملات تم خود سنبھال لینا......'' فرح نے پورے تعاون کی امید بندھاتے ہوئے کہا تھا۔

''اسود کو تو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔ باقی میں دیکھ لوں گی۔'' سمیرا نے مسکرا کر بات ختم کر دی تھی۔ وہ بہت مطمئن تھی اور اسے پورا یقین تھا کہ ہشام جی جی کے کنٹرول میں ہے۔ دوسری بات یہ کہ جی جی نے اور ان کے مرحوم شوہر نے ہشام کی گھٹی میں یہ بات ڈال دی تھی کہ تم جتنا عرصہ مرضی یورپ میں رہ لو، تمہارا فیوچر اپنا وطن ہی ہے۔ اور جی جی نے اسے طوطے کی طرح ایک بات رٹوا رکھی تھی کہ میں نے تمہارے لیے ایک لڑکی پسند کر رکھی ہے۔ تم نے پاکستان آ کر ہی شادی کرنی ہے۔ اور ہشام جی جی کے فیصلے پر سر اٹھا جائے یہ کسی بھی کتاب میں نہیں لکھا تھا۔ ہشام نے جی جی کے مان کو ہر اس لمحے بڑھایا تھا جب جب جی جی نے اس کی شادی کے حوالے سے اپنے خوابوں کا ذکر کیا تھا۔ ہشام کو دوسری زندگی بھی ملتی تو وہ اس عورت کی نذر کر دیتا جس نے نہ تو اسے پیدا کیا تھا اور نہ ہی پرورش کی تھی مگر اس عورت کی ہشام کے دل میں اور اس کی زندگی میں اتنی اہمیت تھی کہ وہ عورت اگر دن کو رات کہہ دیتی تو ہشام کہتا۔ ''بخدا، میری ماں! یہ دن نہیں، رات ہے۔''

سمیرا کو جی جی اور ہشام کی کمزوریوں کا پتا تھا۔ وہ ان کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے والی تھی۔

''چلو! میں تو تمہارے لیے دعا گو ہوں۔ ہماری اس ارب پتی سگی پھوپھی نے کبھی ہمارا خیال نہیں کیا، جب بھی لٹایا، پرائی اولادوں پر ہی لٹایا۔ کبھی ہشام تو کبھی شافیہ......'' فرح نے کلس کر کہا تھا۔ ان دونوں بہنوں کی اس حوالے سے جلن کبھی ختم نہیں ہو سکی تھی۔

''مگر اب ہماری باری ہے۔'' سمیرا نے سر کو جھٹکا۔

''کوئی خود سے نہ دے تو اپنا حق چھین کر لینا چاہیے۔''

''میں بھی یہی کہتی ہوں۔ ہمارا بھی برابر کا حق ہے۔''

''بڑھیا ہشام کو اسپتال بنا کر دے گی۔ وہ بھی ہمارے ہی کنٹرول میں ہو گا، دیکھنا! میں کیسے

بازی الٹتی ہوں۔ شافیہ کا کانٹا راستے سے ہٹا کر......‘‘ سمیرا کی آنکھیں چمک رہی تھیں جیسے شکار کو دیکھ کر شکاری کی آنکھیں چمکتی ہیں۔

’’ہشام کب تک آرہا ہے؟‘‘ فرح نے دلچسپی اور اشتیاق سے پوچھا تھا۔

’’بہت جلد...... وہ شادی بھی کرے گا۔ جی جی اسے کھونٹے سے لگا کر بھیجیں گی۔ اگر واپس بھیجا بھی تو......‘‘ سمیرا کو اندر کی ساری خبر تھی۔

’’یہ تم کو رپورٹیں دیتا کون ہے؟‘‘ فرح نے دبے دبے جوش سے پوچھا تھا۔

’’ہے کوئی جاسوس......‘‘ سمیرا نے ہنس کر ٹال دیا تھا۔

☆......☆......☆

’’نیچے بحرا لکاہل ہوتا ہے اور اوپر خدا...... کہیں زمین کا ذرا سا ٹکرا بھی ڈھارس کے لیے دکھائی نہیں دیتا...... پھر بھی خدا ہمیں سنبھال لیتا ہے۔‘‘ اسے جی جی کی محبت بھری آواز سنائی دی تھی۔ وہ جی جی کے بالوں میں ناریل اور بادام کا تیل لگا رہی تھی۔ پچھلے صحن میں سکھ چین کے پیڑ تلے بیٹھ کر جی جی کی باتیں سننا شافیہ کو بڑا مرغوب تھا۔

جب اس نے جی جی سے سوال کیا تھا۔

’’جی جی! محبت کیا ہے؟‘‘

’’محبت الہامی شے ہے۔‘‘ جی جی کی آواز میں مٹھاس بھر گئی تھی۔ اتنی مٹھاس کہ شافیہ کو لگا کہیں شہد ہی شہد کی آبشاریں اتر آئی ہوں۔ محبت نے جی جی کا چہرہ پرنور کر دیا تھا۔ ایک روشنی کے ہالے میں......

’’عمین الزہراء کہتی ہیں، محبت الہامی شے ہے۔ یہ سیدھی آسمانوں سے اترتی ہے۔ دل کی پاک شفاف زمین پر یہ محبت اذانِ فجر کے بعد اترتی ہوئی پاک سحر ہے۔ یہ اتنی پاک ہے جتنا جس کا تخیل پاک ہے۔ محبت اس قدر پاکیزہ ہوتی ہے جتنا جس کا خون پاک ہوتا ہے۔ محبت اس کو کہتے ہیں جب روزہ دار وقتِ افطار پانی کے گلاس کو سامنے رکھ کر بھی ہاتھ نہ لگا سکے۔ حکم ربی کے بغیر اس گلاس کو چھونے تک کے انتظار کا نام محبت ہے۔ محبت وہ راستہ ہے...... جس پر چلنے والے اپنے دل آبِ زم زم سے دھو کر چلتے ہیں۔

محبت رزق ہے ان آنکھوں کا جو محبوب کا دیدار باوضو ہو کر کرتی ہیں۔ ان لوگوں کے چہار جانب بہارِ محبت کے پھول کھلتے ہیں جن پر کبھی خزاں نہیں آتی۔" جی جی نے اس کے ہاتھوں میں سستی کو سمجھ لیا تھا۔ اس کے ہاتھ رک گئے تھے۔ وہ کسی ٹرانس میں تھی۔ جی جی اس کی محویت توڑنا نہیں چاہتی تھیں۔

"محبت کا گلشن عزت کی خوشبو سے مہکتا ہے۔"

محبت نام زبان پر آنے سے پہلے سوچ کو باوضو ہونا چاہیے۔"

جی جی کی خاموشی کے ساتھ ہی اس کی محویت ٹوٹ گئی تھی۔

"محبت کی بہت ساری شکلیں اور بہت ساری صورتیں ہیں۔ کبھی ماں کے روپ میں، کبھی باپ کے روپ میں، کبھی بہن تو کبھی بھائی کے روپ میں اور کبھی محبوب کے روپ میں۔ محبت ہر صورت میں ہی بڑی خوب صورت ہوتی ہے۔" جی جی کی آواز مدھر جھرنے سے مشابہ تھی۔ انتہائی دل کو چھو لینے والی۔

"محبت ہے نا...... ہشام کی صورت، ہزار کوس بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر و وصال کے مزے لیا کرو۔" ان کی آنکھوں میں محبت کی دھنک اتر رہی تھی۔ کوئی ایسا انوکھا پیار تھا ان دو الگ معاشرت کے لوگوں میں...... نہ وہ اس محبت سے تھکتا تھا اور نہ یہ اس محبت سے اکتاتی تھیں۔ بڑا عجیب سنگم تھا دونوں کا...... وہ ہزاروں میل دور سمندروں کے فاصلوں پر، کسی دور دیس کے کسی پر ہجوم شہر میں بہت ہی مصروف اپنے شوہر کے اکلوتے لختِ جگر سے خود کلامی کر رہی تھیں۔ یہ خود کلامی ان کی ذات اور شخصیت کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔

"جانِ والدہ! تم تو ثمر نورس ہو۔ تم تو صبح بنارس ہو۔ تم تو شامِ اودھ ہو۔ تم تو طلوع سحر ہو، تم تو روشن کائنات ہو۔ اس نہال کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں سایہ نشین اس نہال کا رہی ہوں۔ کیونکر تم مجھے عزیز تر نہ ہو گے؟ رہی دید وادید، تم میرے وطن آ و یا میں تمہارے ورجینیا...... تم مجبور میرے چاند...... میں مغرور میرے چاند......" ان کی میٹھی محبت ان کی بوڑھی آنکھوں سے بہہ رہی تھی۔ جن کو چنتے چنتے شافیہ کو بن دیکھے ہشام عیسیٰ پر رشک آ رہا تھا۔ ایسا رشک جس کی مثال نہیں مل سکتی تھی۔

''سنو جانِ عزیز!'' اچانک انہوں نے شافیہ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ناریل کے تیل کی ساری چکنائی جی جی کی نرم پوروں میں اتر آئی تھی۔

''سنو میری بچی! عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح، اور ایک عالم آب و گل...... حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہی ہے...... ہر چند کہ قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ لوگ عالم ارواح کے گنہگار ہیں۔ ہمیں توبہ کی مہلت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ہم خلق خدا میں محبتیں بانٹ کر، مالک کے تابع رہ کر، احکامات کی تعمیل کر کے دراصل اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔''

انہوں نے اس کی موتیے کے پھول جیسی گداز کلائی کو ہولے سے تھپتھپایا تھا۔

''ہم میں سے کامیاب وہی ہے جس نے ہم میں سے خود کو کامیاب نہ سمجھا۔'' جی جی کی میٹھی آواز میں زمانوں کے تجربات بول رہے تھے۔ معاً دیوان سر جھکائے جھکائے حاضر ہوا تھا۔ سارا فسوں ٹوٹ گیا۔ شافیہ کی محویت بھی ریزہ ریزہ ہوئی تھی۔ دیوان کوئی پیغام لایا تھا۔

''مرزا تمام بیگ تشریف لائے ہیں۔ کیا دالان میں لے آؤں؟'' دیوان نے بیرسٹر صاحب کے عزیز دوست کا ذکر خیر کیا تھا۔ اپنے زمانے کے بعد بھی کامیاب ترین وکیل سمجھے جاتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں اب بھی ان کے شاگردان سے فیض حاصل کر رہے تھے۔ بہت قابل اور شریف النفس انسان تھے۔ بیرسٹر صاحب کے تمام دوست ہی ان کی طرح درویش صفت تھے۔

اپنے زمانے میں بیرسٹر شاعر مانے جاتے تھے۔ لوگ دور دراز سے اپنے مسودوں کی اصلاح کے لیے آتے تھے۔

ریختے میں دریاب اور فارسی میں نایاب تخلص کرتے تھے۔ انشا پردازی، جغرافیہ، تاریخ، علم الانساب، اسماء الرجال، تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

کبھی کبھار جی جی کی خدمت میں سلام عرض کرنے آ جاتے تھے مگر آج ان کی آمد کی نوعیت خاص تھی۔ ہاتھوں میں پرانے کاغذات کی فائلیں تھیں جو انہوں نے رسمی سلام دعا کے بعد جی جی کے

سامنے رکھ دی تھیں۔

''بھابھی محترمہ! آپ کی ہدایت کے مطابق کاغذات تیار کروالایا ہوں۔ ان میں کوئی ردوبدل کی ضرورت ہوئی تو بتادیجیے گا۔''

''بڑی مہربانی عزیزم بھائی صاحب! آپ نے بڑا کام کردیا ہے۔'' جی جی کی آنکھوں میں جوش بھر گیا تھا۔ شافیہ کو ان کی گفتگو سے بس یہی سمجھ آئی تھی کہ یہ شاید جائیداد کے کاغذات تھے۔ وہ مرزا تمام بیگ کے لیے جب چینی کے خوش نما مگوں میں گلابی نمکین چائے بھر کر لائی تو جی جی دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہی تھیں۔

''ہشام کے آنے میں کچھ ہی دن باقی ہیں۔ اس نے اپنا ڈاکٹری کا اعلیٰ امتحان اعزازی نمبروں سے پاس کرلیا ہے۔ مجھے یقین ہے۔ وہ بہت جلد اپنے باپ کے وطن لوٹ آئے گا۔''

''ہم بھی یہی امید رکھتے ہیں بھابھی محترمہ! وہ اپنے باپ کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرے اور ایک کامیاب طبیب کے طور پر انسانیت کی خدمت کرے۔ اس دور میں جہاں طبیب قصاب کا روپ دھار چکے ہیں۔'' انہوں نے فائلوں کو ربن میں باندھ کر جی جی کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

''خدا خیر کرے گا۔ آپ کا یہ احسان اور بڑی نیکی ہے۔ میرا یہ کام کوئی نہ کرپاتا۔'' جی جی نے تمام کاغذات کو کسی راز حیات کی طرح سنبھال لیا تھا۔

''احسان کیسا بھابھی محترمہ! یہ تو خیام کے ساتھ بتائے ایک پل کا بھی بدلہ نہیں ہے۔ ہم تو ان زمانوں سے ساتھ ساتھ ہیں جب علی گڑھ کا ہاسٹل بحر علوم میں غوطہ زن نظر آتا تھا۔ ہر ہاسٹل میں چار چار سولڑکے تھے۔ مگر گمان ہوتا جیسے کوئی قبرستان ہو۔ اس لیے کہ ان زمانوں میں شوق علم کا جنون ہی کچھ اور تھا۔ علمی مباحثوں کے علاوہ کوئی اور موضوع نہیں ہوتا تھا۔ ہر جگہ طالب علم کتابیں لے کر ٹہلتے نظر آتے تھے۔ کبھی چمن میں، کھانے کے کمروں میں، کامن روم میں، برآمدوں میں، گلیاروں میں حتیٰ کہ غسل خانوں میں بھی لوگ فلسفہ، ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے تھے۔ آج کے دور میں فیشن، انٹرنیٹ، پارٹیوں اور سیر سپاٹوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس دور میں ہمارے ہشام جیسا بچہ ہونا بڑے نصیب کی

بات ہے۔'' مرزا تمام بیگ عادتاً اپنی گفتگو کو ہر دور میں گزارتے تھے۔ کشمیری چائے خاتمے کے قریب تھی۔ وقت گھنٹہ بھر سے زیادہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنی سیاہ پوستین کی ٹوپی کو اپنی چندھیا پہ سیدھا کیا اور کھڑے ہونے سے پہلے بولے تھے۔

''بھابھی محترمہ! آپ کی تمام تر جائیداد ہشام کے نام منتقل ہو چکی ہے۔ غرباء کا حصہ نکال دینے کے بعد یہ بچی شافیہ جسے آپ نے اپنی جائیداد میں سے ایک بٹا تین حصہ دیا ہے۔ اس کے نیک نصیب کی دعا کرتے ہیں، خدا آپ کے خوابوں کو تعبیر بخشے......اور ہشام کے ساتھ اس کا نصیب بہت روشن ہو۔'' جاتے سمے مرزا تمام بیگ نے شافیہ کے سر پہ شفقت بھرا ہاتھ رکھا تھا اور ہوائیاں اڑاتی شافیہ کے سر پہ کئی پٹاخے پھوڑتے ہوئے روانہ ہو گئے تھے۔ ادھر جی جی محترمہ ہزاروں شوق کے رنگ سجائے بیٹھی تھیں۔ ہکا بکا شافیہ ان کے پہلو میں آ گری تھی۔

ہشام سے رشتے کی بات تو بہت دور......وہ تو جائیداد والے شاک سے سنبھل نہیں پا رہی تھی۔

''جی جی! یہ میرے کان کیا سن رہے تھے؟ یہ سب کیا ہے؟'' وہ ہڑبڑاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

لکنت زدہ زبان اور لڑکھڑاتا لہجہ......

''کچھ غلط نہیں ہے۔ تم میری بیٹی اور ہشام میرا بیٹا ہے۔ سن لو شافیہ! اگر سمیرا نے تمہارا اور ہشام کا رشتہ نہیں بھی ہونے دیا تب بھی تم میری جائیداد میں ایک بٹا تین کی وراثت رکھتی ہو۔ یہ میں نے تمہاری کسی خدمت کا صلہ نہیں دیا۔ یہ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے......اپنے لیے کچھ جگہ خریدی ہے......دور اوپر آسمانوں پر......جنت بریں میں، ہلکا سا ٹکڑا......چھوٹا سا گھروندہ......بے ضرر سا گھونسلا......کچھ زیادہ نہیں کیا۔ اس خود غرض دنیا میں، اس اجنبی ہجوم میں مَیں تم کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں؟ اس سمیرا کے بھروسے پر جو تمہارا ماس بھی نوچ کر عریشہ کو کھلانا چاہتی ہے۔ تم میری بیٹی ہو، ہشام تمہارا آسرا بنے نہ بنے۔ تم کبھی بھی بے ٹھکانہ نہیں رہو گی۔'' انہوں نے ہچکیاں لیتی شافیہ کو اپنے فراخ سینے میں دبوچ لیا تھا۔ وہ گھٹ گھٹ کر روتی اب دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔

''بتائیں نا......کہاں سے لیا آپ نے ایسا دل......؟ بتائیں ناں کس دیس، کس نگر سے بھٹک کر آ

گئی ہیں۔ مشعل راہ بن کر کبھی ہشام تو کبھی شافیہ کے لیے...... ایسے دل کہاں سے ملتے ہیں؟ خود کو بیچ کر بھی خرید نہ پاؤں۔'' وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ جی جی اس کی کمر سہلاتی اسے حوصلہ دے رہی تھیں۔

''میری بچی! میری بات سنو! آنسو پونچھو...... میری بات پہ دھیان دو۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ سہلائے، آنسو صاف کیے اور پیار سے سمجھایا۔

''ایک بات جان لو...... یہ معاملات صیغہ راز ہیں۔ میرے بعد طشت از بام ہوں تو بہتر ہے۔ ان کو کچھ مت بتانا۔ یہ لالچی عورتیں لالچ میں ہر حد کو پار کر دیں گی۔ میں نے ہشام کو بھی نہیں بتایا مگر اس کو بتا دوں گی۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ ہشام اب آئے یا تب آئے۔ نرجس خیام اب آسانی کے ساتھ مرنے کے لیے تیار ہے۔'' جی جی کے آخری الفاظ نے شافیہ کا کلیجہ شق کر دیا تھا۔ وہ گھٹ گھٹ کر روتی ایک مرتبہ پھر بے قابو ہو گئی تھی۔

''آپ مرنے کی باتیں مت کریں۔ آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر کبھی نہیں جائیں گی۔'' وہ نادان بچوں کی طرح ان سے وعدے لے رہی تھی مگر جی جی نے اسے حوصلہ دینے کے لیے بھی وعدہ نہیں کیا تھا۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ جی جی نے اس کے آنسو دیکھ کر بھی وعدہ نہیں کیا تھا۔

ایسا انہوں نے کیوں کیا تھا؟

قسط نمبر 2

زندگی زردزرقون کی مانند تھی۔ چمکیلی مگر پتھریلی۔

خدا کی زمین میں خوب صورت ترین وادیوں میں سے ایک حسین ترین وادی ہے۔ انتہائی خوب صورت اور سرسبز، جس کے نشیب میں شادلوت جیسی حساس ندی ایک ''سوگوار انبساط'' کے ساتھ بہتی ہوئی دور کسی جھیل کے دامن میں اتر جاتی تھی۔

اس کے کناروں پر گنبدوں والے مینار، گرجا گھر، عجائب خانے اور چھ سو پرانی یونی ورسٹی کی عمارتوں والا قدیم شہر آباد تھا۔ اس کے بالکل عقب میں کچھ بلندی پر حوادث کا شکار، ایک لٹا پٹا، موسم زدہ قلعہ اپنے اندر صدیوں کی تاریخ سمیٹے کھڑا تھا۔ میونک کی گہما گہمی سے بہت دور یہ ایک الگ دنیا تھی۔ جن کی ساری تگا دو ہوٹلوں سے سٹوروں اور ہوائی اڈوں کے درمیان رہتی تھی وہ آئن میو ہلے کے اس وادی سے ابھی تک بے خبر تھے۔

آخن میو ہلے کے ایک کم اونچائی والی پہاڑی پہ اس کا گھر تھا۔ جسے سلسبیل کہتے تھے۔ سلسبیل البانیہ کی ایک بدقسمت عورت کی بیٹی تھی۔ جس نے محبت کے پیچھے روایات کو چھوڑ کر شادی کی اور اپنے شوہر کے ہمراہ آخن میولے میں آبسی، بدقسمت البانوی لڑکی نے بہت ہی کم عمر پائی تھی۔ سلسبیل کو جنم دیتے ہوئے سترہ سالہ البانوی لڑکی درد کو نہ سہتے ہوئے اس زندگی سے دور چلی گئی جس زندگی کو جینے کے اس نے بڑے خواب دیکھے تھے۔ سلسبیل اپنے باپ کے اور کچھ ہی عرصہ بعد اس کے وجود پر کسی بلا کی طرح مسلط ہو جانے والی مارک کے زیر سایہ پروان چڑھتی رہی۔ اس کے باپ اور دادا کا بکریوں کا فارم تھا۔ وہ پنیر اور دودھ کا بہت بڑا کاروبار کرتے تھے اور ان کا پنیر پورے مغربی کنارے میں مشہور تھا۔

ان کے خالص دودھ سے نکالے پنیر کو بہت دور دور تک مانگ تھی۔

دادی، دادا، ڈیڈی اور ممی کے ساتھ ممی کا ایک بھائی یہ سب فارم میں کام کرتے تھے۔

سلسبیل کو اسکول جانے کی اجازت تھی اس کے بعد کا وقت یا تو وہ اپنے چھوٹے بھائی ڈینی کو سنبھالتی تھی یا بکریوں کے ریوڑ کے باڑے میں ان کے ساتھ وقت گزارتی۔ انہیں پہاڑوں پہ ہانکتی، چرواتی، ندی سے پانی پلاتی، نہلاتی اور واپس فارم میں لا کر باندھ دیتی تھی۔

وہ اپنا کام بہت بچپن سے ہی خوش اسلوبی کے ساتھ سیکھ گئی تھی۔ اسے چودہ کا سن لگا تھا مگر اس کی اٹھان غضب کی تھی۔ تبھی تو ناشتے کی میز پر ممی پنیر اور مکھن کے جار اس کے سامنے سے اٹھا کر چلا اٹھتی تھی۔

''لڑکی عمر سے پہلے جوان ہوئی ہے۔''

ممی کا خیال تھا کہ خالص دودھ، پنیر اور سبزیوں کی بہتات اور کثرت استعمال کی وجہ سے وہ جلدی بلوغت پا رہی تھی۔

ایک تو اس کی اٹھان اچھی تھی اور دوسرا البانیہ کا سارا حسن اس کے حسین پیکر میں سمٹ آیا تھا۔ سرو قد جسم، سرمئی آنکھیں مرمر کی مورتی، اونچی گردن، متناسب اعضا، سیاہ جھالروں جیسی پلکیں، کالے سیاہ بال، جیسے ریشم کی تاریں ہوں۔

ممی کو اسے دیکھ کر ہول اٹھتے تھے۔

''اتنی حسین، اس قدر حسین؟ تو اس کی ماں کیسی ہوگی؟'' ممی کا حسد کے مارے برا حال ہو جاتا تھا۔ حسد کے مارے اس کے چمپئی رنگت سیاہی مائل ہو جاتی تھی۔ جیسے گرم تندور میں لگائی جانے والی وہ روٹی جسے لگا کر بھلا دیا ہو۔ کالی اور سڑی ہوئی۔

دادی اور ڈیڈی کا رویہ اس کے ساتھ متوازن تھا۔ البتہ دادا اور ممی ایک ہی قماش کے لوگ تھے۔ ممی دادا کی بھتیجی تھی۔ کہیں دور پار سے، کسی دوسری نسل کے رشتے داری میں سے مگر حق ایسے جتاتی تھی جیسے سگی بھتیجی ہو۔ کبھی ایک زمانے میں ڈیڈی کے عشق میں گرفتار بھی رہی تھی۔ اب عشق کا تو نہیں پتہ،

البتہ فسادات اتنے ہوتے تھے کہ سلسبیل اپنے چھوٹے بھائی ڈینی کو چپکے سے اٹھا کر بکریوں کے باڑے میں آجاتی تھی۔

ان چیختے، چلاتے، بھونکتے انسانوں سے بہت بہتر یہ خاموش اور بے ضرر جانور تھے۔ بول نہیں سکتے تھے مگر دکھ ضرور سن لیتے تھے۔ سلسبیل کا سارا وقت یہیں گزرتا تھا۔ کبھی ان سے باتیں کرتے اور کبھی ان سے شکوے کرتے۔

''بولتی کیوں نہیں ہو تم۔ کرسٹی، روزی، بیکا نکا، فرینی۔'' وہ سفید دودھ سی خوب صورت بکریوں کو اپنے اردگرد بٹھا لیتی۔ یہ اس کی سہیلیاں تھیں اور ہمراز تھیں۔ غم گسار بھی تھیں۔ بھلے بے زبان ضرور تھیں مگر احساسات کی زبان خوب سمجھتی تھیں۔ ان کو خبر تھی کہ سلسبیل کب اداس اور کب خوش ہوتی ہے۔ سو وہ اس کا دکھ بٹانے کو اردگرد بیٹھ جاتی تھیں۔ اس کی باتیں سنتی تھیں اور کبھی اس کے ہاتھ یا پاؤں سہلا دیتی تھیں جیسے اپنے ہونے کا یقین دلاتی ہوں۔ دو سالہ ڈینی اپنی بہن سے چپک جاتا تھا۔ کبھی اس کے گال پہ لڑھکتے آنسو انگلی پہ اٹھا لیتا اور اداس ہو جاتا۔ پھر اسے اپنی بیماری میں سمجھانے کی کوشش کرتا تھا۔

''مت رو......ممی گندی ہے......''

سلسبیل ڈینی کو اپنے سینے سے چپکا لیتی تھی۔ اس کے سنہرے بالوں کو سہلاتی۔

''تو میرا چاند ہے...... ہے نا تو میرا چاند......'' تب اس کے اصرار پہ ڈینی اپنے پھولے بالوں والے سر کو زور زور سے ہلاتا تھا۔ جیسے یقین دلاتا ہو۔ ''ہاں، میں تمہارا چاند ہوں۔''

''ڈینی! ہم زمین میں ایک ایسا گھروندہ بنائیں گے کہ جہاں رموز اور محبت ہو اور کسی کی جھڑکی نہ ہو۔ نہ چوٹ آئے اور نہ کوئی خراش۔''

اس نے ٹخنے سے کچھ اوپر تک پتلون کو موڑتے ہوئے اپنے اس زخم کو سہلایا تھا جو ممی نے تل کا حلوہ بھونتے ہوئے گرم چمچ سے داغا تھا۔

سلسبیل کا یہ البانوی خاندان کئی دہائیوں سے آخن میو ہلے کے ایک چھوٹے سے شستد شن میں آباد تھا۔ پہاڑی کے اوپر ہو سلین تکونی شکل کا انڈے جیسا تھا۔ جوان گھر کے افراد کو کبھی کبھی بہت

چھوٹا پڑ جاتا تھا۔اس وقت جوجی کا بھائی یا اس کا باپ بھی رہنے کے لیے آ جاتا۔ممی کا بھائی دوسی اور باپ بروزو ہوسلین میں آنے کے بہانے ڈھونڈتے تھے اور اب تو جب سے بروز اس کے ڈیڈی کے لیے فوہلن (گھوڑی کا بچہ) لایا تھا تب سے ڈیڈی کا منظور نظر تھا۔اب ڈیڈی ان کے طویل قیام پر اکتاتے نہیں تھے۔

یہ ایک محنت کش خاندان تھا۔مردوں کے ساتھ عورتیں برابر کام کرتی تھیں۔مشینوں کے ساتھ چارہ کاٹتی تھیں۔گایوں اور بھینسوں کو نہلاتی تھیں۔اور ان کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ ہاتھ کی مشنیوں سے دودھ اور پنیر سے مختلف اقسام کی کھانے کی اشیاء تیار کر کے بیچتی تھیں۔

دادی نے خالص پنیر سے بنی اشیاء کا ایک سٹور بنا رکھا تھا۔وہ علی الصبح اپنے سٹور پہ نکل جاتی تھی۔لمبی سی سوتی اسکرٹ، گرے بھوسہ زدہ بالوں پہ اسکارف باندھے، آنکھوں پہ عینک لگائے وہ بڑی دلجمعی سے گاہکوں کو ڈیل کرتی تھی۔

دادی بھیڑ کی دم سے چربی نکال کر اس میں چنے پکاتی تھیں۔ان کی یہ ڈش بہت مشہور تھی۔یا جنگلی لہسن اور خالص جڑی بوٹیوں میں پنیر پکاتی تو سلسبیل ٹیبل سے اٹھ کر بھی کھانے والے کمرے میں آ جاتی تھی۔اس گھر میں دادی کے علاوہ شاید ہی سلسبیل سے کسی نے محبت کی ہو۔

جب ممی ناشتے کی میز سے مکھن، جام، دودھ اور پنیر اٹھا لیتی تو سلسبیل کی آزردہ آنکھوں کو دیکھ کر دادی نڈھال ہو جاتی تھی مگر تب خاموش رہتی، وہ ممی کو روکتی نہیں تھی۔جب سلسبیل راستہ بھر روتی ہوئی اپنی درسگاہ پہنچتی، سارا وقت غائب دماغی سے ٹیچر کا لیکچر سنتی بریک کی گھنٹی بجتے ہی اس کا ہاتھ باقی اسٹوڈنٹس کی طرح غیر ارادتاً بیگ کی طرف بڑھتا تھا۔کتابوں کے بہت نیچے ایک چھوٹے سے ٹفن میں تِل کا حلوہ سلسبیل کی اشتہا بڑھا دیتا تھا۔تب اسے دادی کی خاموشی پہ ٹوٹ کر پیار آ جاتا تھا۔

''دادی! تم کتنی پیاری ہو۔'' اس کے ہونٹوں پر میٹھی سی مسکان پھیل جاتی تھی۔ڈینی کے بعد دادی اس کی محبوب ترین ہستی تھی۔

سلسبیل کو کتے پسند تھے۔ایک دن وہ اسکول سے تھکی ہاری گھر آئی تو لاؤنج میں ایک رکھوالی والا

کتا ٹہلیں کر رہا تھا۔ لٹکے کان، گول تھوتھنی، سیاہ، گھنے بالوں والا، اچھی فطرت کا مالک لگتا تھا۔ وہ درختوں کے گرد بھاگنا اور صرف گوشت کھانا پسند کرتا تھا۔ سلسبیل اسے دیکھ کر بہت ایکسائٹڈ ہوگئی تھی۔

''یہ کون لایا ہے دادی!'' وہ چہکی اور کے کی پشت پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ ''کیا دوسی انکل؟''

''بروزو......'' دادی کا انداز دو ٹوک اور خاصا بیزار تھا۔ ہاں، دادی کو بروزو اور دوسی دونوں برے لگتے تھے۔

''بروزو نانا''، سلسبیل کو خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔ معاً عقب میں ایک چہکتی آواز سنائی دی تھی۔

''کیسا لگا سلمیٰ تم کو......؟'' بروزو اس کی ہیجانی خوشی سے خوب مسرت پاتا چمکا تھا۔

''بہت پیارا......''، سلسبیل مارے مسرت کے بے حال ہو رہی تھی۔

''یہ تمہارا ہے......'' روزو نے جیسے بڑا سرپرائز دیا تھا۔ سلسبیل بہت زیادہ ممنون دکھائی دینے لگی تھی۔ دادی کو اس کی ہیجانی خوشی اور ممنونیت کچھ بھا نہیں رہی تھی، مگر دادی نے اپنی پوتی کو بہت کم خوش ہوتے دیکھا تھا۔ اس لیے سلسبیل کی خوشی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنے لب سی لیے تھے۔ کسی تہہ شدہ سنجاف کی طرح۔ اتنی پر عزم کہ سلسبیل کی خوشی ماند نہ پڑ جائے۔

''میں اور ڈینی اس کے ساتھ کھیلیں گے۔'' اس کے چہرے پہ بچپن اور نوجوانی کا عجیب سا بانکپن تھا۔

''ہائے......میری ڈول، یہ تم دونوں کے کھیلنے واسطے میں لایا ہوں۔'' بروزو نے چہک کر بتایا تھا۔

سلسبیل کی چمکتی آنکھیں اسے خوشی دے رہی تھیں، مگر بروزو کے بیٹے دوسی کو یہ خوشی زہر لگ رہی تھی۔

اسی پل دوسی کو اپنا باپ بروزو بھی زہر لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی کچا گوشت کھانے والا شکاری ہو۔

بروزو مضبوط کاٹھی اور چوڑی ہڈی والا مرد تھا، ممی کی ماں کا یہ کوئی تیسرا شوہر تھا۔ اس سے کوئی بیس سال چھوٹا۔ ممی کی ماں گورنمنٹ سرونٹ تھی۔ اسی چکر میں بروزو نے اس سے شادی کر لی تھی۔ دوسی اور ممی دونوں کو اس شادی پر اعتراض نہیں تھا مگر اب کہیں کہیں دوسی بروزو سے چڑنے لگا تھا۔

بروزو کے سخت اور مضبوط خدوخال تھے۔ نیلی آنکھیں، سنہرے بال جو کنپٹیوں سے کچھ کچھ سفید

تھے۔ بروزو بت عرصہ میڈیا سے وابستہ رہا تھا اور کسی مشہور میگزین کے لیے ماڈلنگ بھی کرتا رہا تھا۔ بلاشبہ دیکھنے میں وہ دوسی، سلسبیل کے ڈیڈی اور شاید اس علاقے کے ہر مرد سے زیادہ پرکشش تھا۔ اسے خود کو سنوارنا اور فٹ رکھنا بھی آتا تھا۔ شاید روسی کے جلاپے کی ایک وجہ یہ بھی تھا۔ بروزو کے سامنے اس گھر کے ہر مرد کی شخصیت ماند پڑ جاتی تھی۔

جب بروزو اس کے ڈیڈی کے ساتھ باہر نکل گیا تب سیاہ کتے کے ساتھ کھیلتی سلسبیل کو دوسی نے ذرا رعب سے جھڑک کر کہا تھا۔

''اس کتے کو واپس کر دو......''

سلسبیل نے آنکھوں میں بھرپور تعجب اور ناگواری بھر کے دوسی کو دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

''انکل! تمہیں کیا مسئلہ ہے۔ یہ تو بروزو نانا لائے ہیں۔''

''تم سمجھ نہیں رہی۔ یہ کتا تمہارے لیے بہتر نہیں ہے۔ یہ تم کو کاٹ بھی سکتا ہے۔'' دوسی نے جھنجھلا کر کہا۔

''مگر یہ تو بے ضرر ہے۔ یہ میرا ڈوڈو ہے۔''

''مگر اس کو لانے والا بے ضرر نہیں ہے۔'' دوسی پھر سے جھنجھلایا تھا۔

''تم سمجھ نہیں رہی۔''

''مگر دوسی انکل۔''، سلسبیل ناگوار جھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔

''اس کتے کے ساتھ ایک وائرس ہے۔ جو تمہیں چمٹ سکتا ہے۔'' کچھ دیر اس کی جھلاہٹ دیکھنے کے بعد دوسی نے عجیب سے انداز میں کہا تھا۔ اس کا انداز بڑا ہی عجیب تھا مگر اس وقت تیرہ، چودہ کے سن میں گھومتی ایک لاپرواہ معصوم بچی کو ایسے عجیب لہجوں کے پیچھے چھپے مفہوم سمجھنے نہیں آتے تھے۔

''میں ویکسین لگوالوں گی۔ خود کو بھی اور ڈوڈو کو بھی۔'' اس نے دل میں عہد کر لیا تھا اور دوسی کو نظر انداز کر کے ڈینی کو ساتھ لیے اپنے مکان کے پچھواڑے میں آ گئی تھی۔ یہاں ان دونوں بہن بھائی نے ڈوڈو کے ساتھ کافی وقت گزارا تھا۔ پھر سلسبیل ڈینی کو ڈوڈو کے پاس بٹھا کر جنگل میں چلی گئی تھی۔

جہاں اس نے بانس کی لمبی، تراشیدہ لکڑیاں کاٹنی شروع کیں۔ وہ اپنے ساتھ چھوٹی کلاڑی لائی تھی۔ وہ ایک گانئی تیار کر کے واپس آئی تو ڈینی زمین پر سو رہا تھا۔ اور ڈوڈو گویا اس کی حفاظت پر مامور کھڑا تھا۔ سلسبیل کو دونوں پہ بہت پیار آیا۔ اس نے اسکرٹ کی پاکٹ سے بسکٹ نکال کر ڈینی کو جگایا۔ پیکٹ اسے پکڑا کر اب وہ ڈوڈو کے لیے ہافن بنا رہی تھی۔ بانس کی لکڑیوں کو سلیقے سے جوڑ کر اگلے تین گھنٹوں میں ایک چھوٹا سا ہافن تیار ہو چکا تھا۔ یہ ڈوڈو کی پناہ گاہ تھی۔ سلسبیل مطمئن ہو کر جب ڈینی کو اٹھائے لاؤنج میں داخل ہوئی تو اس کی ممی تھوتھنی پھیلا کر بیٹھی تھی۔ تیوری چڑھی ہوئی اور موڈ سخت خراب تھا۔

''میرا خیال ہے اس کتے کی خدمت سے بہتر یہ تھا تم اپنے باپ کے ساتھ مشین میں چارہ کٹوا لیتی یا بکریوں کو باڑ میں باندھ دیتی۔ گائے کا دودھ نکالتی یا پنیر بنانے میں مدد کرتی۔''

سلسبیل نے پہلی مرتبہ ممی کو جھاڑ کر بہت ہلکا لیا تھا۔ وہ ڈوڈو کے ساتھ گزارے وقت کو ان کی ناگوار باتیں سن کر خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے سلسبیل نے سنی ان سنی کر دی تھی۔

''سلی! میں تم سے مخاطب ہوں۔ تم کس قدر خود سر ہوتی جا رہی ہو۔'' ممی اس کے انداز پہ عادتاً چنگھاڑی تھیں۔ سلی کو ممی کی ڈانٹ بری نہیں لگی تھی یا پھر وہ اس بد مزاج الو جیسی عورت کی فضول بک بک پہ اپنا موڈ خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''ممی! میں ڈوڈو کے لیے ہافن بنا رہی تھی۔ یقینی طور پر آپ جانتی ہوں گی گرینڈ پا میرے اور ڈینی کے لیے ایک کتا لائے ہیں۔ ہمیں اس کی رہائش کے لیے ایک پناہ گاہ تو بنانی ہی تھی۔''

''اس گھر میں پہلے کیا جانوروں کی کمی تھی جو یہ پالتو کتے بھی پالنے پڑیں گے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں انسانوں کے بیچ نہیں، جانوروں کے بیچ میں رہتی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں کوئی گائے ہوں، کوئی بھینس یا کوئی بکری یا کوئی......'' ممی فراٹے بھرتی زبان سے خود کو کوس رہی تھیں۔ اور اچانک جیسے سلسبیل کی زبان پہ غیر ارادتاً کھجلی ہوئی تھی۔ شدید کھجلی اور اس کی زبان پھسل پڑی۔ ''یا کوئی کتیا......'' اور اس کے بعد سلسبیل نے زبان دانتوں تلے دبا لی تھی۔ اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ڈینی ابھی بھی اس کے کندھے سے لگا تھا اور شاید وہ اونگھ رہا تھا۔ سلسبیل نے اسے احتیاط

کے ساتھ اپنے سنگل بیڈ پہ لٹا دیا اور اس پر کمفرٹ ڈال دیا۔ اب وہ کئی گھنٹے تک پرسکون سو سکتا تھ۔ سلسبیل نے صامن سے رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھوئے تھے۔ پھر وہ کچن میں گئی تھی اور ڈینی کے لیے دودھ کی بوتل بناتے ہوئے اسے ڈوڈو کا خیال آیا تھا مگر اسے یقین تھا کہ ممی ڈوڈو کے لیے دودھ کبھی نہیں دیں گی۔

تب وہ دل مسوس کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

بیڈ پر لیٹنے سے پہلے، ڈینی کے گرد بازو کا گھیرا بناتے ہوئے اور ڈینی کو دودھ کی بوتل دیتے ہوئے اس کے ذہن میں دوسی انکل اور بروز دپا کی کوئی بات نہیں تھی اور وہ بہت پرسکون انداز میں نیند کی گہری وادیوں میں اتر گئی تھی۔

آخن میوہلے میں دو تھیٹر بھی تھے۔ بڑے بڑے تھیٹر کو مقامی پرفارمرز اور موسیقاروں سے زیادہ وہاں آنے والے سیاست دان استعمال کیا کرتے تھے۔ انتخابات سے اور بعد میں وہاں مردوں کا ایک ہجوم جمع ہو جاتا تھا اور جوشیلی تصویریں کی جاتی تھیں، وعدے اور پراپیگنڈے ہوا میں بھنبھناتی آوارہ مکھیوں کی طرح چرانے لگتے تھے۔

دوسری جگہ بھی خاصی مشہور تھی۔ جو تمبا کو نوشی، سمگلروں کو فلموں کے ساتھ چائے اور دیگر ممنوع اشیاء کوکین، افیون وغیرہ لانے پر بڑے بڑے کمیشن دیتا تھا۔ یوں آخن میوہلے کے لوگوں نے جون وائن وسیٹرنز، جولیس سیزر اور گھنی مونچھوں والے مزاحیہ آدمی کی کئی فلمیں دیکھ رکھی تھیں۔

گرینڈ پا کو اکثر بروز ویا فلم دکھانے لے جاتا تھا۔ وہ خود بڑا ہی شوقین مزاج آدمی تھا۔ وہ جب بھی گھر آتا تو ڈینی اور سلسبیل کی خوب موجیں لگتی تھیں۔ وہ ان کو کھلی پاکٹ منی دیتا اور دادی کی نظر بچا کر وہ پہاڑی سے اتر کر وادی میں بنی چھوٹی دکانوں سے خوب کھانے پینے کی چیزیں لے آتی تھی۔ چپس، جوس، ببلز اور دیگر چیزیں۔

ایک دن بروز زبردستی ڈینی کو اور سلسبیل کو سینما گھر لے آیا تھا۔ حالانکہ سلسبیل کی دادی نے بہتیرا روکا۔

''جانے دیں ممی! باپ کو تو کبھی توفیق نہیں ہوئی۔ بچوں کو کسی سیرگاہ میں تفریح کے لیے لے جاتے۔ بکریاں، بھیڑیں اور بھینس دیکھ دیکھ کر جانور بن رہے ہیں۔ کچھ دنیا کو دیکھنے دیں ان کو بھی۔ میرے تو نصیب میں نہیں۔ بچے تو دیکھ لیں۔''

جب ممی نے دوٹوک بات ختم کر دی تو دادی کی وہاں کیا چلنی تھی مگر دادی سخت ناخوش تھیں۔ان کے ماتھے پہ ناگواری کی ایک نہیں دو نہیں پوری چار سلوٹیں تھیں۔جو کبھی ابھر جاتی تھیں اور نہ کبھی معدوم ہو جاتی تھیں۔اس دن بچے بہت خوش تھے۔دوران فلم وہ پاپ کارن اور جوس پیتے رہے۔یہ فلم ایک محبت نما فلم تھی جس میں دو محبت کرنے والوں کو الگ کرنے کی تقریباً ہر بندہ سر توڑ کوشش میں مصروف تھا۔وہ کبھی پید مجنوں تلے ملتے یا کسی بیلے کنارے گیلی ٹھنڈی ریت کے اوپر۔جہاں لہریں شور مچاتی تھیں یا نہر کے کنارے گھیرے خاموش اور افسردہ ندی کے پاس پتھروں کی پہاڑیوں پر۔سلسبیل کو سینما گھر کی ہر چیز بہت بھائی تھی۔آراستہ گیلری، بھاری خوشنما پردے، خیر مقدم کرتی گہری تاریکی۔

''تمہارا نام میری ہتھیلی پہ نقش ہے۔

تم میری محبت کا ستارہ ہے۔

تمہاری محبت میرے خون میں دوڑتی ہے۔

اگر تم کسی اور کبھی دیکھ کر مسکرائے تو وہ میں تمہاری جان لے لوں گی۔یا میں اپنی جان دریائے نیگر کی تیز لہروں کے حوالے کر دوں گی۔واپسی بروزو کی خوب صورت کار میں جھومتے اور گاتے ہوئے وہ اس تاریکی سے بہت بے خبر تھی۔جس سے سلسبیل پر گھات لگا رکھی تھی۔ڈینی راستے بھر اونگھتا رہا۔وہ سخت بے آرام تھا۔

سلسبیل کی نرم، محبت بھری پر سکون آغوش میں بھی بے آرام تھا۔

''بروزو پا! گھر چلیں۔'' ڈینی نے اونگھتے ہوئے کئی بار کہا تھا۔

گاڑی بل کھاتی آخن میو ہلے کی ناگنی سڑک پر رواں دواں تھی۔صد شکر کہ سلسبیل کا گھر آ گیا......سفر کٹ گیا، مگر ناخوشگوار نہیں تھا۔اس رات کی صبح بہت رینگ رینگ کر ہوئی تھی۔

حالانکہ سلسبیل کو سخت بے چینی تھی کہ وہ جلد از جلد اپنی پڑوسن ڈی سوزا سے ملے اور اسے سینما گھر کی پوری روداد سنا دے۔آخن میو ہلے کے اس چھوٹے سے غیر معروف قصبے میں شاید ہی کوئی لڑکی کسی سینما گھر گئی ہو...... یہ بہت بڑا اعزاز تھا، جو صرف سلسبیل کو حاصل ہوا تھا۔

اگلی سویرا اس نے جیسے تیسے یونیفارم پہنا، بیگ اٹھایا اور بغیر ناشتہ کے لیے ڈی سوزا کے گھر کی گھنٹی بجادی تھی۔ کچھ ہی دیر میں زرد رنگت والی کمزور سی ایک لڑکی نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ سخت بے زار لگ رہی تھی۔

''اسکول نہیں جانا۔''

''جانا ہے۔'' ڈی سوزا نے لٹھ مار انداز میں کہا تھا اور ساتھ ہی دروازہ دھاڑ سے بند کردیا۔ اندر سے اس کی ممی نے خوب کوسنے دیئے تھے۔

لگا تھا آج بھی ڈی سوزا کو ناشتہ پسند نہیں آیا تھا اور اس کی ممی نے خوب اس کی ٹھکائی کی تھی۔

''تم کھانے کو کچھ لائی ہو!'' ڈی سوزا نے پتھریلے ناہموار دستوں پہ احتیاط سے چلتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہاں، پنیر۔''

''مجھے دوگی۔ بس تھوڑا سا۔'' ڈی سوزا نے لجاجت سے کہا تھا۔

''تمہاری دادی جیسا پنیر کوئی بھی نہیں بنا سکتا۔'' اس نے تھوڑی سی خوشامد بھی کردی تھی۔

''اچھا...... تم مجھے ڈوڈو کے لیے کچھ گوشت اور تھوڑی چربی دوگی۔''

سلسبیل نے بھی فوراً ڈیل کرنے کی ٹھانی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ڈی سوزا کا باپ ایک قصاب ہے اور وہ گھر واپسی پہ ہمیشہ ڈی سوزا کی ڈھیروں بلیوں کے لیے چربی اور گوشت لاتا ہے۔

''ہاں...... دوں گی۔'' ڈی سوزا نے ہامی بھر لی تھی۔

''تم میرا آج کا سارا پنیر لے لو۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے اپنا ٹفن نکال کر ڈی سوزا کو پکڑا دیا تھا۔ ڈی سوزا بے حد ممنون نظر آنے لگی تھی اور اس کے بعد ڈی سوزا نے بغیر برا مانے سینما ہال کی پوری روداد سن لی تھی۔

''آراستہ گیلری، بھاری خوش نما پردے، خیر مقدم کرتی گہری تاریکی، پراسرار خاموشی چکنے فرش، دیواروں پہ آویزاں مبہوت کردیتے انسانوں کے پورٹریٹ۔ بہت خوب صورت دنیا تھی۔'' وہ شدید ہیجانی خوشی کا شکار تھی۔

''تمہارا نام میری ہتھیلیوں پہ نقش ہے۔
تم میری محبت کا ستارہ ہو۔''

اس نے فلم کا سندر گیت گنگنایا تھا۔ڈی سوزا کی بھی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔

''کاش میں بھی تمہارے ساتھ جاسکتی۔''اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''تم ساتھ جاسکتی ہو۔بروز و پا نے اگلی دفعہ دولس ہولزن لے جانے کا وعدہ کیا ہے......''اس نے اپنا اجلا سفید ہاتھ لہرا کر اپنی سہیلی کو یقین دہانی کروائی تھی۔

''مگر میری ممی......''ڈی سوزا ہچکچائی تھی۔

''ہاں،تمہاری ممی......''سلسبیل کا بھی جوش قدرے ماند پڑا تھا۔اس کی ممی بڑی مذہبی اور سخت گیر خاتون تھیں۔وہ عیسائی مذہب کے پیروکار تھے اور مذہبی حوالے سے خاصے شدت پسند واقع ہوئے تھے۔

''ہم کچھ آئیڈیا سوچ لیں گے۔تم پریشان نہیں ہو۔''سلسبیل نے جیسے اسے تسلی دی تھی۔

''تم کس کے ساتھ گئی تھی؟''معاً ڈی سوزا کو خیال گزرا تھا۔

''بروز و پا کے ساتھ تو گئی تھی۔''سلسبیل جھنجلائی۔

''وہی جو ہینڈسم انکل ہیں؟تمہاری سوتیلی ممی کے سوتیلے فادر!''ڈی سوزا کی بات پر سلسبیل کی جھلاہٹ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

''ہاں بابا!وہی ہے......''اس نے منہ بنا کر کہا۔

''مگر تمہارے ڈیڈی نے تمہیں اس کے ساتھ جانے کیسے دیا!میرے ڈیڈی تو میری جان نکال دیتے۔''ڈی سوزا نے ہراساں ہو کر کہا تھا۔

''یہی تو میرے اور تمہارے ڈیڈی میں فرق ہے۔''سلسبیل نے مصنوعی کالر کھڑے کیے تھے۔حالانکہ یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ کھوکھلا ہو گیا تھا۔اسکول پہنچنے سے بہت پہلے ہی سلسبیل کو اچانک خیال آیا کہ اسے بروز و پا کے ساتھ سینما گھر بالکل نہیں جانا چاہیے تھا۔

☆......☆......☆

دوبیل روڈ پر ایک گھر تھا۔شمال مغرب کی طرف، بہت ساری سڑکوں سے آگے کی طرف، ایک بڑی سی الگ تھلگ وکٹورین عمارت تھی۔ سنسان، ویران اور مقامی لوگوں کے مطابق شاید بھوتوں کی آماجگاہ تھی۔اس کی چھت ڈھلانی تھی۔ ہر طرف سے بند پورچ اور محرابی کھڑکیاں تھیں۔دوبیل روڈ پہ بے شمار اسکولز تھے۔ مہنگے سستے ترین اسکولوں میں غرباء کے بچے پڑھتے تھے۔یا ان لوگوں کے بچے یہاں آتے تھے جو گردونواح کے قصبوں اور دیہاتوں سے آتے تھے۔عیسیٰ نے اس علاقے میں بہت کم آوارہ گردی کی تھی۔اس کا بچپن یہیں گزرا تھا اور نوجوانی کا مختصر دور...... پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کچھ عرصہ امریکہ چلا گیا تھا، مگر اس کی نسبت اس علاقے سے بہت پرانی تھی۔

اسے بہت کم وقت ملتا تھا کہ وہ سڑکوں پر آوارہ گردی کر سکے، مگر اب وہ اکثر آتے جاتے ہوئے اردگرد کے ماحول کو دیکھتا تھا۔کافی نوجوانوں کے گروپ وہاں ڈیرہ ڈالے بیٹھے رہتے۔کوئی بڑے ہی نکمے لڑکے تھے۔کئی کئی گھنٹے فضول مباحثوں میں ضائع کر دیتے تھے۔ان میں ہر طرح کے لڑکے شامل تھے۔بہت سادہ لوح، منکرین مہذب، عدم تشدد کے حامی، امن پسند، سماجی تارک، مختلف نظریات سے پھرنے والے اور بہت سارے جن کی کوئی ایک وابستگی نہیں تھی۔

وہ رنگ برنگا گروہ تھا۔سیاہ وسفید کا۔

وکٹورین عمارت سے کچھ آنے جہاں یہ گروہ پایا جاتا تھا۔اس جگہ ایک عجیب سی بو آتی تھی۔ بوسیدگی اور بیماری کی بو۔وکٹورین عمارت سے گزر کر ایک چھوٹا کاٹیج نظر آتا تھا۔اس کاٹیج کی جھکی بالکونیوں سے بھی بو آتی تھی۔ جہاں ایک زرد رنگت والا درمیانی عمر کا آدمی اکثر کھڑا سوچوں میں ڈوبا نظر آتا تھا۔بعض اوقات بدتر بو آتی تھی اور کبھی اس بوجھل بو تلے جو کسی کو اور ہر شے کو گھیرے میں لیے ہوئے تھی۔ گو کہ دوسری مشک بھی تھی۔جیسا کہ پھولوں کی، مسالوں کی، پتوں کی، سیلن زدہ مکانوں کی۔

گھر کے اندر لکڑی کی بل کھاتی سیڑھیاں تھیں۔اس قدر عمودی اور بوسیدہ...... دھول مٹی سے اٹی۔ یہاں ٹوٹے لیمپس، بوسیدہ فرنیچر، جلے ہوئے سگریٹس، ٹوٹی بوتلیں، گندے گلاس، بدبودار لباس۔غرض ہر چیز کی فراوانی تھی جس کی وہ امید رکھ سکتا تھا۔

ایک طرف کتابوں، اخبار کے ٹکڑوں، فیکشن میگزینوں، کافی کے بوسیدہ، کائی زدہ مگوں، وائن کے گلاسوں، چوہوں کے کترے صوفوں، ایک عجیب بے ترتیبی اور پھیلاؤ تھا۔ جو کسی بھی صحت مند انسان کی ذہنی حالت کو بے ترتیب کر سکتا تھا۔

اس رات عیسیٰ کو اپنے ہی گھر میں نیند نہیں آ رہی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ اکیلا تھا۔ بس وہ آزردہ تھا۔

اپنے حالات پر اور اپنی ماں کی حالت زار پر۔

آج وہ اپنی ماں کو ترک نشہ سینٹر چھوڑے بارہویں دن کی بوجھل رات گزار رہا تھا۔ وہ ہر سال ماں کا نشہ چھڑوانے تین مہینے کی چھٹی لے کر آتا تھا۔ کبھی پڑھائی سے چھٹی، کبھی ٹریننگ سے چھٹی، اور اب نوکری سے چھٹی۔ شاید وہ اپنا چمکتا فیوچر امریکہ کی سرزمین پر چھوڑ کر آ گیا تھا۔ یہاں اس کی ماں کو ضرورت تھی۔

وہ جب بھی چھٹی پر آتا تھا۔ اس گھر کی حالت بدل کر جاتا۔ نیا فرنیچر ڈالتا۔ ستھرے نئے نکور برتن لاتا۔ پردے، کشن، چادریں ہر چیز بدل دیتا تھا۔ جیسا کہ وہ اپنا ماضی بدل دینا چاہتا ہو۔ اپنی ماں کے کردار سے جڑی ہر چیز بدل دینا چاہتا ہو۔

اپنی شناخت کے سوا وہ ہر شے بدل دینا چاہتا تھا۔ بس نہیں بدل دینا چاہتا تھا کہ اپنے نام کو۔ اپنے نام سے جڑے ان ناموں کو جن کی خوشبو اس کی حیات تھی۔ محترمہ نرگس خیام، بیرسٹر خیام عیسیٰ۔

ہاں وہ ان دو لوگوں کا بیٹا تھا۔ وہ دو لوگ جو جنت بریں سے آئے تھے۔ جن کے دل خدا نے اپنی رحمت سے بھر رکھے تھے۔ نرم، گداز اور شفاف۔ اسے لگتا تھا وہ اپنے باپ سے زیادہ ماں سے محبت کرتا ہے۔ وہ ماں جسے اس نے اپنے سامنے مجسم کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اسے اتنا یقین تھا کہ جب جب وہ سانس لیتا ہے۔ اس سانس کے ایک ایک زیر و بم پہ اس کی ماں "الحمدللہ" کہتی ہے۔

وہ نرجس خیام کا بیٹا تھا اور اسے اپنی روحانی ماں سے محبت نہیں کوئی والہانہ عشق تھا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے غائبانہ عشق کرتے تھے۔ اگر نرجس خیام نے اسے سوتن کا بیٹا نہیں سمجھا تھا تو وہ بھی اپنی روحانی ماں کو اپنی حقیقی ماں سے بڑھ کر چاہتا تھا۔

اس کے ادھیڑ عمر باپ نے بہت کم سنی میں چند تصویریں دکھا کر نرجس خیام سے اس کا تعارف کروایا تھا۔

''یہ تمہاری ماں ہے......''

اور اس کے بعد عسی نے کبھی یہ نہیں سوچا۔ ''میری ماں یہ عورت ہے؟'' وہ اس کی ماں تھی۔ دور دیس میں بیٹھی اسے سندیسے بھیجتی تھی اور اسے دعائیں بھیجتی تھی۔

اسے نام بھی نرجس خیام نے دیا تھا۔

''ہشام عیسیٰ۔''

عسیٰ کو اپنا نام پسند تھا۔ وہ خود سے محبت کرتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ کوئی خود پسند تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اس کی ماں اس سے شدید محبت کرتی تھی۔

وہ جانتا تھا۔ اس کی ماں نحیف ہو چکی ہے۔ وہ اس کی جدائی اور محبت کا بار اٹھائے تھک چکی ہے۔

مگر وہ مجبور تھی اس عورت کے ہاتھوں جو بد قسمتی سے اسے دنیا میں لانے کا باعث بنی تھی۔

وہ بیرسٹر خیام عیسیٰ کی دوسری بیوی تھی۔ ڈیزی نے بیرسٹر صاحب سے کچھ مالی مفادات کے تحت شادی کی تھی۔ بیرسٹر صاحب کو بڑھاپے میں عیسیٰ کی صورت ایک مدد ملی تھی۔ وہ یہ شادی نباہنا چاہتے تھے مگر زندگی نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی تھی۔ بیرسٹر صاحب کے بعد بھی ایک خطیر رقم ڈیزی کے اکاؤنٹ میں آتی رہی۔ یہ سلسلہ کبھی نہیں رکا۔ حتیٰ کہ یہ مکان، کار اور دیگر ضرورت کی اشیاء بیرسٹر کی مہربانیوں کا نتیجہ تھا مگر ڈیزی نے اپنی عیاشیوں میں ہر چیز تباہ کر دی تھی۔ حتیٰ کہ خود کو بھی۔

وہ ایک چین ڈرنکر تھا۔ بری عادتوں، گندی لت میں پڑ کر خود کو خراب کر چکی تھی۔ حالانکہ وہ ایک جوان اور خوبرو عورت تھی۔ چاہتی تو اپنی زندگی کو کسی بھی طور ترتیب دے سکتی تھی۔ اپنے بیٹے کے لیے یا خود کے لیے۔ زندگی کو از سرِ نو سنوار لیتی۔ مگر اس نے یورپ کی پچاسی فیصد عورتوں کی طرح ایسا نہیں کیا۔

عیسیٰ اپنی ماں کے لیے بہت کڑھتا تھا۔ وہ اسے زندگی کی طرف لانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے اونگھ آ گئی تھی۔ پھر اس نے خواب دیکھا۔ فخر کے بیچوں بیچ۔ دو

سمے کے ملاپ کا وقت تھا۔ اسے لگا قبضہ آوروں کا وکٹورین گھر ایسے بے کراں سمندر میں تیر رہا تھا۔ جو بہت خوبی کے ساتھ آسمان میں ضم ہو گیا تھا۔ جہاں سمندری بگلے نیچے کو غوطہ لگاتے تھے۔ اور پھر اوپر کو اٹھتے تھے۔ وہ ان قبضہ آوروں کو پانی میں چھینٹے اڑاتے دیکھتا رہا۔ اونچی آواز میں اور خوش باش جل پریوں کی طرح۔ وہاں ایک کنارے پر لڑکی کھڑی تھی۔ موتیے کے پھول جیسی سفید، کسی منہ بند کلی کی طرح شگفتہ اس کے بہت لمبے اور بہت سیاہ بال تھے۔ جو ہوا میں پھڑ پھڑاتے تھے۔ وہ اسے بہت امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہنا چاہتی ہو۔

''میرے طبیب! کب میرے پاس آؤ گے! میں زخم خوردہ ہوں۔ اور میں تکلیف میں ہوں۔''

''وہ لڑکی کون تھی...... وہ کیا چاہتی تھی، اسے کیوں پکارتی تھی۔''

وہ نیند سے ہڑبڑا گیا۔ اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

''شافیہ......'' اسے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکن اپنی معمول کی رفتار سے ہٹ کے تھی۔ اس کی یادیں ملتی جلتی تھیں۔ ان یادوں میں شافیہ نام کا دیا جلتا تھا۔ اس کی ماں نے اس چراغ کو کبھی بجھنے نہیں دیا تھا۔ وہ اسے باور کرواتی تھیں کہ ایک خوب صورت لڑکی اس کے انتظار میں ہے۔ اور یہ کہ عیسیٰ خود کو پابند سمجھے اور وہ شادی کے لیے عیسیٰ کی واپسی کے انتظار میں ہے۔

اس کی ماں اس کے حوالے سے جو خواہش رکھتی تھی۔ وہ عیسیٰ کے لیے حکم کا درجہ تھا۔ عیسیٰ نے شافیہ نامی لڑکی کو بغیر دیکھے اپنے جیون کے لیے اپنی ماں کے کہنے پر چن لیا تھا۔ وہ کسی بھی لڑکی سے شادی کر سکتا تھا۔ شرط یہ تھی کہ اس کی ماں کا وہ انتخاب ہوتی۔ وہ اکثر شافیہ کو سوچنے لگا تھا اور اب وہ کبھی کبھار اس کے خوابوں میں بھی آنے لگی تھی۔ اس کی ماں کو پسند تھی تو عیسیٰ نے بھی اسے دل میں خوب جگہ دے لی تھی۔

وہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بڑا ہی عجیب لڑکا تھا۔

☆......☆......☆

البمز بند ہو چکے تھے مگر پھر بھی شام کا عکس شفاف پانیوں کے اوپر تیر رہا تھا۔ شافیہ نے دو منزلہ سرخ بسوں، بڑے بڑے گھنٹہ گھروں کی تصویروں والے تمام پوسٹ کارڈ تہہ بہ تہہ لکڑی کے بکسے میں محفوظ کر

دیئے تھے ان تمام خطوط سے کسی اجنبی دیس کے اجنبی خدوخال والے محنتی انسان کی باس آتی تھی۔

اجنبی زمینوں کی مہک، خوشبو، ذائقے اور تمام جذبات کا مرقع ان خطوط میں باآسانی مل سکتا تھا، جو باقاعدگی سے ہشام لکھتا تھا اور بڑے دھیان سے پوسٹ کرتا تھا۔

ان دنوں مسز جس خیام کو ہشام کی طرف سے آنے والے کسی خاص خط کا انتظار تھا۔ وہ خط کسی خاص نوعیت کا ہوسکتا تھا جس میں کوئی ''اطلاع'' ہوتی یا کوئی خوش خبری؟

کیونکہ جی جی بہت مرتبہ شافیہ کو باور کروا چکی تھی کہ ہشام انہیں اچانک کوئی سرپرائز دینے والا ہے۔ شاید اس نے اپنی کسی فون کال میں اس کا ذکر کیا ہو۔ مٹی کے پیالوں میں دہی جماتے ہوئے پیسٹری کے لیے آٹا گوندھتے، اپنے رخساروں کو سہلاتے کتنی ہی مرتبہ شافیہ نے بے دھیانی میں سوچا تھا۔

''نجانے ہشام جی جی کو کیسی خبر دینے والا تھا! خدا خیر کرے۔''

اکثر اس کا دل گھبرا جاتا تھا۔ جی جی اور ہشام کی والہانہ محبت اسے کبھی کبھی خوفزدہ کر دیتی تھی۔

کوٹھی کے دالان میں اس قدیم درخت کی خوف ناک شاخوں کو تکتے ہوئے شافیہ بڑی رنجیدہ تھی۔ اسے یہ بے نام درخت بھی اپنے جیسا رنجیدہ دکھائی دیا تھا۔ لہردار بادلوں کی جانب پھیلی ہوئی شاخوں والا بے ترتیب سایہ درخت شافیہ کی اپنی بے ڈھنگی زندگی سے کافی مشابہت رکھتا تھا۔

کبھی کبھی شافیہ کا دل کرتا تھا وہ اس بے ڈھنگی شاخوں والے درخت سے جھول جائے یا اس کی اونچائیوں کو ایک مرتبہ اس پر چڑھائی کے بعد محسوس کرے۔ مگر شافیہ کو ہمیشہ کی طرح اونچائی سے خوف محسوس ہوا تھا۔ وہ فضا میں تیرتے جہازوں کو دیکھ کر بھی ڈر جایا کرتی تھی۔ کیسے فضا کے رتھ پہ اپنے ہزاروں ٹن وزنی وجود کے ساتھ سوار ہوتے تھے، اور ان جہازوں کے اندر بیٹھی ''بہادر'' مخلوق پر تو شافیہ کو خواہ مخواہ رشک آیا کرتا تھا۔

جی جی قیلولہ میں تھیں اور شافیہ بوریت سے بھی اکتا ہوگئی تھی، مگر جانے کو دل نہیں کر رہا تھا کیونکہ فرح کی موجودگی میں شافیہ کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ فرح کا بنگلہ اسی کالونی میں تھا۔ کچھ سال پہلے فرح کے شوہر نے مناسب داموں خرید کر فرح کے نام لگوا دیا تھا۔ فرح کی چار بیٹیاں بھی تھیں۔ اسود

چاروں بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ یہ پانچویں بہن بھائی عرشیہ سے بہت مختلف تھے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں سے پوزیشن ہولڈر ہونے کے ساتھ ساتھ سب ہی بہترین اداروں میں جاب بھی کر رہے تھے۔ ایک چیز ان سب میں مشترکہ پائی جاتی تھی اور وہ تھی نخوت۔ عرشیہ کی اکڑ شافیہ کو کبھی سمجھ نہیں آسکتی تھی۔ چلو اسود اور اس کی بہنیں تو خود کو بہت کچھ سمجھتی تھیں شاید تعلیم اور اچھی نوکریوں، بہتر لائف اسٹائل کی وجہ سے۔ جبکہ عرشیہ کے اکڑنے کا سبب شافیہ کو اب تک معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

کچھ دیر بعد درخت کی کمزور سی شاخ پر ایک پرندہ آبیٹھا تھا۔ وہ بڑا ہی نفیس پرندہ تھا۔

شافیہ اسے بہت دیر تک دیکھتی رہی۔ جیسے خود کو اسی پرندے کے مشابہ سمجھ رہی ہو، مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ پرندہ تو آزاد تھا مگر شافیہ آزاد کہاں تھی؟

☆......☆......☆

غوثیہ ناقابل مدافعت سوچوں اور بے بنیاد خوف و اندیشے دل میں سموئے بے قرار گھوم رہی تھیں۔ گول کمرے، گلیارے، راہداریاں...... ماربل کے فرش اور ان کے ننگے پیر۔

دس مرتبہ آس، امید اور ڈھیر توقع لے کر شاویز کا کمرہ کھولا۔ مگر ابھی تک مکین وہاں موجود نہیں تھا تو پھر مکین کہاں تھا؟

بہت سالوں سے غوثیہ، فرحت اور رفعت کے احساس سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔ شاویز وہاں موجود نہیں تھا۔ شاویز کا موجود نہ ہونا کبھی بھی نیک شگون نہیں ہوتا تھا۔ ان کی ہتھیلیوں میں بے چینی بھری خارش تھی۔ ان کا دل معمول سے کہیں زیادہ دھڑک رہا تھا۔ ان کی بائیں آنکھ بھی پھڑک رہی تھی۔ بہت کچھ پریشان کن ضرور تھا۔ شدید اضطرار میں بے قرار کرتا ہوا۔ آسمانوں سے اترے کسی خفیہ پیام کی طرح۔ غوثیہ کو یہ بڑی سی خاموش حویلی کسی خون آشام بلا کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تیزی سے حویلی کے پچھواڑے میں موجود اس دو منزلہ انیکسی نما مکان کی طرف آئیں۔ جن میں وہ چار بھنائی کرائے دار رہتے تھے۔ اس وقت وہ چاروں گھر میں موجود نہیں ہوتے تھے۔ کوئی پڑھنے تو کوئی ملازمت سے جڑا ہوا تھا۔ انہوں نے خوفزدہ نظروں سے ماربل لگے صحن کو بار بار دیکھا۔ وہاں صفائی کے ساتھ خاموشی بھی تھی۔

''سنہرے......'' انہوں نے مری مری سی آواز میں سنہرے کو آواز دی۔ کچھ ہی دیر میں سونے جیسی رنگت والی، سونے جیسی آنکھوں اور گول گول لچھے دار سنہرے بالوں والی کمزور سی ایک لڑکی نے چپل اڑس کر پیروں میں ملائم آواز کے ساتھ جواب دیا۔

''جی خالہ جی......''

''تم آج اسکول نہیں گئی بیٹی؟'' غوثیہ نے قدرے مرجھائی آواز میں پوچھا تھا۔ نجانے سنہرے نے کیوں ہلکی سی نظر چرائی تھی۔

''نہیں خالہ جی...... مجھے آج بخار ہے۔'' وہ مرجھائی لگ رہی تھی۔ دبلی پتلی سی۔ نحیف ونزار۔ خوب صورت دل میں اترتے نین ونقش۔ ایسا گوراشیشے جیسا چمکتا رنگ۔ اوپر سے پوری کمر کو ڈھانپتے بالوں نے کمزور سی کمر کا کچھ بھرم رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک خوب صورت نو عمر سی لڑکی تھی۔

''بھائیوں نے کہا۔ بخار ہے تو چھٹی کر لو۔''

نجانے کیوں غوثیہ کو سنہرے کا لہجہ بھیگا سا محسوس ہوا تھا۔ بخار کی وجہ سے اس کی رنگت دبکی دبکی لگ رہی تھی۔

''آپ کو کوئی کام تھا مجھ سے۔'' معاً اسے خالہ جی کی آمد کا خیال آیا۔ وہ اکثر کسی نہ کسی کام کے لیے آیا کرتی تھیں۔

''وہ پوچھنا تھا۔ شاویز تو نہیں آیا تھا۔'' غوثیہ کو جانے کیوں لگا کہ سنہرے کا سنہرا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔

❁ ❁

ناول **سلسبیل** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **12** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 3

سورج ڈھلنے کا وقت تھا ہر روز کی طرح اداس سی شام رات کی گود میں دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ وہ آخن میو ملے میں سامنے کے رخ برآمدے والے دو منزلہ گھر کا ساز و سامان سے آراستہ تہہ خانہ تھا اس کے اندر اگرچہ مختلف دنیا آباد تھی اس کے اندر پانچ کمرے تھے ہر کسی میں آدمی سنوکر کھیلتے تھے یا پھر رولے بلیک جیک یا پوکر کی میزوں کے گرد جمع ہوتے تھے فضا دھوئیں سے بوجھل ہوتی تھی زیادہ دولت اور کم خوف والے لوگ سامنے کامن روم میں ہوتے تھے سرگوشیاں ہنسی اور کبھی کبھی غراہٹوں کی ناگوار آوازیں پرسکون اعصاب والوں کو ناگوار ہی گزر سکتی تھیں یہ مردوں کی جگہ تھی یہاں شاذ ہی کوئی عورت نظر آتی تھی۔ مگر جو عورتیں یہاں موجود تھیں ان کے لئے پہلے ہی بات طے کی جا چکی تھی کوئی ان کے بارے میں سوال نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ناقابل رسائی تھیں یہاں بے لکھے قوانین رائج تھے جن کی ہر کوئی پیروی کرتا تھا یہاں دنیا بھر سے بھانت بھانت کے لوگ آتے تھے انگلش عربی پاکستانی کیربین ترک یونانی افغانی۔

کوئی کسی کا کچھ بھی نہیں لگتا تھا پھر بھی گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزار کر چلے جاتے تھے عیسی اس جھنکار بالوں والے روسی کو ہر روز دیکھتا تھا جب وہ کچھ سے یہاں کافی پینے کو رکتا۔۔ کچھ دیر ستانے کے لیے یا اپنی ماں ڈیزی کی حالت زار سے فرار کی کوشش کے طور پر۔۔ یا ڈیزی کو یہاں سے اکثر اوقات خرابہ حالت میں اٹھاتے ہوئے ہشام عیسی بہت ہی دلگرفتہ ہوتا تھا۔

اس شام روسی نے بلیک جیک کھیلا پاسہ پھینکا اور پھر رولے کا پہیہ گھمایا۔ اس نے پہلی بازی سیاہ پر کھیلی۔ وہ بڑا مبارک آغاز تھا اگلی بازی کومبی نیشن میں تھی۔ وہ پھر جیت گیا تھا اس کے پاس رقم کم تھی اس بار اس نے سرخ پر بازی لگائی تھی وہ ہر بار جیتی ہوئی رقم کو اگلی باری پے لگا رہا تھا وہ کافی مرتبہ جیتا تھا۔ جیت ایک نشہ ہے۔۔ ہر اس نشے کی طرح جو منہ کو ایک دفعہ لگ جائے تو چھوٹ نہیں سکتا۔

کمرے میں موجود ہر کوئی متحرک اور پر جوش تھا۔وہ لوگ اسے سراہ رہے تھے۔اس کو تھپکی دے رہے تھے حوصلہ بڑھا رہے تھے

روسی کا سینہ فخر سے چوڑا ہو رہا تھا۔اجنبی سراہ رہے تھے یہ کوئی کم دل نشین احساس نہیں تھا۔اس کی بہن کے باڑے کی بدبو سے ہٹ کر بہت ہی الگ اور جان فزا احساس تھا۔تحسین اور رشک نوع بشر کی سب سے بڑی کمزوری ہے وہ اس کمزوری کا زیادہ شکار ہو رہا تھا ہشام کو اس سے یہی لگا تھا۔کہ یہ توجہ کا بھوکا جذبات میں جیتی بازی ضرور ہار دے گا مگر اس دفعہ بلکل ایسا نہیں ہوا۔روسی غیر متوقع جیٹ ت گیا تھا اور وہ بہت ہی خوش تھا۔وہ ایک بڑی رقم جیت کر بار سے باہر نکلا تھا

اس کے پیچھے ستائشی آوازیں تھیں

"تم ایک لکی انسان ہو"

"البانوی تم آج کی رات اپنے نام کر گے"

"جیت ہر ایک کا مقدر نہیں ہوسکتی"

روسی نے آوازوں پے توجہ نہیں دی تھی اس کی تمام تر توجہ اس خوب صورت نوجوان پے تھی جو بار کی دوسری طرف ایک چھوٹی شاپ سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں خرید رہا تھا۔یہ وہ ہی جوان تھا جس نے اسے ان جنگلی لڑکوں سے بچایا تھا۔روسی اسے پہچان چکا تھا۔

کچھ دن پہلے کا جھگڑا اسے پوری شدت سے یاد آ رہا تھا

وکٹورین عمارت کا جز وقتی رہائشی روسی اپنے محسن کو پہچان سکتا تھا۔جب وہ رنگ برنگا گروہ اسے مار پیٹ کر جا چکا تو اسی جوان نے روسی کی مرہم پٹی کی تھی

اور روسی کو اس بدبو زدہ کا میج میں بھی چھوڑ کر گیا تھا جھکی بالکونیوں والے کاٹیج سے آنے والی بو ہشام بھی کیسے بھول سکتا تھا؟ وکٹورین عمارت سے اور طرح کی بھی بوئیں آتی تھیں

جیسا کہ پھولوں کی،مصالحوں کی،پتوں کی،سیلن زدہ مکانوں کی۔

"ہے عیسی! تم کیسے ہو؟"

روسی جیسا بدمزاج جھگڑالو کسی کا حال پوچھ لے یہ اچنبھے کی بات تھی۔

عیسی نے کندھے جھٹک کر حیرانگی سے کہا۔

"تم نشے میں بھی اچھی پہچان رکھتے ہو"

"میں نشے میں انسانیت نہیں بھولتا۔ میرے میں کچھ اچھا ہو یا نہ ہو یہ اچھا ضرور ہے" روسی نے خوشدلی سے بتایا۔ آج وہ ضرورت سے زیادہ خوش تھا

"امیزنگ" عیسی کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

"ہے ڈاکٹر! تم کب تک یہاں ہو؟"

کچھ دیر بعد وہ بڑی بے تکلفی سے پوچھ رہا تھا

" کچھ پتہ نہیں۔ شاید ہمیشہ کے لیے یا کچھ عرصہ رہوں۔ میں کچھ کہ نہیں سکتا" عیسی اداس ہوا تھا اسے پاکستان میں موجود اپنی بے قرار سی ماں یاد آ رہی تھی جو ایک ایک دن اس کے انتظار میں گزار رہی تھی۔ اور یہاں وہ ڈیزی کے لیے بندھ گیا تھا یا آخن میو ملے اسے ہمیشہ کے لیے باندھنے والا تھا۔

"میں کل چلا جاؤں گا۔ کچھ دور سلسبیل پہاڑی چشمے پر میری بہن کا گھر ہے۔ میں وہاں جاتا رہتا ہوں اس کے بچوں سے ملنے اب کے کچھ تحفے خریدوں گا۔ ڈینی کے لیے گیم اور سلی کے لیے چاکلیٹ اور سٹوری بکس۔ میرے پاس کافی سے زیادہ رقم موجود ہے" وہ بے تحاشا باتونی آدمی بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ پیسہ انسان کو کیسی تقویت دیتا ہے۔ روسی کے چہرے سے صاف عیاں تھا

"میری بہن بہت کمینی عورت ہے بچوں کو کھلونے بھی نہیں لے کر دیتی۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو ترستے رہتے ہیں" روسی رنجیدہ ہوا تھا۔ ایک اداسی اس کے گرد گھیرا تنگ کر گئی تھی۔

اس کا چہرہ تاریک سا ہوا

جیسے بچوں کی محرومی کہیں اس کے اندر بھی جاگزیں تھی

"ہے ڈاکٹر! تم کسی دن چلو نا سلسبیل دکھاؤں گا"

روسی کی طرف سے بے ساختہ ملنے والا انویٹیشن عیسی کے لیے بڑا اچھبے کا باعث تھا۔

"حیران کیوں ہوتے ہو۔ سلسبیل بہت خوب صورت ہے"

روسی مزید بھی سلسبیل کی تعریف میں رطب اللسان ہوا تو عیسی کو جھلاہٹ ہوئی۔۔ اسے لگا روسی غیر ضروری گفتگو میں طوالت چاہتا ہے

"میں تم کو اس ویک اینڈ پر ضرور لے کر چلوں گا۔ یہاں سے بہت قریب ہے۔ ہم کو بس تھوڑی دیر چہل قدمی کرنا ہوگی"

روسی کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا چاروناچار اس بہت ہی بامروت ڈاکٹر کو اس کی ماننی ہی پڑی

"مجھے یقین تھا کہ تم ضرور میرے ساتھ چلو گے سلسبیل کو دیکھے بنا کوئی رہ ہی نہیں سکتا"

روسی بے دھڑک تعریفوں کے پل باندھتا اب عیسی کو بیزار کر رہا تھا

عیسی جلدی سے بار سے نکلا اور اسٹریٹ پر چڑھ گیا

"اففف توبہ کس قدر باتونی لوگ ہیں اس شہر کے "عیسی کو جھرجھری آ گئی تھی۔

وکٹورین عمارت کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے بہت سارے مصالحوں کی مشک نے بے چین کیا تھا۔ کہیں کوئی بہت سگھڑ البانوی خاتون باورچی خانے میں کھڑی اپنے بچوں کے لیے ہانڈی پکا رہی تھی۔ عیسی کو اپنی پاکستان والی ماں یاد آئی۔

ڈیڈی بتاتے تھے اس کی ماں کے ہاتھ میں بہت لذت تھی گو کہ عیسی کو کبھی اپنی ماں کے ہاتھ کا کھانا نصیب نہیں ہوا تھا مگر اسے پورا یقین تھا کہ اس کی ماں بڑا ہی بہترین کھانا بناتی تھی

اپنے کاٹیج کی بے رنگ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے عیسی کا دل یک دم شدید اداسی کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔

اب اسے ڈیزی کا سامنا کرنا ہوگا؟

اپنی ماں کی حالت زار پہروں اسے ڈپریسڈ رکھتی تھی دل ہر چیز سے اچاٹ ہو جاتا تھا دنیا کا ہر شہر اسے شراب زدہ قید خانہ لگتا تھا جہاں عیسی جیسے انسان کا سانس لینا بھی دوبھر ہوتا۔ وہ ایک بلا کا نفیس انسان تھا۔ زندگی کی ہر چیز میں نفاست کا خیال رکھتا تھا مگر اس کی ماں کا نفاست سے دور دور کا واسطہ نہیں تھا۔

اس نے ایک طائرانہ نظر میں جائزہ لیا۔ پورا مکان بکھرا پڑا تھا کوئی بھی چیز اپنی جگہ پہ نہیں تھی

گو کہ عیسی کل رات پوری جانفشانی کے ساتھ اس مکان کو چمکا کر گیا تھا۔۔نائٹ ڈیوٹی کر کے گھر آنا اور ایسا مچھلی بازار دیکھ کر خود کو کول رکھنا بس عیسی کا ہی کمال ہو سکتا تھا

"میں پوچھ سکتا ہوں ایسی کیا مصیبت آچکی تھی جو آپ نے ہر چیز الٹ پلٹ کر دی۔کیا گم گیا تھا جو تلاش کر رہی تھیں"؟

"میں کیا تلاش کر رہی تھی" ڈیزی نے کچھ حیرت سے کہا

"ہاں میں کچھ تلاش تو کر رہی تھی۔تم میری ہر چیز الٹ پلٹ کر کے چلے جاتے ہو۔مجھے کچھ بھی ملتا نہیں ہے" ڈیزی نے خفگی سے کہا تھا

"آپ مجھے بتاتیں۔آپ کو کیا چاہیۓ؟" وہ گہرا سانس لیتا ایک ایک کیبن دیکھنے لگا۔

"ہاں دیکھو۔۔۔نجانے کہاں رکھ دیا ہے شاید کسی کپ بورڈ میں یا کسی کیبن کے اندر۔کب سے ڈھونڈھ رہی ہوں"

ڈیزی نے سر کھجایا تھا۔وہ اکثر بے دردی سے سر کجھانے لگتی تھی۔عیسی نے بمشکل اس منظر سے نظر چرائی تھی۔

"ممی! کچھ ہنٹ دیں آپ کی کیا چیز گمی ہے؟"

عیسی سارے کیبن چھان کر اب بے بس نظر آرہا تھا۔ممی کی مطلوبہ چیز مل کے نہیں دے رہی تھی۔

"نجانے کہاں رکھ کے بھول بیٹھی ہوں۔" ڈیزی نے یاد نہ آنے پر سر کو جھنجھوڑا تھا جیسے سارا قصور اسی بھوسہ بھرے دماغ کا تھا

"یاد کریں۔شاید آپ کو لائٹر چاہیۓ"

"ارے نہیں تو۔" ڈیزی نے ناک چڑھائی۔۔"اففف یاد آیا۔میں اپنا ماضی ڈھونڈھ رہی تھی۔کمبخت کسی نہ کسی جگہ پہ رکھ کر بھول جاتی ہوں۔" ڈیزی کی خود کلامی پر عیسی اک پل کے لیے شاک ہوا تھا۔اس کے کیبن کھولتے ہاتھ یک دم اپنی جگہ پر فریز ہو چکے تھے

"ماضی ایک معبد ہے۔قابل بھر دسہ،ٹھوس،تبدیل نہ ہونے والا،سب سے بڑھ کر پائیدار

۔ماضی مرکزیت، ربط، اور دوام کا احساس دیتا ہے ۔میں بڑی مخلصی اور تواتر کے ساتھ ماضی سے ملاقات کرتی ہوں ۔ضرورت کے تحت نہیں ایک فریضہ سمجھ کر۔" وہ خود کلامی کرر ہی تھی ۔اور عیسی بلکل سن کھڑا تھا۔ڈیزی اپنے ماضی کو یاد کرر ہی تھی ۔اس میں عیسی کا عمر رسیدہ باپ تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا ہاں وہ اپنے بوائے فرینڈ کو ضرور یاد کرتی تھی جو اسے پے در پے دھو کے دیتا رہا تھا

اب کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔سارا دن گھر سے باہر گزار آتے ہو۔جانے امریکہ سے یہاں لینے کیا آئے ہو"

" مجھے لگتا ہے میں آپکے بال بنانے آیا ہوں۔آپ رکیئے۔میں آپ کے بالوں کو برش نہ کردوں؟"

عیسی اسے مسلسل بال کھجاتے دیکھ کر بددل ہو رہا تھا

" رہنے دو تم۔ذرا Tesco سے کچھ بسکٹس انڈے اور پیسٹریاں پکڑ لاؤ۔یاد سے کم کریم والی چھوٹی پیسٹری لانا۔بڑی اور پھینٹی ہوئی کریم سے بھری پیسٹری مجھے پسند نہیں ہے" .

عیسی کو لگا وہ الجھے بالوں کو سلجھانا نہیں چاہتیں۔اور اب اسے منظر سے ہٹا رہی ہیں۔

وہ بنا دیکھے بھی جانتا تھا کہ فریج کے اندر مطلوبہ سامان موجود ہے۔

" آپ بال بنوالیں تو ہم دونوں مل کر tesco جاتے ہیں"

اس نے ممی کو بہلاتے ہوئے کہا تھا

" نہیں نہیں۔میرا tesco میں کیا کام ہے میں گھر میں ہی ٹھیک ہوں۔تم مجھے کافی بنا کے دے سکتے ہو"؟

عیسی نے برش اور ہیئر بینڈ کسی دراز سے نکالا۔میلا کچیلا سا تھا۔

اس نے سوچا کہ اب مال جائے گا تو ممی کے لیے کچھ اچھے کلپ اور بینڈ ضرور لے کر آئے گا

"عیسی !رک جاؤ۔تم کو یہ تکلف نہیں کرنا چاہیئے"۔

تکلف کیسا ممی!" وہ حیران ہوا

"اس سے پہلے بھی میں آپ کے بال بنا چکا ہوں"۔اس نے کچھ یاد دلایا تھا

"ہاں زبردستی"۔ ممی کا سارا زور "زبردستی" پر تھا

"ایسا ہی کہ لیں"

"عیسی ! مجھے نہیں ضرورت"۔ اب کہ ڈیزی جھلائی تھی

"رکو رکو عیسی ! تم ایسا کرو سلسبیل جاؤ۔۔ یہاں سے کچھ ہی دور ہے۔ سرخ سڑک کے پار اک دوکان ہوگی۔ وہاں ایک بھاری عورت ہوگی سوجی ٹانگوں والی۔ ابھری موٹی رگوں والی۔ وہ وہاں کی سب سے اچھی بیکر ہے اس سے میرے لیے پنیر لے آؤ۔ اس کی چیز اور خالص پنیر بہت مشہور ہے "ڈیزی کسی بھی طرح عیسی کا دھیان بٹانا چاہتی تھی۔ مگر عیسی سب سمجھتا تھا سو اپنے کام میں لگا رہا۔ ڈیزی جھلاتی تھی۔

"بال کھینچ کر اکھاڑ دو تم ایک ہی دفعہ۔۔ بلکہ استرا چلوا دو۔ خالی کھیتی میں کچھ بھی نہیں اگے گا۔"

" آپ کو کسی دن ہیئر ڈریسر کے پاس لے کر جاؤں گا"اس نے بالوں کو اچھے سے بینڈ میں جکڑ کر اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

" دماغ ہی خراب ہے میرا۔ جو تم سے کہ دیا"۔۔

" کیا کہ دیا"۔ عیسی حیران ہوا

"یہی کہ تم اس بیکر سے میرے لیے پنیر لا دو۔"۔

"میں لے آؤں گا ممی"۔ اس نے فرمانبرداری سے کہا تھا

"اب میں آپ کے لیے کافی بناتا ہوں۔"

'' بھاڑ میں جائے کافی۔۔ اب نہیں پینے والی۔۔ تم اپنے سر میں انڈیل لو۔ بدتمیز لڑکا۔ نافرمان۔ سارا دن گھر سے باہر اللوں میں گزار آتا ہے۔ رات کو اسے پاگل ماں یاد آ جاتی ہے۔"ڈیزی تڑخ تڑخ کر بول رہی تھی۔ اپنے سمٹے بال دیکھ کر اور بھی غصہ آ رہا تھا

"سارا دن نہیں ساری رات۔۔۔ آجکل نائٹ شفٹ پے ہوں۔"اس نے ہاتھ دھوتے ہوئے تصیح کی تھی۔

"ہنہ جانے کیا کرتے پھر رہے ہو کوئی کام تو ہے نہیں۔۔ ہاؤس لیڈی آئی تھی۔تم نے اس ماہ ہاؤس رینٹ بھی نہیں دیا"۔ڈیزی کو نجانے کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔

" کون سی ہاؤس لیڈی؟ کون سا رینٹ؟ ممی دس ہزار دفعہ تو بتا چکا ہوں یہ آپ کا اپنا گھر ہے کیوں بھول جاتی ہیں۔"عیسیٰ عجیب دکھ میں گھر گیا تھا۔کثرت شراب نوشی اور خود ساختہ غموں میں لتھڑ کر اس کی ماں نے اپنی ذہنی حالت قابل رحم کر لی تھی۔

"اچھا تو یہ میرا گھر ہے۔پھر میں اس کا کرایہ کیوں دیتی ہوں؟" ڈیزی شدید حیرت میں مبتلا گئی تھی۔یہ حیرت عیسیٰ کے کرب میں اضافہ کرتی جا رہی تھی۔۔پھر یہ کوئی نئی بات تو تھی ہی نہیں۔

☆......☆......☆

سرخ سڑک کے پار چھوٹی سی دوکان لذیذ لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔اس دوکان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں تمام کھانے کے لوازمات سو فیصد تازہ اور صاف ستھرے دستیاب تھے۔بیکر ایک بوڑھی عورت تھی۔جو دن بھر جانوروں کے باڑے سے لے کر دوکان تک تمام معاملات کی نگرانی کرتی تھی۔اسے اپنی اکلوتی پوتی سلسبیل سے بڑی محبت تھی۔آج بھی جب وہ بیکری پے آخری باقیات اپنے پوتے اور پوتی کے لیے اکھٹی کر رہی تھی جب اس دوکان کا آخری گاہک آیا۔شکل صورت سے کیا ہی دل کش نوجوان تھا۔بہت ہی پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔دادی کو بڑا ہی پسند آیا۔جب اس نے آخری پنیر اٹھایا تو دادی سے رہا نہ گیا۔

"یہ اس دوکان کا آخری پنیر ہے۔اب پنیر کل ملے گا۔"

"کیا میں اس پنیر کو خرید سکتا ہوں؟"۔

خوش پوش نوجوان نے نرمی سے استفسار کیا۔

"ضرور خرید سکتے تھے اچھے لڑکے! مگر اب سے کچھ دیر پہلے تک۔اب دوکان بند کرنے کا وقت ہے۔اور آخری پنیر مجھے اپنی پوتی کے لیے لے کر جانا ہوتا ہے۔ورنہ وہ اسکول میں بھوکی رہے گی"

بوڑھی بیکر نے نرمی سے وجہ بتائی تو نوجوان سوچ میں پڑ گیا تھا۔

" آپ کی بیکری کا پنیر میری ماں کو بہت پسند ہے۔ وہ بہت مایوس ہوگی"۔

"اچھے لڑکے! یہ پنیر تم کو کل سویرے مل سکتا ہے"۔ بیکر نے بڑی محبت سے کہا۔ وہ گاہک کو خالی بھیجنے پہ خوش نہیں تھی۔

"ہمم۔" جوان سوچ میں گم ہوگیا

بیکر کا دل پسیج گیا۔ وہ ایک لڑکے کے اپنی ماں کے واسطے

" گڈ نائٹ دادی!"

سلسبیل کمفرٹ میں غروب ہوتے ہوئے آہستگی سے بولی تھی۔ دادی اسے پیار کرتے ہوئے بتی بجھا کر باہر نکل گئی۔

لاؤنج سے گزرتے ہوئے بہو پر نظر پڑی۔ جو زیر لب کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

"ہوگئیں خوشامدیں۔" ممی تلملا رہی تھی۔ دادی نے توجہ ہی نہ دی۔ بلکہ گیم کھیلتے ڈینی سے کہا۔

"اب تم سوسکتے ہو گھڑی ایک بجا رہی ہے"

ڈینی نے وڈیو پلئیر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

"میں ابھی سونا نہیں چاہتا۔"

"تمہاری مرضی کون پوچھ رہا ہے"؟۔

دادی کی سخت آواز پے ڈینی وڈیو پلئیر پھینک کر سلی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ہمیشہ سلی کے ساتھ سونے کا عادی تھا۔

روسی بدمزہ ہو رہا تھا۔ دونوں بچے سونے چلے گئے تھے۔ اپنی بہن سے اس کی بنتی نہیں تھی۔ اور اس کی ساس اسے پسند نہیں کرتی تھی۔

روسی دیر تک جاگتا رہا تھا۔ اس لیے اس کی آنکھ جلدی نہیں کھل سکی۔ اسے افسوس ہوا تھا جب وہ گیسٹ روم سے بدمزہ ہو کر نکلا سامنے ہی اس کی سڑی بہن بیٹھی تھی۔۔

جو حسب معمول بچوں پر چلا رہی تھی۔

ڈینی ناشتہ نہیں کر رہا تھا۔روسی کی بہن اسے زبردستی ٹھنسوانے کی کوشش کر رہی تھی۔

" کچھ مت کھانا۔سونگھنا بھی مت۔لوگ ٹھونس ٹھونس کر پیٹ غبارے کی طرح پھلا رہے ہیں۔تمہارے حلق سے کچھ بھی نہیں اترتا۔"

ممی چلا رہی تھی۔روسی نے محسوس کیا۔سلی بڑی تکلیف میں تھی۔۔شاید شرمندگی کے احساس کے ساتھ جو وہ روسی کے سامنے محسوس کر رہی تھی۔غیر ارادتاً اس نے اپنے پیٹ پہ ہاتھ پھیر کر کچھ ٹٹولا تھا۔۔وہاں کوئی اضافی چربی نہیں تھی۔۔پھر ممی نے ایسا کیوں کہا۔۔۔؟

سلی کا دل جلتا رہا۔

روسی اس کی کیفیات سمجھ سکتا تھا مگر اپنی بہن کے سامنے وہ بچی کو تسلی دینے سے قاصر تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ ضبط سے سرخ آنکھیں لیے بیگ اٹھا کر اسکول کے لیے نکل گئی۔تب روسی نے ایک ملامت بھری نظر سے اپنی بہن کو دیکھا۔

"میرا خیال ہے تم کو اپنے الفاظ پے غور کرنا چاہیئے یہ کسی بھی انسان کی عزت نفس کو متاثر کر سکتے ہیں"۔

روسی کی بہن نے اسے کاٹ دار نظر سے دیکھا اور بولی۔

"مجھے خواہ مخواہ کتابی سبق مت پڑھاؤ جس عورت کا سارا دن جانوروں کے گوبر اٹھانے چارہ کاٹنے نہلانے دھلانے میں گزرتا ہو اس کے ذہن میں گوبر کی بو تو رچ سکتی ہے اچھے خیالات کا آنا مشکل ہے۔۔"

وہ جلتی کسلتی میز صاف کرتی رہی۔

'پہلے باپ کی بھیڑیں پالتے آدھی عمر گزر گئی اور اب شوہر کے بچے اور جانور پالتے۔"

روسی کان لپیٹ کر سنتا رہا۔اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔اس کی بہن کو اپنی محرومیوں کا دورہ پڑ چکا تھا۔

"تم جیسا ٹٹ پونجیا اور نکما بھائی ہو تو بہنیں خوار ہی ہوتی ہیں۔"

"میرا بزنس بھی ہوتا تو تمہارے حالات نہیں بدل سکتے تھے۔اس لیے کہ تم اپنی سوچ بدلنا نہیں چاہتی"۔

"مجھے لیکچر دینے کی ضرورت نہیں" وہ بھنائی۔

"نکلو یہاں سے اور میری کچھ مدد کرواؤ۔۔میں چارہ کاٹنے جا رہی ہوں۔۔"

"بہتر ہے میں کچن میں برتن دھو دیتا ہوں۔"

روسی نے متبادل حل دیا۔۔جانور اسے پسند نہیں تھے۔اور ان کی بو۔نجاست اور فضلات۔

"تو وہ نکمی لڑکی گھر میں آ کر کیا کرے گی۔"؟اس نے آگ بگولا ہو کر کہا تھا روسی کو اٹھنے میں ہی عافیت محسوس ہوئی تھی۔

دو گھنٹے باڑے میں گزار کر روسی کی بری حالت تھی۔۔پھر بھی وہ بھاگم بھاگ گھر آ کے کپڑے تبدیل کرتا رہا۔۔منہ دھویا۔سینٹ بھی لگایا اور تھیلا اٹھا کر بھاگا چلا آیا۔اسے سلی کے اسکول آتے آتے آدھا گھنٹہ لگ گیا تھا۔۔اب وہ باہر بینچ بیٹھ کر سلی کا انتظار کر سکتا تھا۔

اسے سلی اچھی لگتی تھی۔معصوم نادان کم گو فرشتہ سی۔اسے اپنی بہن بہت ظالم نظر آتی۔سنڈریلا کی ماں جیسی

اے خاموش سمفنی کے خدا!

بادلوں کے پروں کی سرسراہٹیں

صرف مجھے ہی کیوں سنائی دیتی ہیں

بچے اپنے اپنے کمروں میں سکون کی نیند سو رہے ہیں

اور باہر بارش

کوئی نئی دُھن ترکیب دینے میں مصروف ہے

دروازے اندر سے بند ہیں

اور کھڑکیاں ٹیرس کی طرف منہ بند کیے ہوئے بیٹھی ہیں

اور میں ٹیبل لیمپ کی محدود روشنی میں سوچ رہا ہوں
کہ کچھ کتابیں پڑھے بغیر ختم کیوں ہو جاتی ہیں
اور جو شب گزار
صبح کا سورج
اور شام کا ستارہ نہیں بن سکتے
وہ کہاں طلوع ہوتے ہیں؟
وہ کہاں طلوع ہوتے ہیں؟ نجانے کہاں؟

قسط نمبر 4

صبح کا سورج

اور شام کا ستارہ نہیں بن سکتے

وہ کہاں طلوع ہوتے ہیں؟

وہ کہاں طلوع ہوتے ہیں؟ نجانے کہاں؟

شافیہ گہری سوچوں میں گم تھی۔

جی جی بیرسٹر صاحب کے کمرے کی صفائی کروا رہی تھیں۔ ملازموں کے چلنے پھرنے سامان گھسیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

شافیہ کا دل بھرا ہوا اداس تھا دل پہ آج کل عجیب بوجھ سوار تھے۔ کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا تھا

"شافیہ!" معا جی جی کی آواز سنائی دی تھی۔ شاید بہت قریب سے ہی...

:"اتنی چپ کیوں ہوں؟" جی جی نے نرمی سے پوچھا تھا۔ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں تھی۔ جی جی بنا کچھ پوچھے بھی سمجھ سکتی تھیں۔ شافیہ کو کبھی کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔

"جب دل بھر جائے تو رو لینا چاہیئے"۔

وہ نرمی سے بول رہی تھیں

" گو کہ رو لینا مسلے کا حل نہیں ہوتا۔"

''جی جی! ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جب ہم کسی کے ساتھ کچھ برا نہیں کرتے۔"

اس کا شکوہ بجا تھا جی جی نے گہرا سانس لیا۔

اِنسان کو کوئی چیز اِتنا نہیں بدلتی۔۔۔

جتنا اُس کے دل پہ گُزری ہوئی تکلیفیں اُسے بدل دیتی ہیں، اور تکلیفیں بھی وہ جو اُس نے تنہا جھیلی ہوتی ہیں" وہ دھیرے سے بول رہی تھیں

شافیہ کی آنکھوں میں سرخی اتر رہی تھی۔

"صبر کا کوئی پیمانہ ہے؟"

"صبر پیمانوں سے کہاں ماپا جاسکتا ہے؟ صبر عمل سے ثابت کیا جاتا ہے میری بیٹی"۔ جی جی اس کے احساسات سمجھ رہی تھیں۔

"اس دنیا میں ایک ہی آپ کا رشتہ ہو اور وہ ہی اپنا نہ ہو"۔

وہ بہت ٹوٹ رہی تھی۔ بہادر لڑکی تھی مگر اب ٹوٹ رہی تھی۔

اسے حوصلے کی ضرورت تھی اور حوصلہ جی جی سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا تھا؟

"اس دنیا میں کسی کے پاس ایک بھی رشتہ نہیں ہوتا اور وہ پھر بھی جیتے ہیں"۔

جی جی ہلکے سے مسکرائی تھیں۔شافیہ چونک گئی تھی

:"جی جی آپ کو کس کا انتظار ہے؟"

جی جی اس کے سوال پر حیران رہ گئی تھیں۔

"میں سمجھی نہیں ہوں بیٹی!؟"

" آپ کو کس کا انتظار ہے؟"۔

اس نے دوبارہ پوچھا تھا۔

" کیا واقعی میں ہشام آجائے گا؟"۔

آج شافیہ بڑے عجیب سوال پوچھ رہی تھی۔ جی جی کا منہ اتر سا گیا۔ آنکھ کے گوشے نم ہونے لگے تھے۔

"وہ کیوں نہیں آئے گا۔ میں اس کی ماں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"پتہ نہیں جی جی! میرے دل کو وہمہ سا لگا ہے۔"

شافیہ کو دکھ ہوا کہ اس نے سونے سے قلب کی عورت کو پریشان کر دیا۔

"امید زندگی ہے شافی! جس دن امید ٹوٹ گئی تو زندگی باقی نہیں رہے گی۔"

وہ سمجھ رہی تھیں کہ شافیہ کیا کہنا چاہتی ہے؟ ان کو پتہ تھا کہ شافیہ ان کی امید ٹوٹنے سے ڈر رہی ہے۔

"تم سناؤ سمیرا کا رویہ کیسا ہے؟"

"کیسا ہونا ہے؟"۔ اس نے آہ بھری تھی

"یہ اسود والا ڈرامہ مجھے بھی سمجھ نہیں آ رہا؟۔"

جی جی کو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"جی جی! آپ کو کیا لگتا ہے۔ اسود کا رشتہ وہ مجھ جیسی مسکین کے ساتھ کریں گی؟ بس میرے بابا کو جال میں پھنسانا مقصود ہے۔"

شافیہ تلخ ہو رہی تھی

"یہ تو میں سمجھ رہی ہوں۔"

جی جی کا انداز پر سوچ تھا[:"جی جی! آپ میرا ساتھ دیں گی؟"۔

شافیہ نے کچھ سوچ کر منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"میں تمہارا ساتھ کیوں نہیں دوں گی؟ تم کیا چاہتی ہو بیٹی!"۔ انہوں نے شفقت سے پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں آپ میرے بابا سے بات کریں ایسے یک طرفہ رشتے کیسے طے ہو سکتے ہیں؟"

وہ بہت ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ اس کو یقین تھا کہ سمیرا اور فرح کسی سازش کے تحت اس کی زندگی سے کھیلنا چاہتی ہیں۔ اسے سمیرا کچھ دنوں سے بہت ہی پراسرار لگ رہی تھی۔

"میں بات کروں گی اسے بلا کر کیا تم کو اسود پسند نہیں؟"

جی جی نے کچھ متفکر انداز میں پوچھا تھا "بات پسند یا ناپسند کی نہیں ہے جی جی! پسند تو بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں۔ کیا ہم ان کو حاصل کر سکتے ہیں؟ یا ان کے حصول سے ہمیں خوشی مل سکتی ہے!؟"

شافیہ آج اپنی عمر سے بھی بڑی باتیں کر رہی تھی: "میری بیٹی! اللہ ہمارے گمان کے ساتھ ہے۔ تم اچھا گمان رکھو تو اچھا ہی ہوگا انشاء اللہ۔"

انہوں نے اسے ہمیشہ کی طرح سمجھایا تھا۔

شافیہ نے سر ہلا دیا۔ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتی تھی ۔

جب وہ گھر آئی تو سمیرا اس پر تپی بیٹھی تھی۔

اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئی۔

"سلامی دے آئی ہو۔ کوئی شرم حیا ہے۔ کچن ویسا ہی پھیلا پڑا ہے۔ کام والی چھٹی پے۔ اور تم سپاٹوں پر نکلی ہو۔" سمیرا اچھی بھلی بدلحاظ ہو جایا کرتی تھی۔

"جی جی سے ملنے گئی تھی۔ اتنی دیر تو نہیں ہوئی۔" شافیہ جلدی سے کچن میں چلی گئی تھی۔

"اور کتنی دیر ہوگی تمہارا باپ آ کے مجھے ہی بولے گا۔"

سمیرا نے سخت برا مان کر کہا تھا

"میرے باپ کی یہ مجال؟ آپ سے کچھ کہہ دیں؟ نہ کریں ماما۔"!

شافیہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی تھی۔ اسے تو اپنی زندگی کی کہانی میں سب سے چپ چاپ کردار اپنے والد کا ہی لگتا تھا۔ وہ تو ضرورتاً بھی نہیں بولتے تھے۔

"اب کس بات پے دندیاں نکال رہی ہو۔"

سمیرا کے کان بہت پتلے تھے۔

" کچھ بھی نہیں ماما!"۔

وہ بمشکل ہنسی روک کر بولی تھی۔

" آپ کے لیے چائے بنا دوں؟"۔

"ہاں بنا لو۔ پہلے ذرا میرے پاؤں پے مساج تو کر دو۔ رات سے درد ہو رہا ہے۔"

سمیرا نے آواز میں نقاہت بھر کے کہا تھا۔

شافیہ نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ پھر باہر نکل کر تیل کی بوتل اٹھا لائی۔

سمیرا صوفے پر لیٹی تھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اے شافیہ! کچھ پتہ ہے تمہیں غوثیہ باجی نے اپنا پچھلے والا پورشن کرائے پہ دے دیا؟۔"

سمیرا کو اچانک کچھ خیال آیا تو متجسس ہوگئی تھی۔

شافیہ نے سر ہلایا۔

"چار لڑکے ہیں اور ایک ان کی بڑی پیاری سی بہن ہے۔ سونے جیسی۔ ارے کیا بھلا سا نام ہے۔"

"سنہرے۔"

شافیہ نے اس کی مشکل آسان کی تھی

"ہاں۔ بڑی پیاری بچی ہے۔ اور اس کے چار سجیلے بھائی۔ ماشاءاللہ ایک جیسے نکلتے قد ہیں اور بڑے ہی نیک بچے لگتے ہیں۔ تمہارے بابا واک پے گے تھے تو بڑی ہی تعریف کر رہے تھے۔"

سمیرا کرائے دار لڑکوں پے لٹو ہوئی لگتی تھی شافیہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ سمیرا کا اپنا ہی دماغ تھا

"پر ہمارے اسود کا تو کوئی بھی مقابلہ نہیں ہے۔"

سمیرا کو خیال آیا کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہی کرائے داروں کی تعریف کر رہی ہے۔

"ویسے بجی غوثیہ کا بیٹا شاہ ویز بھی بڑا خوب صورت ہے۔ پر تھوڑا مغرور اور بگڑا سا لگتا ہے۔ اگر ذرا سدھر جائے تو وہ بھی کسی سے کم نہیں۔ پھر دولت مند بھی ہے۔ بڑے مربعے ہیں ان کے۔"

سمیرا کو پاؤں کا مساج کروا کے سکون آ رہا تھا۔ تبھی دماغ بھی کھل رہا تھا۔

ویسے بھی وہ بہت ہی باتونی خاتون تھی۔

"ماما! عرشیہ کدھر ہے؟"۔

شافیہ نے فضول باتوں سے بیزار ہو کر پوچھا تھا۔ سمیرا نہ جانے کب تک شاہ ویز میں گم رہتی۔ سارے محلے کی اس کو خبر اور فکر رہتی تھی۔

"اپنی خالہ کی طرف گئی ہے۔ آتی ہی ہوگی۔" وہ ذرا بیزار ہوئی تھی۔

"تم بتاؤ کیا پکا رہی ہو"۔؟

کوفتہ پلاؤ اور ساتھ قیمہ بناؤں گی۔"

شافیہ نے اپنا مینیو بتایا تھا۔

"اچھا یوں کرو۔ ذرا زیادہ بنا لینا۔ غوثیہ باجی اور وہ سنہرے کے گھر بھی دے آنا۔ ذرا خیر سگالی کے ساتھ۔"

آج تو سمیرا بڑی مہربان لگ رہی تھیں۔

"خدا خیر کرے۔" شافیہ نے سوچا تھا۔

"جی بہتر۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا: اب وہ سوچ رہی تھی کہ جلدی سے کھانا بنا کر سنہرے کے گھر جاتی ہے۔ ابھی اسے ٹیسٹ کی بھی تیاری کرنی تھی اگر عرشیہ آ جاتی تو اس کے سوال ہی ختم نہیں ہونے تھے۔

وہ قیمہ چڑھا کر کوفتے فریزر سے نکال ہی رہی تھی جب فون کی گھنٹی بجی تھی۔

اس نے کوفت سے بجتے ہوئے فون کو دیکھا تھا۔

"اب یہ کون ہے؟"۔

شافیہ کا سخت موڈ آف ہوا۔

گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

"اللہ جانے ماما کہاں چلی گئی ہیں؟"۔ اس نے کوفت سے فون کا ریسیور اٹھا کر سوچا تھا۔

"جی کون؟۔"

شافیہ نے بادل نخواستہ کہا۔

"فرشتہ۔" کوئی اس سے بھی زیادہ بیزار تھا۔

"رحمت کا۔" شافیہ کے منہ سے اچانک نکلا تھا۔

"نہیں زحمت کا۔ اور آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ ہمارا بجلی کا بل برائے مہربانی عنایت کر

دیں۔ جس پر آپ سانپ بن کر بیٹھی ہیں۔"

دوسری طرف سے جلی کٹی آواز سنائی دی تھی۔

"میں۔" شافیہ کا منہ کھل گیا تھا۔

"مگر میں کیوں سانپ بنوں گی؟"۔

"دیکھیں میڈم! میں لڑکیوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ آپ گفتگو کو طول مت دیں۔"

دوسری طرف کی بات سن کر شافیہ نے "لاحول" پڑھا۔

"میں کیوں گفتگو کو طول دوں گی۔ آپ ہیں کون؟ غلطی سے فون ملا دیا ہے کیا۔"

"میں سٹھیا نہیں گیا۔ بقائمی ہوش وحواس میں کال ملائی ہے۔ یہ سمیرا آنٹی کا ہی گھر ہے نا؟"۔

دوسری طرف سے تصدیق چاہی گئی تھی۔

"جی ہاں اور آپ کون؟"

شافیہ ذرا سنبھل گئی تھی۔ کیا پتہ کوئی جاننے والا ہو۔

"میں آپ کا پڑوسی داؤد ہوں۔ خداداد کا بھائی۔ وہ ہی خوب صورت خداداد جو ملٹری پولیس میں ہیں۔"

اس قدر جامع تعارف کے بعد تو شافیہ ایک دم سٹپٹا گئی تھی۔

اس کو سچ مچ پسینہ آگیا تھا۔

"اچھا اچھا آپ سنہرے کے بھائی ہیں؟"

"اجی نہیں۔ سنہرے میری بہن ہے۔" دوسری طرف سے تصیح کی گئی تھی۔

"بل کا تو بتا دیں۔" دوسری طرف جھلاہٹ عروج پے تھی۔

"جی غوثیہ آنٹی کا بل ہمارے گھر ہی پڑا ہے۔"

شافیہ نے اسٹینڈ سے بل دیکھ کر بتایا تھا۔ بابا کو دینا یاد ہی نہیں رہا تھا۔

"تو پھر بھجوایا کیوں نہیں۔" فون والا تپ کے رہ گیا تھا۔

"اس قدر غیر ذمہ داری کا ثبوت؟"۔

شافیہ نے لاکھ کہا کہ یاد نہیں رہا۔ مگر وہ سنے تو

:" ویسے ہمسائیوں کے یہ حقوق نہیں ہوتے۔ ایک تو آپ نے ہمیں پوچھا تک نہیں۔ دوسرا بل پے بھی قبضہ جما لیا۔ تا کہ ہمارا میٹر کٹ کٹا جائے۔"

داؤد کی زبان کے سامنے تو خندق تھی۔

" جی آپ کو بھی ہمسائیوں سے تمیز سے ہی پیش آنا چاہیے"۔ شافیہ نے بس اتنا ہی کہا تھا اور فون بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ دروازے میں کھڑا تھا۔ بہت ہی شرارتی سا لڑکا تھا۔

" اچھا تو آپ شافیہ ہیں۔ خاکسار کو داؤد کہتے ہیں۔ میں خدادا کا بھائی ہوں۔"

بہت شائستگی سے کہا گیا تھا۔

سمیرا نے اس کی آواز سن لی تھی۔ لپک کر باہر آ گئی۔

" اندر آ جاؤ بیٹا۔"

انہوں نے شافیہ کو اشارہ کیا کہ چائے پانی لے آؤ۔

شافیہ اس اخلاقی کاروائی پے بے ہوش ہونے لگی تھی۔

وہ چائے کے لیے نہیں رک رہا تھا مگر سمیرا اسے اٹھنے نہیں دے رہی تھی۔

" آنٹی میں پھر آؤں گا۔ اور کوئی کام ہوا تو بتایئے گا۔"

اس نے سر تسلیم خم کیا تھا

" مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں۔"

وہ بھی سمیرا کی محبت سے متاثر ہو گیا تھا۔

اور سمیرا تو ہر کام کے لڑکے سے محبت سے پیش آتی تھی۔ کہ کہیں کسی بھانجی بھتیجی کو نتھی کر سکے

" بڑے ہی بھلے ماں باپ کی اولاد ہو۔"

"بس خدا ان کو جنت مکین کرے۔"" شرارتی لڑکا سنجیدہ ہو گیا تھا

" وہ حیات نہیں ہیں کیا؟"۔

سمیرا بھی افسردہ ہوئی

"نہیں جی۔ ہمیں تو خدا دانے ہی پالا ہے۔ ہمارا بھائی ہی سب کچھ ہے ہمارے لیے۔"

اس نے نم آنکھوں سے بتایا تھا

"اچھا کسی دن اپنی بہن کو لے کے آنا۔"

"جی ضرور۔" وہ تابعداری سے کہتا ہوا اٹھ گیا تھا۔

تب سمیرا کے دل میں کرائے داروں کی اور بھی ہڑک بیدار ہوئی تھی۔

جب شافیہ نے ٹرے سجائی تو خود بھی ساتھ ہی نک سک سے تیار ہو کر چل دی تھی۔

تب پہلی مرتبہ شافیہ سنہرے سے ملی تھی۔ بڑی کوئی سنہری سنہری دھوپ جیسی تھی۔ ساری کی ساری سونے میں ڈھلی ہوئی۔ چھوٹی سی لڑکی تھی جس نے شافیہ کی طرح سارا ہی گھر سنبھال رکھا تھا۔

اور بڑی ہی ذمہ داری لگتی تھی۔

سمیرا تو اس پر فدا ہی ہو گئی تھی

"لڑکیاں ہوں تو سنہرے جیسی۔ کیسے پھرتیلی ہے۔ منٹوں میں چائے بنا لائی۔ اور ایک ہماری شافیہ ہے۔ کچن میں گھسے تو نکلتی ہی نہیں۔" سمیرا کے ہر جگہ اپنے ہی دکھڑے ہوتے تھے۔ سنہرے بس معصومیت سے مسکراتی ہی رہی تھی۔

بھلا ایسے تبصرے کا کیا جواب دیتی؟

جس میں ذرا بھی مروت نہیں تھی۔

سمیرا بھی کرید کرید کر سوال پوچھ رہی تھی

"تم بس پانچ بہن بھائی ہو؟ باقی رشتے دار کدھر ہیں؟۔"

"وہ سب تو گاؤں ہیں۔ ہم بھائی کی جاب اور پڑھائی کی وجہ سے ادھر ہیں۔" سنہرے نے سادگی سے کہا

"۔اچھا تو گاؤں سے ہو۔"

"جی ہمارا تعلق گاؤں سے ہے۔امی ابو کی وفات کے بعد ہم۔شہر آئے تھے۔"

سنہرے آزردہ ہوگئی تھی۔شافیہ کو دکھ ہوا۔سمیرا بھی کریدنے کے چکر میں کسی کے احساسات کا خیال نہیں رکھتی تھی۔

سمیرا نے بڑا جی لگا کر خداداد کے بارے میں پوچھا تھا۔

کیا کرتا ہے؟ کیا مصروفیت ہے؟ کیا عادات ہیں۔سنہرے بچی بھی تھی اور کچھ اتنی تیز طرار بھی نہیں لگتی تھی سو وہ سادگی میں بتاتی رہی تھی۔

سنہرے نے سارا گھر سنبھال رکھا تھا۔وہ اپنے کچن سے لے کر باقی روزرہ کے کام سب کچھ خود کرتی تھی۔ساتھ پڑھتی بھی تھی۔

اب سمیرا کا دل تھا اگر شافیہ نہ ہوتی تو وہ سنہرے کو شافیہ کے پھوہڑپن کے خود سے جوڑے قصے سنا دیتی مگر اس وقت دل مسوس کر رہ گئی تھی۔

اسی پل داؤد بھی آ گیا تھا۔اور وہ تو ویسے بھی بڑا خوش اخلاق تھا۔اس کے آتے ہی سنہرے اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔

داؤد تو سمیرا کا فیورٹ تھا۔

وہ سمیرا کو لمبی لمبی کہانیاں سناتا تھا جسے سن کر وہ سچ سمجھ لیتی تھی۔

"ویسے آنٹی! آپ آنٹی لگتی نہیں ہیں۔"

اس تعریف پر تو سمیرا کھل کر گلاب ہوگئی تھی۔شافیہ کو ہنسی آ گئی۔داؤد ہر بندے کے مزاج سے مطابقت رکھتی بات کرتا تھا۔

سمیرا نے دلچسپی سے پوچھا۔

"خدادا کا بھی تمہارے جیسا مزاج ہے؟"۔

"اے کہاں آنٹی جان! وہ تو کوئی کڑوا کریلا ہیں۔بس نہ ہی پوچھیں۔"

"کیا سخت مزاج ہے؟"۔سمیرا کا دل ڈوب گیا تھا۔

"ایسا ویسا۔" داؤد نے آہ بھری تھی۔

"سانس خشک کیسے رکھتا ہے ایسا خشکی خورا بھائی ہے ہمارا"

سمیرا کا منہ ہی اتر گیا۔

"بھلا عرشیہ ایسے سخت مزاج انسان کے ساتھ رہ سکتی ہے؟"۔

اس کا دل ہی ڈوب گیا۔

"بس کچھ نہ پوچھیں۔ کیسے ہم گزارا کر رہے ہیں۔" داؤد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"بہت ظالم ہے کیا۔"

"ظالم؟"۔ داؤد چیخ پڑا تھا۔

"ظالم لفظ تو بہت چھوٹا ہے۔ وہ بہت دہشت ناک ہیں۔"

اس نے ماحول اور بھی خوف ناک کیا تھا سمیرا کی تمام امیدیں ٹوٹ چکی تھیں

"تم کیا کرتے ہو داؤد۔"؟

سمیرا نے ذرا سنبھل کر موضوع کو بدلا تھا۔

"یہ بس یہی کرتے ہیں جو ابھی کر رہے ہیں۔" کوئی اپنے ہی دھیان میں زیر لب بولتا ہوا اندر آیا تھا۔ اجنبی چہرے دیکھ کر ذرا سا ٹھٹھکا اور پھر سلام کر کے اندر چلا گیا تھا۔

"یہ۔" سمیرا کی حیران آنکھیں پھیل رہی تھیں

"یہ وہ ہی ہیں جن کی برائیاں کی جا رہی تھیں۔"

سنہرے پر تکلف چائے کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی۔

سمیرا کا منہ ہی کھل گیا تھا۔

"یہ خداداد بھائی ہیں۔"

"ارے ماشااللہ۔"

سمیرا نے بے ساختہ کہا تھا۔ وہ اسے کہیں بھی دہشت ناک نہیں لگ رہا تھا

"داود بھائی کی تو عادت ہے۔"

وہ مسکرا کر چائے بناتی رہی۔ وہ پانچوں بہن بھائی بہت ملنسار اور ہنس مکھ تھے۔

جب وہ چائے پینے کے بعد باہر آئیں تو غوثیہ اپنے لان میں موجود تھیں زبردستی ان کو اندر لے آئیں۔ شافیہ غوثیہ کے گھر کبھی نہیں آئی تھی۔ کالونی کا سب سے شاندار گھر تو ان کا تھا۔ ایسا نقشہ اور ایسی بھول بھلیاں جو سمجھ سے باہر تھیں۔ وہ انہیں لیونگ روم میں لے آئی تھیں۔

بہت ہی شاندار گھر تھا اس سے زیادہ شاندار تو غوثیہ آنٹی تھیں۔ دودھ سی سفید اور ملائم سی۔ نجانے کیوں سمیرا ان سے میل جول سے کتراتی کیوں تھی۔ شاید طبقاتی فرق کی وجہ تھی یا کچھ اور بات تھی۔

غوثیہ نے کہا

"شافیہ بیٹے! جاؤ۔ کچن میں ملازم ہوگا۔ اسے کہو۔ کافی لے آئے۔"

سمیرا کے منع کرنے کے باوجود بھی غوثیہ نے شافیہ کو بھیج دیا تھا۔

اسی کالونی میں رہتے ہوئے وہ پہلی مرتبہ ان کے گھر آئی تھی۔ کیا ہی عالیشان گھر تھا اور کیا نفیس انٹیریئر تھا۔ شافیہ دل ہی دل میں بڑا مرعوب ہوئی تھی۔

وسیع کچن میں ایسی صفائی تھی جیسے کبھی کوئی کچن میں آیا ہی نہ ہو۔ یا کسی کا یہاں سے گزر ہی نہ ہوا ہو۔ شافیہ ذرا گھبرا گئی تھی۔ واپس مڑنے لگی تو کسی اور راہداری میں نکل آئی۔ ایک تو بہت ساری راہداریاں تھیں سمجھ ہی نہیں آرہی تھی۔ شافیہ کی رنگت سفید پڑ گئی کہ اچانک انتہائی قیمتی پرفیوم کی خوشبو چکرانے لگی تھی کوئی تیزی سے سیڑھیاں اترتا نیچے آیا تھا۔ شافیہ نے گھبرا کر کوریڈور کی دیوار سے لگ کر جیسے رستہ دیا۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا رک گیا تھا۔

" کون ہو تم۔"؟

شاید وہ اسے کوئی مشکوک لڑکی سمجھ رہا تھا

" کون ہو تم۔" اب کہ اس نے سختی سے پوچھا تھا۔ شافیہ کی زبان گنگ ہوگئی۔ اس نے شاہ ویز کو

بہت مرتبہ دیکھ رکھا تھا۔لیکن شاہ ویز کے لیے تو وہ اجنبی ہی تھی۔ جیسے آجکل کے حالات تھے وہ اسے چورنی سمجھ رہا تھا۔

"بول کیوں نہیں رہی؟ گونگی ہو گیا؟"۔اب کہ وہ سخت ہوا تھا

" کون ہو تم؟ چوری کرنے آئی ہو۔" وہ غصے میں بھڑ کا تھا

کیا وہ شکل سے چور لگ رہی تھی؟

شافیہ کو گہرا صدمہ ہوا۔

"میں کیا بھونک رہا ہوں؟ سنتی نہیں ہو؟ بہری ہو گیا؟"۔وہ یک دم دہاڑا تو شافیہ کی بے ساختہ چیخ نکل گئی تھی۔

وہ رونے لگی ۔اسے روتا دیکھ کر وہ بھی چپ کر گیا تھا۔شاید اسے رونے والے ردعمل کی توقع نہیں تھی۔

"روتی کیوں ہو؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔" وہ فکر مند ہو گیا تھا۔

"چپ تو کرو۔"اب کہ وہ زچ ہوا۔

"نہیں پوچھتا کون ہو تم یہ بتا دو کہاں سے آئی ہو؟ پیسے نہیں کیا۔؟ پیسے دوں؟"

ایسا ہی سخی تھا شاہ ویز۔اور ایسا ہی مزاج تھا اس کا پل میں تولہ ہو جاتا تھا۔پل میں ماشہ ہو جاتا تھا۔

"بولتی کیوں نہیں ہو،"۔اب وہ عاجزی سے بولا تھا۔

تب تک شافیہ بھی اس اچانک افتاد پے سنبھل گئی تھی۔

"میں کچھ چرانے نہیں آئی۔"

اس نے کمزور آواز میں کہا۔

"میں یہ سامنے والے گھر سے آئی ہوں۔سمیرا کی بیٹی ہوں۔میرے بابا۔"

"ارے اچھا اچھا! بس ٹھیک ہے۔اپنا شجرہ مت سناؤ۔تم جی جی کی بیٹی ہو۔"

شاہ ویز نے جلدی سے کہا تھا

"اے خوب صورت ہرنی! تم میرے گھر مہمان آئی ہو۔ چلو وہاں لیونگ روم میں بیٹھو۔ میں تمہارے لیے کافی لاتا ہوں۔" وہ ایک دم بہت ہی اچھا مہمان نواز بن گیا تھا۔

"میری ماما بھی ساتھ ہیں۔"

شافیہ سخت حواس باختہ ہی رہی تھی

"تو کیا ہوا۔ ان کے لیے بھی لاتا ہوں۔"

وہ مسکرا کر ایک گہری نگاہ سے بولا تھا۔

شافیہ بوکھلا کر پلٹنے لگی تو اس نے آواز دے کر روکا۔

"میں ہر ایک کے لیے کافی نہیں بناتا۔ یاد رکھنا۔" اور پھر وہ نجانے کہاں گم ہوا تھا. شافیہ جلدی سے لیونگ روم کی طرف آ گی تھی اسے دیکھ کر سمیرا نے خفگی سے کہا۔

"کہاں رہ گئی تھی تم۔"

"مجھے کچن کا نہیں پتہ چل رہا تھا۔"

وہ خفت زدہ سی بولی تھی۔

"او بیٹا! میں خود کہتی ہوں۔" غوثیہ اسے حواس باختہ دیکھ کر بولی تھیں۔

تبھی وہ اندر آ گیا تھا۔

"ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا یہ تابعدار بیٹا کس لیے ہے۔"

شاہ ویز آج اپنی ماں کو حیران کیے دے رہا تھا۔

جیسا کہ ان کے تاثرات کہہ رہے تھے۔

"تم اور تابعدار۔"

"ماما! میں بہت فرمانبردار ہوں نا؟"۔

اب وہ آنکھ دبا کر پوچھ رہا تھا۔

"اس میں کوئی شک ہے۔ مگر تم کلب جا رہے تھے نا۔" غوثیہ نے اس کی ڈریسنگ کے حساب

سے کہا۔ وہ گیم کے لیے جا رہا تھا۔ جی مگر آپ کے خاص مہمان دیکھ کر رک گیا۔ ملازم تو چلا گیا ہے۔"

اس نے اپنے شلیف کا نام لیا تھا جس کا نام بھی ملازم ہی تھا۔

"خاص مہمان۔" غوثیہ کو کھانسی آنے لگی تھی۔ اس نے تو کبھی اہم سے اہم مہمان کی ایسی تکریم نہیں کی تھی۔ اور یہاں وہ پڑوسیوں کے لیے کافی بنا لایا تھا۔

"یہ مسز۔"

"جی جی مجھے پتہ ہے۔ یہ سمیرا آنٹی ہیں۔ ہمارے بلاک میں رہتے ہیں۔"

شاہ ویز نے سارا ہی اخلاق نچھاور کرتے ہوئے کہا تھا۔

"مگر آپ پہلے کبھی نہیں آئے۔" وہ آرام سے بیٹھ گیا تھا۔ سمیرا کا تفصیل سے انٹرویو کرنے۔ اور سچ میں سمیرا پہلی مرتبہ گھبرائی تھی۔ یہ کوئی عام لڑکا نہیں تھا۔ کچھ خاص مقناطیس تھا اس میں۔ یا کچھ بہت ہی خاص جو سمیرا کو غلط ہونے کا اشارہ دے رہا تھا۔ اسے لگا کہ یہاں آنے کا فیصلہ کچھ بہتر نہیں تھا۔

"گو کہ وہ اپنی ماں جیسا بلا کا خوب صورت تھا۔ خاص طور پر اس کی چمکتی کالی آنکھیں اور بے انتہا سیاہ ریشمی بال۔ اور جو ہونٹ کے قریب ہی تل تھا۔ وہ بلا کا وجیہہ تھا۔ سمیرا کو ماننا پڑا۔

اس کے ارد گرد کیسے ہیرے بکھرے تھے۔ اور وہ ایک عیسی کی آس لگا کر بیٹھی تھی۔

اسے اپنی سوچ پہ بھی افسوس ہی ہوا تھا۔

"آنٹی! آپ کیا کرتی ہیں؟"۔

"بیٹا! گھر کے کام کاج۔ ہاؤس وائف کا کیا کام ہو سکتا ہے۔"

سمیرا نے بڑا نپا تلا جواب دیا تھا۔ شافیہ کو سو فیصد یقین تھا کہ اب وہ سوالوں کا رخ اس کی طرف موڑے گا اور ایسا ہی ہوا۔ اس کی چھٹی حس کچھ کہہ رہی تھی۔

"تم کیا کرتی ہو؟"۔

وہ اپنی کم گو ماں سے سراسر مختلف تھا۔

"میں پڑھتی ہوں۔" شافیہ کو بتانا پڑا۔

"اور"؟

اب اور میں وہ کیا بتاتی ؟

" کیا مشاغل ہیں؟" انٹرویو شروع ہو گیا تھا۔

"بس گھر کے کام۔"

اس نے رک رک کر بتایا تھا۔ وہ کنفیوز سی سمیرا کو دیکھ رہی تھی۔

"اور جی جی کے گھر آنا جانا۔ وہ کدھر گیا؟"۔ شاہ ویز کے کہنے پر شافیہ کے ساتھ ساتھ سمیرا بھی دھک سے رہ گئی تھی۔

شاہ ویز کو کیسے پتہ چلا۔ وہ تو گلی کی نکڑوں میں کھڑا ہونے والا لڑکا نہیں تھا۔ غوثیہ کو اس قدر بے تکلفی آکورڈ لگ رہی تھی مگر وہ ایسا ہی منہ پھٹ تھا۔

"شاہ ویز! دیر ہو رہی ہے۔ تمہارے دوست انتظار کر رہے ہوں گے۔"

غوثیہ نے دبے دبے لہجے میں احساس دلاتے ہوئے کہا تھا۔

"Its ok Mama"۔

وہ بلکل اٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ غوثیہ جز بز ہو رہی تھیں۔

تب ہی شافیہ نے کہا

"ماما! گھر چلیں۔"

سمیرا بھی جیسے انتظار میں تھی۔ فوراً اٹھ گئی۔

شاہ ویز کو جیسے ان کا اچانک جانا بھایا نہیں تھا۔ مگر روکنا کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

ان دونوں کے چلے جانے کے بعد غوثیہ نے شاہ ویز کو بغور دیکھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"۔

" کیوں؟ آپ کو کیسا لگ رہا ہوں۔"؟ اس نے الٹا سوال کیا

" کم سے کم بہتر نہیں لگ رہے۔"

"دماغ کھسکا ہوا ہے شاید اس لیے۔" وہ مسکرایا تھا۔ ماں کے طنز اسے اچھے سے سمجھ آتے تھے۔

"کچھ زیادہ ہی۔"

"اگنور کر دیں۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتا کھڑا ہوا تھا۔ کافی بدمزہ لگ رہی تھی۔

"کر تو سکتی ہوں۔" انہوں نے ناقابل فہم انداز میں کہا

"مگر تمہاری ماں ہوں تم کو اچھے سے جانتی ہوں۔"

غوثیہ گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتی بولی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا نکل گیا تھا

وہ دونوں جب گھر پہنچی تھیں تو عرشیہ پہلے سے ہی موجود تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر بولی۔

"کہاں نکل گئی تھیں آپ دونوں؟ حد ہوتی ہے ویسے۔ بابا بھی پوچھ رہے تھے۔"

"ہم ذرا پڑوس میں گے تھے۔" سمیرا ضرورت سے زیادہ ہی سنجیدہ تھی۔ اسے رہ رہ کے شاہ ویز کی کالی چمکتی آنکھوں میں تیرتی عجیب سی دلچسپی کا خیال آ رہا تھا

ایک تو یہ شافیہ بھی نا۔ ہر مرد کی نگاہ میں آ جاتی تھی۔

ایک عرشیہ تھی جس میں کوئی ایک گُر نہیں تھا۔

"کہاں پے۔ کس کے گھر کا دورہ کیا؟"۔

وہ خفگی سے پوچھنے لگی۔

"سنہرے سے ملنے گے تھے پھر غوثیہ باجی نے روک لیا۔"

"مجھے اتنی بھوک لگی ہے۔ خود تو کھا پی آئیں ہو گے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"تو اٹھ کر کچن سے کھا لیتی۔ کھانا تو بنا کر گئی تھی شافیہ۔"

سمیرا نے ناگواری سے جتایا۔ ایک تو اس کی ہڈحرامی سے وہ بہت تنگ تھی۔ مجال تھی جو ہل کر پانی بھی پی لیتی۔

"خالہ نے کچھ نہیں کھلایا؟"۔

"وہ بھی آپ ہی کی بہن ہیں" عرشیہ کے طنز پر سمیرا خفت زدہ رہ گئی تھی شافیہ کے سامنے اچھی

بھلی ہوگئی تھی۔ایک عرشیہ کو ذرا تمیز نہیں تھی کہ کس کے سامنے کیا بات کہنی ہے

"فضول مت بولو۔وہ تو ہمیشہ کھانا کھلا کر بھیجتی ہیں۔"

سمیرا نے خفت مٹانے کو کہا۔ادھر عرشیہ کی ہنسی پھوٹ پڑی تھی

"رہنے دیں ماما! کس سے چھپا رہی ہیں۔؟ شافیہ کوئی غیر ہے جسے پتہ نہیں ہوگا؟ فرح خالہ کا بس چلے تو مہمان سے کہیں اپنا ٹفن بنا کر ساتھ لے آنا۔"

"بکواس مت کرو۔" سمیرا نے اسے گھور گھور کے مزید گل افشانی سے روکا تھا

"اٹھ کے کھانا کھا لو۔بھوک تمہارے دماغ کو چڑھی ہوئی ہے۔"

عرشیہ شافیہ کو آنکھ مار کے ٹیبل کی طرف چلی گئی تھی جہاں پہ شافیہ نے کھانا لگا دیا تھا۔وہ جانے لگی تو اس نے روک لیا۔

"بیٹھ جاؤ بہن! کبھی میرے پاس بھی۔"

اس کا انداز شکوہ کناں تھا۔شافیہ کچھ سوچ کر بیٹھ گئی تھی۔

"اب بتاؤ۔اس ہیرو کے گھر گئی تھی کیا؟"

اس نے رازداری سے پوچھا تھا

"تم کو کیسے پتہ؟"۔

شافیہ نے حیرت سے پوچھا

"اس کا تو پورے ٹاؤن کو پتہ ہے۔"

عرشیہ نے اس کی لاعلمی پہ تف بھیجی۔

"اچھا مجھے تو خبر نہیں تھی۔" وہ سادگی سے بولی

"تم کو تو اپنی بھی خبر نہیں ہوتی۔" عرشیہ نے ماتھا پیٹا۔

"تو پھر ملاقات ہوئی؟"۔اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"ہاں تو۔وہ کافی بنا لایا تھا۔" شافیہ نے سادگی میں بم پھوڑا تھا۔

"کیا سچ میں؟"۔ "عرشیہ کی چیخ نکل پڑی تھی۔

"میں جھوٹ کیوں بولوں گی۔ایسا ہی ہوا تھا۔وہ پاس بیٹھ گیا تھا۔"

شافیہ نے مزید بتایا

"پاس بیٹھ گیا تھا؟باتیں بھی کیں؟"۔

عرشیہ کی آنکھیں پھیل گئی تھیں

"ہاں پورا انٹرویو لیا تھا۔"اور عرشیہ تو جیسے بے ہوش ہونے لگی تھی

"مجھے بھی ساتھ لے جاتیں۔میں کالج میں شو آف کر لیتی۔"اسے تو جیسے بڑا ہی صدمہ ہوا تھا۔

"اس میں شو آف والی کیا بات ہے؟"۔

شافیہ کو اس کی ایکسائٹمنٹ کی سمجھ نہیں آ رہی تھی

"تم کو پتہ نہیں ہے نا اس لیے۔وہ تو پورے ٹاؤن کی لڑکیوں کا ہارٹ ٹاپک ہے۔"

اس نے حسرت سے بتایا تھا

"اللہ جانے کیوں۔"شافیہ نے کندھے اچکائے۔

"میرا خیال ہے اسے کوئی اتنا پسند نہیں کرتا ہوگا۔جیسا کہ شریف لوگ۔"

"بہت بڑے جاگیردار کا بیٹا ہے۔اس کا اپنا بزنس ہے۔اور اس کو کمانے کی بھی نہیں ضرورت۔"

وہ اپنی عمر کی کریزی لڑکیوں جیسا بتا رہی تھی۔جن کو ہر چمکتی چیز بھاتی ہے۔

"وہ ایلیٹ کلاس کا نمائندہ ہے۔جیسا کہ وہ ایک عیاش لڑکا ہے۔"

"یہ امیر لوگوں کا اسٹیٹس سمبل ہوتا ہے۔"عرشیہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا

☆......☆......☆

سنا ہے جہاں برف پڑتی ہے

اس گاؤں کی کچی گلیوں میں

سر شام اندھیرے اتر آتے ہیں

ہم برف سے کوئی راستہ نکالیں گے
من کے جگنو جلالیں گے

میرے پیروں میں پڑی یہ سبز پگڈنڈیاں
اک برف پوش چوٹی کو جاتی ہیں
جہاں سورج بھی دھوپ سینکنے کو آتا ہے
ہم وہیں اپنا مکان بنالیں گے
اور من کے جگنو جلالیں گے

ابھی راستے کٹھن، اور منزلیں سراب ہیں
ابھی میری راہوں میں جانے کتنے صحرا، کتنے جنگل آباد ہیں
ہم انہی جنگلوں کو دوست بنالیں گے
اور من کے جگنو جلالیں گے

اس گاؤں میں میرا پرانا کچا سکول ہے
جس کی دیواروں پر آج بھی نام لکھا ہے
چلو اک بار پھر
برف سے ان سبھی تختیوں کو دھوڈالیں گے
اور سکول سے پرے ڈھلتی شام میں
ہم من کے جگنو جلالیں گے

اور سنو، اگر کبھی تم دوبارہ یہاں سے گزرو

تو راستے سے کچھ خواب لے آنا

پھر ہم اپنے بستوں سے

اک نئی تعبیر نکالیں گے

اور سب مل کر

من کے جگنو جلالیں گے

اس نے کھڑکی سے باہر اجلی برف کو دیکھا۔ یہ بے موسم کی برف باری بڑی عجیب لگ رہی تھی ۔مگر یورپ میں یہ عام چیز ہے۔ برف گرنا برف اٹھانا برف میں رستے بنانا یہ بہت عام بات تھی

لوگ اپنے اپنے گھروں کے سامنے سے برف ہٹا رہے تھے

یہ البانیہ سے ہجرت کر کے مغربی جرمنی میں آباد ہوا البانوی مسلمان خاندان ایک صدی سے یہاں آباد تھا۔کھیتی باڑی اور دودھ پنیر کا ان کا یہ کاروبار بہت چلتا تھا۔انہوں نے کبھی بھی بڑے شہروں جیسا کہ فرینکفرٹ 'وائن ہائم' برلن کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔ان کی زندگی اس چھوٹے سے قصبے سے شروع ہو کر یہاں پر ہی ختم ہوتی تھی۔اس سے آگے کتنے جہاں تھے؟

کتنی منزلیں تھیں؟ کتنے رستے تھے؟

کچھ خبر نہیں تھی

سلسبیل اس چھوٹے سے دیہات میں اپنے دادا دادی کی محبت کے ساتھ رہتی تھی۔ ڈوڈو اس کا کتا تھا۔ڈینی اس کا بھائی تھا اور ڈی سوزا دوست تھی۔ان سب سے اسے محبت تھی۔

اپنے مختصر خاندان کے ساتھ سلسبیل بے انتہا خوش تھی۔

اس پر سکون زندگی میں اکثر کنکر تب گرا کرتا تھا جب بروز و نانا کا چکر لگتا یا روسی انکل بے دھڑک منہ اٹھا کر آ جاتے تھے۔یہ دونوں ہی افراد اس کی دادی اور دادا کو سخت ناپسند تھے مگر می کی وجہ سے ان کو زہر کا گھونٹ بھرنا پڑتا تھا۔

اسکول سے واپسی پر جب سلسبیل روسی انکل کی وی چاکلیٹ ڈی سوزا سے شئیر کر رہی تھی تب اس نے سلسبیل سے کہا تھا

"تمہارے روسی انکل اچھے انسان ہیں۔"

"پتہ نہیں۔ دادی کو برے لگتے ہیں۔" سلسبیل نے کندھے اچکائے تھے

"آنٹی کے رشتے داران کو اچھے کیسے لگ سکتے ہیں۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔"

ڈی سوزا نے کہا

"میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتی۔"

اس نے چاکلیٹ ختم کی تھی

"ہمارے لیے سب رشتے محترم ہونے چاہیے۔"

"یہ نہیں کہہ سکتے کہ کون زیادہ اچھا ہے۔ روسی انکل کو زیادہ ناپسند کیا جاتا ہے بروزو کی نسبت۔ بروزو بہتر ہے مگر کسی حد تک۔ جبکہ میری دادی کہتی ہیں یہ دونوں تمہارے کچھ بھی نہیں لگتے۔"

وہ سادگی سے بتا رہی تھی۔ اس کی دادی دور اندیش تھی۔

وہ بیکری والے رستے سے گھر جاتی تھیں ہر روز دادی سے مل کر جاتی اور واپسی پر بھی سلام کر کے آتی۔ یہ برسوں سے معمول تھا۔

جب وہ دونوں بیکری پے آئیں دادی پنیر بیچ بیچ کر تھک چکی تھی

سلسبیل کو ترس آیا تھا۔ اس نے بستہ رکھ کر دادی سے کہا۔

"اب میں کاؤنٹر پر کھڑی ہوتی ہوں۔ آپ گودام میں ذرا ستا لیں۔"

سلی نے ڈی سوزا سے معذرت کی تھی

"تم کو اکیلے جانا ہوگا۔ میں دادی کی مدد کروں گی۔"

"اوکے بیسٹ آف لک۔" وہ مسکرا کر چلی گئی تھی۔ دادی آج واقعی ہی تھکی پڑی تھی۔ تبھی تو بن کہے گودام میں چلی گئیں۔

سلسبیل نے پنیر کا تھال دیکھا۔ وہاں گنتی کا سامان موجود تھا۔ اس نے وقت کا تخمینہ لگایا۔

"۔اگر تین سے چار گاہک آ جائیں تو ہم جلدی دوکان بند کر سکتے ہیں ۔"اس نے لمبی سی جمائی روک کر سوچا تھا۔تبھی وہ چلا آیا۔ڈھلانوں سے اترتا ہوا۔

ایسے لگ رہا تھا کوئی سورج افق کے پار سے اتر رہا ہو۔

سلسبیل تو جیسے مسمرائز ہوگئی تھی۔

"ارے کوئی ایسا شاندار بھی ہوتا ہے؟"۔

وہ بے نیازی سے چلتا ہوا قریب آیا

"ہیلو سویٹ گرل؟ کیا میں غلط مقام پے آ گیا؟"۔

نہیں جناب! آپ مناسب جگہ پے ہیں۔"وہ دوکانداری والی مسکان سجا کر بولی۔

"تو پھر بوڑھی بوارین کہاں؟ جس کا پنیر پورے صوبہ بواریا میں مشہور ہے۔"؟

اس نے حیرت سے پوچھا تھا

"وہ میری اوما (دادی) ہیں ۔اس وقت آرام کر رہی ہیں۔بتایے تو میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔"؟

اس نے پروفیشنل انداز میں پوچھا تھا

"آپ مجھے پنیر دے سکتی ہیں اچھی لڑکی!"۔

اس نے صاف ستھرے تازہ پنیر کو باکس میں سجے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں سر۔"

وہ پھرتی سے پیکنگ کرنے لگی۔

تبھی دادی نے بھی باہر ذرا سا جھانکا تھا۔باتوں کی آواز نے ان کو بے آرام کیا تھا یا ان کی نیند ہی ایسی تھی۔وہ نیند میں بھی چکنا رہنے والی عورت تھی۔

ڈاکٹر عیسیٰ!"دادی کے چہرے پر شفقت پھیل رہی تھی دوسری طرف بھی پہچان کا یہی حال تھا

"کیسی ہیں آپ؟ مجھے آپ کی کمی محسوس ہوئی۔"وہ گہرے مراسم سے کہہ رہا تھا۔

دادی بھی عام گاہکوں سے ہٹ کر اسے محبت سے جواب دے رہی تھیں۔حال احوال پوچھ رہی تھیں۔

"تم اتنے دن سے کیوں نہیں آ ئے ۔"؟

"میری ممی بیمار تھیں ۔"

اس نے اداسی سے بتایا۔دادی نے ایسی نظر سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو

" کیاڈاکٹر بھی بیمار ہوتے ہیں؟"۔

"ڈاکٹر کے گھر والے تو کیا ڈاکٹر خود بھی بیمار ہوتے ہیں ۔" وہ مسکرا کر بتا رہا تھا۔دونوں ایسے بات کرر ہے تھے۔جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں

:"تم کبھی کبھی آجایا کرو۔مجھے انتظار رہتا ہے۔"بوڑھی بوارین نے شفقت سے کہا۔

وہ بے انتہا مصروفیت کے باوجود حامی بھر چکا تھا۔

سلسبیل اسے دیکھتی رہ گئی تھی ۔اس نے اپنی پوری زندگی میں ایسا شائستہ آدمی نہیں دیکھا تھا ۔اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ مرد اتنے دھیمے اور شائستہ بھی ہوتے ہیں۔

وہ جیسے مسمرائز تھی ۔کوئی پھونکی ہوئی پتھر شدہ مورت ۔وہ کسی چلتے ہوئے سرسبز منظر کی طرح آگے بڑھ چکا تھا۔اور سلسبیل کسی بے جان روح کو طرح عمر بھر کے لیے ٹھہر گئی تھی۔

وہ اس کے انتظار میں رک گئی تھی

وہ اس کے احساس میں کھو گئی تھی

اس دن سلسبیل بواریا کے اس خوب صورت دیہات میں گم ہو گئی تھی۔

اسے لگتا تھا وہ دھیرے دھیرے اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتا ہے۔

اسکول سے آتے اور جاتے ہوئے۔ڈوڈو کو سیر کرواتے ہوئے ۔وہ اس کے کانوں میں کہتا ہو

تمھیں محبت سکھاتا ہوں یہاں بیٹھو!!

کچھ غزلیں سناتا ہوں یہاں بیٹھو!!

اچھا!!! کیا کہا؟ وہ چاند پسند ہے تم کو؟!!

اچھا! اتار کر لاتا ہوں یہاں بیٹھو!!

اچھا! تو ڈر کیوں رہی ہو، میں ہوں نہ!!

اچھا! سینے سے لگاتا ہوں یہاں بیٹھو!

اس کو چلتے منظر اچھے لگنے لگے تھے۔ اور برفیلے راستے۔ روشن آسمان۔ گہری خاموشی۔ رواں پانی اور سرخ جگنو۔ بھیگے سنگیت۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟

اس نے ڈی سوزا سے پوچھ لیا۔

"کہ وہ بدل رہی ہے۔"

اس تبدیلی کا راز کیا ہے؟

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

کون چپکے چپکے اس کی تنہائیوں میں مخل ہو رہا ہے؟

ڈی سوزا پہلے حیرت سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ناقابل فہم لہجے میں کہا

"وہی جو گوئٹے کو شارلوت سے ہوا تھا۔"

"مگر کیا۔" وہ روانسی تھی

"جیسا کہ پیار۔"

ڈی سوزا نے دریا کو کوزے میں بند کیا۔

"کیا مجھ کو محبت ہو گئی ہے"؟ اس نے خوف زدہ ہو کر خود سے سوال کیا تھا

اور پھر جیسے خود سے بھی ڈر گئی تھی

رات اس نے کھڑکی کھول کر آسمان کو دیکھا تھا۔

اسے لگا آسمان ستاروں سے بھر گیا ہے

اپنے گھر کی کھڑکی سے میں آسمان کو دیکھوں گا
جس پر تیرا نام لکھا ہے اس تارے کو ڈھونڈوں گا
تم بھی ہر شب دیا جلا کر پلکوں کی دہلیز پہ رکھنا
میں بھی روز اک خواب تمہارے شہر کی جانب بھیجوں گا

ہجر کے دریا میں تم پڑھنا لہروں کی تحریریں بھی
پانی کی ہر سطر پہ میں کچھ دل کی باتیں لکھوں گا
جس تنہا سے پیڑ کے نیچے ہم بارش میں بھیگے تھے
تم بھی اس کو چھو کے گزرنا میں بھی اس سے لپٹوں گا
خواب مسافر لمحوں کے ہیں ساتھ کہاں تک جائیں گے
تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے میں بھی اب کچھ سوچوں گا
بادل اوڑھ کے گزروں گا میں تیرے گھر کے آنگن سے
قوس قزح کے سب رنگوں میں تجھ کو بھیگا دیکھوں گا
بے موسم بارش کی صورت دیر تلک اور دور تلک
تیرے دیار حسن پہ میں بھی کن من کن من برسوں گا
شرم سے دہرا ہو جائے گا کان پڑا وہ بندا بھی
باد صبا کے لہجے میں اک بات میں ایسی پوچھوں گا
صفحہ صفحہ ایک کتاب حسن سی کھلتی جائے گی
اور اسی کی لے میں پھر میں تم کو ازبر کر لوں گا
وقت کے اک کنکر نے جس کو عکسوں میں تقسیم کیا
آب رواں میں کیسے امجد اب وہ چہرہ جوڑوں گا

❁ ❁

قسط نمبر 5

ایک دن ڈی سوزا نے سلی سے کہا

" کیا یہ اچھا نا ہوگا کہ ہم لوگ شراب نگر گھوم کر آئیں۔ شراب نگر سے مراد جیسا کہ وائن ہائم۔ یہ ایک خوب صورت پہاڑی شہر تھا۔ ایک ایسا شہر جس پر نظر پڑتے ہی آپ کو احساس ہو سکتا ہے کہ یہ شہر تو کسی رومانوی ناول کی سیٹنگ کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ اس میں چلتے پھرتے لوگ زندگی کے حقیقی کردار نہیں لگتے۔

وہ کسی بھی دیہاتی انسان کی انسپریشن ہو سکتا تھا۔ اپ نے ایسی بلندی پر چڑھتی اور بلندی سے اترتی خوب صورت سرمئی سڑکیں نہیں دیکھی ہوں گی پہاڑی کی الگ الگ سطحوں پر ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہوئے ڈھلواں چھتوں والے مکان جو دور سے یوں لگتے ہیں جیسے پیار سے گڑیا گھر جنہیں کسی غیبی ہاتھ نے پہاڑی کی اونچی نیچی سطح پر سجا کر رکھ دیا ہو۔ اور اس کی ساری آبادی کے پس منظر میں بادلوں تک اٹھتی ہوئی سبز پوش پہاڑی اور دور اس کی چوٹی پر واقع ایک چھوٹا سا قدیم قلعہ جو دیویوں کے مسکن کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟

مجھے لگتا ہے کسی جرمن ناول نگار نے اپنی کہانی کے پس منظر کو وائن ہائم میں ضرور کہیں رکھا ہوگا۔

وہ کہانی عشقیہ کہانی ہوگی

وہ کسی رومان کے بارے میں ضرور ہوگی؟

ڈی سوزا کو وہ سب ضرور جاننا تھا۔ وہ رومان جو اس شہر میں بسا ہوا تھا۔ اور اس کے محبت کرنے والے جوڑے کو روزانہ تنہائی میں ملنے کے لیے یہاں محفوظ جگہوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اس لیے وائن

ہائم میں ہر طرف موتر ے اور آلیش اور شاہ بلوط جے درختوں کی آڑ ہے۔ اور اس کے گرد نواح میں صنوبر کے گھنے جنگلات کا تاریک سایہ ہے جہاں دن کو بھی تاروں کی سی چھاؤں رہتی تھی ۔ یہاں بیٹھ کر پہروں چشم رقیب سے دور قدرت کی اس فیاضانہ پردہ پوشی سے مستفید ہو سکتے ہو

:" آج کل تم بہت زیادہ رومانوی ناول پڑھ رہی ہو؟"۔

سلی نے بڑے تعجب کا اظہار کیا۔

یہ دو البانوی شہزادیاں اپنے حسن آتش سے بے نیاز جیسے من کی مستی میں جی رہی تھیں

ڈی سوزا بہت زیادہ زندہ دل تھی ۔ مگر اسکے ساتھ وہ کتابوں عشقیہ شاعری اور محبت کے قصوں کی بڑی شوقین تھی اسے محبت کے قصے کہانیاں اور نانیوں اور دادیوں سے سننا بہت زیادہ پسند تھا۔

رنگ بھرے بادل فرانسو ساگاں

فرانسو ساگاں ایک فرانسیسی ادیبہ ہیں۔ وہ میٹرک کے امتحان میں فیل ہوئیں اور لکھنے لکھانے کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں ہی اپنا پہلا ناول لکھ ڈالا۔ اس کے بعد انھوں نے متعدد کامیاب ناول لکھے اور ناول نگار کی حیثیت سے بے پناہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔

فرانسو ساگاں پینے پلانے، جوئے اور تیز رفتار ڈرائیونگ کی شوقین تھیں۔ ایک خوفناک حادثے کے بعد تیز رفتار ڈرائیونگ کا شوق تو اعتدال پر آگیا تاہم دوسرے شوق بدستور جاری رہے۔ فرانسو نے دو شادیاں کیں جو طلاق پر ختم ہوئیں۔

رنگ بھرے بادل فرانسو ساگاں کے خوبصورت ناول Wonderful Clouds کا ترجمہ ہے جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ ڈی سوزا آج کل اسی کو پڑھ رہی تھی اور کہیں کہیں فرانسکو ساگا جیسی آزادی اور خود مختاری کی قائل تھی جو کہ ان دو چھوٹی لڑکیوں کی زندگی میں تو ناممکن ہی تھا

وہ جرمن جیسے ملک میں رہتے ہوئے بڑے ہی دقیانوسی خاندان کا حصہ تھیں جہاں روایات اقدار اور مذھب کو خوب اہمیت حاصل تھی: وہ تاریخ اور رومان کی دلدادہ تھی۔

اور سلی کو لگتا تھا وہ رومان کے ساتھ ساتھ ذہنی اور شخصی آزادی کی قائل تھی اس لیے وہ اپنے پرانے کتب خانے میں قدیم آزادی سے جڑی کتابیں رکھتی تھی ۔اور بہت ہی پرانی کتابیں پڑھنے کی شوقین تھی پھر جب تک سلی کو اس پڑھی ہوئی کتاب کا متن پورا پڑھ کر سنا نہ دیتی اس کی روح شانت نہیں ہو سکتی تھی

بوار یہ کے پرانے مگر صاف ستھرے چائے خانے میں اپنی ذاتی جیب سے دو کپ چائے کے خرید کر وہ بینچ پر بیٹھی اس قدیم کتاب کا ذکر کر رہی تھیں جہاں کہیں نہ کہیں فریڈم کی جنگ تھی

جہاں آزادی کے لیے جدو جہد تھی

ہاں مشکلات سے لڑا جانا سکھایا جاتا تھا وہ ایسی آزادی کی ہی قائل تھی

"ناول 1984 " ' ایک قدیم ناول ہے

میں تم کو اس کی روح سمجھا دوں گی ۔کیا ہی خوب ہوتا کہ تم اسے خود پڑھتی ۔

جارج آرویل 25 جون 1903 میں بنگال کے شیر موتی ہاری میں پیدا ہوا اس کی پیدائش کے بعد اس کا خاندان انگلستان منتقل ہو گیا۔"

وہ ایک سانس میں بول سکتی تھی اس بات سے قطع نظر کہ کوئی اسے سن پا رہا تھا یا نہیں۔

سلی کی زیرو دلچسپی کے باوجود وہ بے تکان بول سکتی تھی

1922" سے 1927 تک جارج آرویل نے برما میں پولیس میں ملازمت کی ۔انیس سو ستائیس میں واپس انگلستان آیا اور ملازمت چھوڑ کر سپین چلا گیا جہاں سے اس نے کتابیں لکھنا شروع کی ۔

انیس سو چھتیس میں سپین میں جارج آرویل پر قاتلانہ حملہ ہوا جس میں اسے ایک گولی لگی اور اس کے باعث وہ دوسری جنگ عظیم میں شرکت نہ کر سکا۔اس کے بعد وہ سپین سے واپس انگلستا . . .

:"میرا خیال ہے آپ کے ساتھی کو تاریخ میں ذرا بھر دلچسپی نہیں ۔"

وہ جو کوئی بھی تھا اس ساکت منظر میں بہترین ہلچل محسوس ہوا تھا وہ اپنی چائے لے کر ساتھ والے بینچ پے بیٹھ چکا تھا

اور سلسبیل کو لگا تھا وہ جرمن کے اس قدیم چائے خانے میں بیٹھے بیٹھے ہی گزر چکی ہے ۔"

ہشام عیسی۔"

سلی کے لب کھلے اور سختی سے جڑ گے

"میں نے ایک کہاوت سن رکھی ہے۔آپ جنہیں چاہتے ہیں انھیں پھولوں اور چاکلیٹ کی جگہ کتابوں کے تحفے دیں اِس سے نسلیں پروان چڑھیں گی۔"

(ایلاڈسن)

وہ ہلکا سا مسکرایا تھا اور جیسے سارے منظر میں رنگ بھر گے تھے وہ ایک ایسا فارنر تھا جس کے اندر اس قدر مشرقیت بھری ہوئی تھی کہ اسے دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا وہ انگریز تھا جرمن تھا یا کسی مشرقی ملک کا پروردہ۔

وہ خدوخال میں فارنر اور انداز مزاج شخصیت میں بے انتہا سوبر۔

"آپ کیسی کتاب پڑھنا پسند کرتے ہیں؟ ."ڈی سوزا کی تو جیسے من کی مراد بر آئی تھی جبکہ سلی کا خیال تھا اسے اجنبی سے اس قدر بے تکلف نہیں ہونا چاہیے۔

"میں آجکل یہ کتاب پڑھ رہا ہوں۔میرا دوست پاکستان سے تحفہ لایا تھا۔"اس نے اپنے بیگ سے جو کتاب نکال کر دی تھی اسے دیکھ کر ڈی سوزا کے منہ میں پانی بھر آیا۔

کتاب کوئی سی بھی ہو ڈی سوزا کی اچھی دوست بن رہی تھی ہاں وہ نصاب سے کچھ الگ پڑھنے میں ان دنوں انٹرسٹڈ ہو رہی تھی۔

"درہ خیبر کے اس پار شہرہ آفاق مصنف کین فالیٹ کے معرکتہ الآرا ناول Lie Down With Lions کا ڈچ ترجمہ ہے۔یہ ناول مجاہدین افغانستان کی حب الوطنی الوالعزمی، وطن کے لیے شہادت کا شوق اور سرفروشی کے ان تاریخ ساز کارناموں کی تحیر آمیز داستان ہے جو کرہ ارض کی دونوں بڑی قوتوں امریکہ و روس کے علاوہ غیر وابستہ ممالک کی سیاسیات کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکی۔ڈچ ادیب نے ہی

اس ناول کو مختلف زبانوں کا جامہ پہنایا ہے اور حق تو یہ ہے کہ انہوں نے ترجمے کا حق خوب ادا

کیا ہے۔آپ اسے پڑھ سکتی ہیں۔"

اور اس آفر کے بعد غریب ڈی سوزا کی تو بس پیروں میں بیٹھ کر شکریہ ادا کرنے کی ہی کسر رہ گی تھی

:"اور آپ کیسی ہیں سلسبیل؟"

سلی کو اندازہ ہی نہیں تھا وہ اس قدر شاندار ڈاکٹر خوب صورت اور امیر اس غریب بیکر کی غریب پوتی کو یاد رکھے ہوئے ہوگا۔

تو کیا اسے سلسبیل کی شکل کے ساتھ ساتھ نام بھی یاد تھا؟ یہ سب سلسبیل کے لیے بہت ہی شاکنگ تھا۔

وہ کچھ پل کے لیے تو بول ہی نہیں سکی تھی۔"

میں اچھی ہوں۔"

اس نے تھوک نگل کر کہا

"اس میں تو کوئی شک نہیں۔" اس نے برجستہ کہا

"اور آپ کی گرینڈ مدر؟"۔

ہشام نے مزید پوچھا

"وہ بھی اچھی ہیں مگر آپ پنیر لینے نہیں آئے؟"۔

سلسبیل کی زبان سے دوبارہ کچھ پھسل گیا جس پر وہ بھی ذرا چونکا تھا تو اس کی غیر حاضری پے کسی نے نوٹس لے رکھا تھا؟

"میری ممی ایڈمٹ ہیں اس لیے۔" وہ ذرا سنجیدہ ہوا۔اور شاید افسردہ بھی

"سو سیڈ۔" ڈی سوزا کتاب سے نگاہ اٹھا کر بولی

"ان کو کیا ہوا۔" اس سوال سے بچنے کے لیے ہشام نے بات ہی بدل دی تھی

۔"میں ایک چکر ضرور لگاؤں گا۔گرینڈ مدر نے مجھے کچھ دوائیوں کا بولا تھا۔"

ڈی سوزا خوشی سے بے چین ہوگئی

"ہمیں آپ کے آنے کی بڑی خوشی ہوگی۔"

ڈاکٹر کی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔سوزی کی چائے ختم۔مگر ڈاکٹر اپنی چائے ادھ پیے ہی چھوڑ کر چلا گیا یعنی اس شام کی اس کہانی کی طرح۔

پتہ نہیں کتنے ہی سالوں سے سبزی خریدنے اور ان چرب زبان سبزی فروشوں سے بھاؤ تاؤ کرنے کی شافیہ کی ہی ذمہ داری تھی۔سمیرا کے لیے تو گھر ایک سرائے تھا۔

زیادہ وہ اپنی بہن فرح کی طرف قیام کرتی تھی یا پھر سوسائٹی کی امیر بیگمات سے راہ و رسم بنانے اور ان سے اپنے کام نکلوانے کے چکر میں پڑی رہتی تھی۔

سمیرا کو اس میں ملکہ بھی حاصل تھا

وہ چالاکی سے اپنے مطلب پورے کر لیتی تھی

شافیہ نے جیسے ہی سبزی کی ٹوکری اٹھائی اسے لگا سامنے کے بنگلے کی بالکونی میں کھڑے شاہ ویز نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی شافیہ کا دل مانو خوف زدہ ہوا

اتنا ووٹ گزر چکا تھا کالونی میں کرائے دار بھی آتے جاتے تھے مگر ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا کہ ایسی کوئی جرات کرتا دکھائی دیتا۔

پتہ نہیں کتنے ہی سالوں سے سبزی خریدنے اور ان چرب زبان سبزی فروشوں سے بھاؤ تاؤ کرنے کی شافیہ کی ہی ذمہ داری تھی۔سمیرا کے لیے تو گھر ایک سرائے تھا۔

زیادہ وہ اپنی بہن فرح کی طرف قیام کرتی تھی یا پھر سوسائٹی کی امیر بیگمات سے راہ و رسم بنانے اور ان سے اپنے کام نکلوانے کے چکر میں پڑی رہتی تھی۔

سمیرا کو اس میں ملکہ بھی حاصل تھا

وہ چالاکی سے اپنے مطلب پورے کر لیتی تھی

شافیہ نے جیسے ہی سبزی کی ٹوکری اٹھائی اسے لگا سامنے کے بنگلے کی بالکونی میں کھڑے شاہ ویز نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی شافیہ کا دل مانو خوف زدہ ہوا

اتنا وقت گزر چکا تھا کالونی میں کرائے دار بھی آتے جاتے تھے مگر ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا کہ

ایسی کوئی جرات کرتا دکھائی دیتا

اس نے غیرارادتا پھر دیکھا وہ نظر جما کر کھڑا تھا۔ایسی نظر جو ایک عورت ہو یا لڑکی بخوبی سمجھ سکتی تھی

وہ جلدی سے باسکٹ ہاتھوں میں دبا کر اندر چلی آئی تھی مگر اس کا دل جیسے قابو میں ہی نہیں تھا

خوف جیسے دل کے اندر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا۔

اور جانے کتنی ہی دیر ایسے ہی بیٹھی رہی۔اور پھر فون کی گھنٹی نے اس کے حواس کچھ بہتر کیے تھے۔

وہ پاؤں گھسیٹ کر فون اسٹینڈ کی طرف آ گئی۔

دوسری طرف جی جی تھیں

" کدھر ہوا تنے دن سے؟ کوئی خیال ہے کہ جی جی زندہ ہے یا مر گئی؟۔" وہ بہت تپی بیٹھی تھیں

اور ان کا تپنا بجا تھا۔کتنے ہی دن ہو چکے تھے وہ جی جی کو دیکھنے ہی نہیں گئی تھی۔

" آپ ٹھیک ہیں؟"۔اسے اپنی ہی آواز لرزتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"میں نے کیا خاک ٹھیک ہونا ہے۔تمہاری شکل ہی نہیں دیکھی۔" وہ بے انتہا رنجیدہ تھیں۔

"پر تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی؟ کیا ہوا ہے؟۔"انہوں نے اس کی آواز کا بدلاؤ محسوس کر لیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

اس نے جیسے جی جی سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی

"۔لگ تو نہیں رہی۔" جی جی کسی طور ماننے والی نہیں تھیں

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔"؟

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے جی جی۔" اسے اپنی ہی آواز کھوکھلی لگی تھی

۔" پھر تم جلدی سے میرے پاس آ جاؤ۔"انہوں نے محبت نما فکرمندی سے کہا تھا۔

"میں چکر لگاتی ہوں۔"

اس نے فون رکھا ہی تھا جب ایک بار بہت زور سے گھنٹی بج اٹھی تھی شافیہ کی جیسے جان ہی نکل گئی

"اب یہ کس کا فون تھا؟"۔وہ خوف زدہ نظروں سے فون کو دیکھتی رہی۔

دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر یہ سوچ کر فون اٹھا لیا کہ کہیں بابا کی کال نہ ہو

اس کے ہیلو کہتے ہی ایک اجنبی گھمبیر مردانہ آواز ابھری تھی

شافیہ اس آواز کو پہچانتی تھی

☆......☆......☆

شافیہ کا دل لمحہ بھر کے لیے رک سا گیا تھا

تو اس کی اتنی جرات؟ کہ وہ بے دھڑک کال کر دے؟

جانے اس کی سوچ میں ایسی کیا بجلی کی کوند تھی جو دوسری طرف اس نے صاف اس کی سوچ کو پڑھ لیا تھا

"یہ تو کچھ بھی نہیں۔ یہ چھوٹی سی فون کال ہے اگر تم بات نہیں کرو گی تو میں گھر بھی آ سکتا ہوں۔"

ایسی دیدہ دلیری اور زبردستی وہ جیسے جوتوں سمیت ہی آنکھوں میں گھس رہا تھا۔

"آپ کون ہیں؟"۔اس نے کپکپاتی آواز میں پوچھا

"جیسے کہ جانتی ہی نہیں ہو۔ابھی ٹیرس پہ کھڑا جسے دیکھ رہی تھی۔اور من ہی من میں خوش ہو رہی تھی۔"

دوسری طرف کی خوش فہمیوں کا کوئی انت ہی نہیں تھا

"حد ہے ویسے مبالغے کی۔کون دیکھ رہا تھا۔" شافیہ کو جارحانہ پن اپنانا پڑا۔

"میں ایسے لہجے کا عادی نہیں ہوں جان من! پر کیا ہے کہ تم پر دل آ گیا ہے تو چلو سہہ لیتا ہوں۔"

شاہ ویز کے الفاظ نے شافیہ کے تن بدن میں آگ ہی بھر دی تھی

"شرم تو نہیں آتی۔"؟

"یہ تو خواتین کا شعبہ ہے۔" وہ کوئی بلا کا ہی حاضر جواب تھا

'آپ نے یہاں فون کیوں کیا ہے؟"۔شافیہ نے سخت لہجہ اپنایا تھا وہ گمان ہی نہیں کر سکتی تھی کہ شاہ ویز ایسا ہوگا؟ مطلب اس قدر حیران کن انداز۔ وہ دیکھنے میں بے حد ڈیسینٹ لگا تھا

"۔اب کیا ہے ڈھنگ کا سوال۔" وہ جیسے امید بر آنے پر خوش ہوا تھا

"۔کب سے فضول وقت ضائع کر تھی تھی۔" وہ مسکرایا

شافیہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا رہا تھا قریب تھا کہ وہ فون ہی بند کر دیتی جب وہ بہت ہی گمبھیرتا میں بولا تھا۔

"سنو! بہت لمبی چوڑی باتیں مجھے نہیں آتیں۔ بہت سٹیٹ فارورڈ ہوں۔تم اچھی لگی ہو۔میں تم کو پسند کرتا ہوں۔اپنی لائف کے لیے۔"

اور شافیہ جیسے کھڑے کھڑے ہی فریز ہو چکی تھی

اسے لگا تھا وہ دوسرا سانس ہی نہیں لے سکے گی

☆......☆......☆

"ہماری کالونی میں سارے ہی لوگ اچھے ہیں۔" داؤد اپنی بہن کے ساتھ سبزیوں کے تھیلے بنا رہا تھا ماہ رمضان کی آمد تھی تو دونوں بہن بھائی رمضان کی تیاری میں لگے تھے

"تم درس پے گئی تھی سنہرے؟ پھر کیا باتیں ہوئی تھی وہاں؟"۔داؤد اچھی سہیلیوں کی طرح اس سے پوری تفصیل پوچھا کرتا تھا۔آج آنٹی غوثیہ کے ہاں درس کی کلاس تھی

" کیا باتیں ہونی ہیں عبادات کا کچھ بتایا نہیں۔بس درس والی باجی تو ٹی وی اور ڈراموں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی رہیں۔"

سنہرے نے مصروف انداز میں بتایا تھا

"ایسے لگ رہا تھا ان کا سارا غصہ ڈراموں پے ہی اترنے والا تھا

"اچھا کیا کہا پھر انہوں نے۔" داؤد نے دلچسپی سے پوچھا"

"باجی نے کہا۔

رمضان کریم میں عین افطاری کے بعد اور پھر تراویح کے اوقات میں لازماً ایسے ہلکے پھلکے ڈرامے لگائے جاتے ہیں جو عوام کی توجہ مکمل کھینچ سکیں اور نفلی عبادات سے دھیان غیر محسوس طریقے سے

ہٹوایا جا سکے پھر سارے فیملی ممبر ذوق وشوق سے دیکھتے بھی ہیں دادیاں نانیاں تک تسبیح پکڑ کر ٹی وی کے سامنے جم کر بیٹھ جاتی ہیں تسبیح کے دانے گراتے ہوئے ان کی کمنٹری کے الگ ہی شُشکے ہوتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ سے ان ڈراموں کی ٹائمنگ پہ بہت دکھ اور افسوس رہا ہے۔ گیم شو کے اوقات بھی یہی ہوتے ہیں۔ افطاری کے فوراً بعد سب باجماعت ہال کمروں میں جمع ہو جاتے ہیں، حیرت اس بات پہ ہے کہ کوئی بھی نہیں بولتا، کوئی منع نہیں کرتا کوئی روکتا نہیں کہ کیسی قیمتی گھڑیاں ہیں کیسا بابرکت وقت ہے کیسی مقدس ساعتیں ہیں۔ یہ شوز دانستہ بلا ناغہ لگائے جاتے ہیں۔ سب نماز تراویح کو بعد کے لیے اٹھا کر دلجمعی سے دیکھتے ہیں۔ ان ڈراموں کی اس وقت کی ریٹنگ بتاتی ہے کہ وہ کس قدر مقبول ہوتے ہیں۔۔ ایسا محسوس ہوتا ہے رمضان کریم کا مہینہ خاص اسی لیے آ رہا ہے کہ روزانہ رومانوی اور مزاحیہ ڈرامے دیکھے جا سکیں۔

پھر دوسرا کام شاپنگ کا ہوتا ہے۔"

سنہرے تفصیل بتاتے بتاتے ہانپ گئی تھی

داؤد نے کہا

"ذرا سانس لے لو۔"

"نہیں میں آپ کی بے چینی تو کم کروں۔"

سنہرے کے جتلانے پر داؤد ہلکا کھسیانا ہوا تھا

"پھر درس والی باجی نے کہا۔" جیسے ہی رمضان شروع ہوتا ہے ہماری خواتین بازاروں میں چرب زبان دوکان داروں سے تکرار کرنے چل پڑتی ہیں۔"

"ہاں تو عید کی شاپنگ بھی تو کرنی ہوتی ہے۔ اس کا کوئی اور حل نہیں بتایا باجی نے"۔؟ داؤد نے سنجیدہ بن کر پوچھا

"بتایا تو تھا کہ شاپنگ رمضان سے پہلے کر لیں اور غیر ضروری رمضان کے مہینے میں گھر سے مت نکلیں۔"

"سب نے بیزاری سے سنا ہوگا سارا درس۔" داؤد کو پورا یقین تھا

"اس میں کوئی شک ہے؟" سنہرے سبزیاں پیکٹس میں ڈال چکی تھی

داؤد اب گوشت دھو رہا تھا۔

حسان اور روحان دونوں کالج تھے

داؤد پڑھائی سے فارغ ہو چکا تھا یہ ایک بہت اچھا لکھاری اور مترجم بھی تھا۔ اور ساتھ یونی ورسٹی بھی جاتا تھا دیکھنے میں لاابالی لگنے والا یہ نوجوان ہرگز بھی لاابالی نہیں تھا۔

اس نے بے شمار کتابوں کے ترجمے کر رکھے تھے۔

" کل تو روزہ ہوگا یا پرسوں۔ تو کالونی کی کوئی خبر ہی دے دو۔"

داؤد نے سنجیدگی سے پوچھا

"سب خیر ہے۔ کیا خبر دوں۔ سمیرا آنٹی کی صحت ٹھیک نہیں۔ اور جی جی آنٹی کی بھی۔"

وہ کام سمیٹ چکی تھی

"پھر تم ہم ان کی عیادت کرنے جائیں گے۔"

داؤد نے فوراً کہا

"خدادا بھائی سے پوچھ لوں تو چلیں گے۔"

سنہرے اب اٹھ کر اپنا اسکول ورک دیکھ رہی تھی۔ ہائی اسکول میں اس کے یہ آخری دو ماہ چل رہے تھے پھر اس نے بھی کالج جانا تھا

"دیکھو تو خدادا بھائی ابھی تک نہیں آئے۔" داؤد کو فکر سی ہوئی تھی

"آجکل ان کا کام زیادہ ہے اور وہ ولنشیا بھی تو جائیں گے گھر دیکھنے کے لیے۔"

وہاں ان کا اپنا مکان زیر تعمیر تھا جو بہت ساری وجوہات کی بنا پر مکمل نہیں ہو پا رہا تھا

تب ہی خدادا اندر آتا نظر آیا تھا:

سنہرے اور داؤد مسکرا دیے

"شکر ہے آپ جلدی آ گئے۔"

دونوں نے بیک زبان کہا تھا

" کیوں؟ تم دونوں نے محلے کے راونڈ پر نکلنا ہو گا۔"

خداداد بھی تو انہی کا بھائی تھا۔

اس کی بات پر وہ دونوں ہی کھسیانی ہنسی ہنس دیے تھے۔

"اصل میں سمیرا آنٹی بیمار ہیں نا۔ اور جی جی بھی۔"

" چلے جاؤ۔ ویسے بھی تم لوگوں نے بڑی جلدی محلے میں اچھے تعلقات بنا لیے ہیں۔"۔

خداداد کچن میں جاتا دکھائی دیا

"میں چائے بنا دوں؟"۔ داؤد نے فوراً کہا

"ارے نہیں۔ کبھی مجھے بھی کچھ کر لینے دیا کرو۔" خداداد مسکرایا

"اتنا شوق ہے تو کل مشین لگا لیں۔" داؤد کی زبان پھسل پڑی تھی۔ سنہرے ہنسنے لگ گئی

"چلو تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا۔" خداداد نے فراخ دلی سے کہا

"میں نے تو مذاق کیا ہے۔" داؤد خفیف سا ہوا

" مگر میں نے اسے مذاق نہیں سمجھا۔"

خداد کے جاتے ہی سنہرے نے بھائی کو بری طرح سے گھورا تھا

"سوچ سمجھ کر نہیں بول سکتے۔"

"بول تو سکتا ہوں مگر سمجھ بعد میں آتی ہے۔" داؤد کا انداز شرارتی تھا۔ تب ہی حسان اور روحان بھی آ گئے تھے اور گھر کی نارمل فضا میں ایسی کھلبلی مچی کے غوثیہ کے سڑیل مزاج واچ مین کو آنا پڑا تھا جو کوئی خردماغ پٹھان تھا

"بہت شور کرتا ہے تم لوگ۔ بیگم صاحب کو بتاؤں گا۔"

یہ تو پہلے دن سے ہی خان چاچے نے ان کے ساتھ بیر لگا لیا تھا

کبھی کوئی شکایت لے آتا تو کبھی کوئی

"اب کیا ہوا ہے؟" داؤد نے پوچھا

"حسان گیٹ نہیں بند کر کے آتا۔ جب بھی آتا ہے کھلا چھوڑ کے آتا ہے۔"

خان کے اپنے ہی مسلے تھے

"میں اس کی حجامت کرتا ہوں چاچا! آپ پریشان نہ ہوں۔"

داؤد نے چاچے کو تسلی دی

چاچا بکتا جھکتا نکل لیا تھا تو داؤد نے حسان کو کڑی نگاہ سے گھورا تھا

"تم نا ہمیں یہاں سے نکلوا کے ہی دم لینا۔"

"بھائی کے ہوتے ہوئے تو ممکن نہیں۔" حسان نے دانت نکالے تھے

"اسی خوش فہمی میں ہی رہنا۔"

"شاہ ویز بھائی کوئی جانے دیں گے۔"؟ اس کا چین تو بنتا ہی تھا کیونکہ خدادا اور شاہ ویز جگری یار تھے۔ تبھی تو شاہ ویز انہیں زبردستی لے آیا تھا تا کہ جب تک ان کا گھر مکمل نہیں ہو جاتا وہ اطمینان سے یہاں رہ سکیں۔

"صبر جواب بھی دے سکتا ہے۔ تم ناسدھرلو اب۔ چاچا شکایت لایا تو میں نے تمہارا ابھرکس نکال دینا ہے اور اگلا ہفتہ سزا کے طور پر تم چوکیداری کرو گے۔"

داؤد کے حکم پر حسان کے بیچ میں اوسان خطا ہو گے تھے۔

اس نے دانت کچکچا کر کہا

"اب دھیان رکھوں گا۔"

☆......☆......☆

ڈی سوزا بے انتہا سینٹیولڑ کی تھی۔ بظاہر لاپرواہ نظر آتی تھی مگر حقیقت اس سے کچھ الگ تھی۔ وہ کتابوں میں نیچر سے یا پیٹس میں زیادہ دلچسپی لینے لگی تھی آجکل وہ گھر کے ماحول سے خوب کتراتی تھی

وہ ایک البانوی مرد کی کرسچن ماں سے بیٹی تھی۔ اس کا باپ مسلمان تھا جس نے بوار یا اپنی زمین لینے کے لیے اس کی ماں سے شادی کی تھی مگر پھر یہ شادی محبت کیسے بن گئی کچھ پتہ نہ چل سکا۔

بہت کم لوگ جانتے تھے کہ ڈی سوزا کی ماں اس کے باپ سے بے وفائی کر کے کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ ڈی سوزا اور سلسبیل کے حالات ایک جیسے ہی تھے۔

اس کی سوتیلی ماں ڈیڈی کی کزن تھی وہ ایک سنگ دل عورت تھی جس کے دل کو نرمی نے کہیں سے بھی نہیں چھوا تھا۔ ڈی سوزا جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی وہ گھر کے حالات سے بیزار ہو رہی تھی۔ اس کا دل کرتا تھا کہ وہ خودمختار ہو جائے مگر اس کے لیے اٹھارہ سال کا ہونا ضروری تھا وہ کسی چائے خانہ میں کام کر لے۔

وہ اتنا کما سکے کہ خود کے لیے الگ مکان کا بندوبست کر سکے

وہ اپنی باقی زندگی اس خاندان کے ساتھ نہیں جینا چاہتی تھی جو جھوٹی انا میں مبتلا بہت کم ظرف اور چھوٹے لوگ تھے

ہر کوئی اس بات کو شاید ہی سمجھ سکے مگر البانیہ کے یہ خاندانی لوگ اپنی ناموس پے آج بھی جان دیتے تھے

ان کے لیے عزت بھوک سے زیادہ اہم تھی۔

اسے عیسائی ماں کی بیٹی ہونے کے بھی طعنے دیے جاتے تھے۔

اس کا باپ شاید ایک اچھا باپ ہوتا اگر اس کی بیوی اسے دھوکہ دے کر نہ بھاگ چکی ہوتی۔ وہ اس گھاؤ سے کبھی سنبھل نہیں سکا تھا۔

وہ ناموس کو اس وقت زیادہ اہمیت دیتا تھا جب اسے اپنے اردگرد وفادار عورتیں نظر آتی تھیں

تب اس کا احساس زیاں دوگنا ہو جاتا تھا

امیر اس بات کے متحمل ہو سکتے تھے کہ اپنی نیک نامی کھو کر زندہ رہ سکیں۔ وہ دولت سے اسے حاصل بھی کر سکتے تھے۔ وہ بے نیازی سے اپنی عزت خرید سکتے تھے۔ جیسے کوئی نیا بنگلہ خریدنا ہو یا کوئی نیا بزنس۔ باقی دنیا کے حالات بڑے ہی مختلف تھے۔ جس آدمی کے وسائل جس قدر کم ہوتے تھے اس کی

عزت غیرت اور ناموس کی قیمت اس قدر زیادہ ہوتی تھی۔

انگریز یہ قدیم اصول اور نادر روایات نہیں سمجھ سکتے تھے۔

ان کی بیویاں دوسرے مردوں کو بوسہ دیتی تھیں۔ مے نوشی کرتی تھیں۔ اجنبیوں کے ساتھ رقص کرتی تھیں۔ یا ان کے ساتھ بستر بدل لیتیں یہ انگریز معاشرے میں بہت عام تھا وہیں صدیوں پرانے اس مہاجر مسلم البانوی خاندان کی عزت آبگینے سے زیادہ نازک اور قیمتی تھی جس کا کوئی مول ہی نہیں تھا

صدیوں پہلے یہ لوگ اپنا وطن چھوڑ کر قریہ قریہ گھومتے بواریا آبسے تھے مگر ان کے دماغ آج بھی اس معاشرے اور اس بے راہ روی میں ڈوبے معاشرے کو قبول نہیں کر سکے تھے جہاں بیوی بہن بیٹی اور بہو کے لیے کوئی حد مقرر ہی نہیں تھی

مادر پدر آزاد لوگ

اگر کسی آدمی کی غیرت کو اس کی بیوی یا بیٹی دھوکہ دے دیتی گویا وہ مردہ آدمی تھا یا مردار سے بھی بدتر تھا۔

اسکے لیے بازاروں میں گھومنا ناممکن تھا

وہ نظر اٹھا کر آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نظر جھکا کر چلتا یا نظر بچا کر۔

وہ کسی بیئر ہاؤس میں فٹ بال میچ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ کسی چائے خانہ میں پانسہ نہیں پھینک سکتا تھا۔ اس کے کندھے جھکے ہوتے تھے اور آنکھیں ندامت کے بوجھ سے جھکی رہتی تھیں۔ اس کی ذات بے مایہ تھی اور کوئی بھی ایسے آدمی کی دل سے عزت نہیں کر سکتا تھا

اس کی بات کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس آدمی کا کوئی مول نہیں ہوگا

: آپ کو پیش کیا جانے والا سگریٹ بجھا رہے گا۔ آپ کی کافی اپنا آخری گھونٹ بھی تلخ چھوڑے گی۔ آپ کو شادیوں منگنیوں یا عقیقے کی تقریبات میں نظر انداز کیا جائے گا۔ اپنے ہی گوشے میں روپوش اپنی رسوائی کو سمیٹے شرمندگی میں گھرے آپ کسی خشک پھل کی طرح سوکھ جائیں گے۔

ڈی سوزا کے ڈیڈی کے اندر یہ گھاؤ دراصل نسل در نسل تھا اس کی دادی بھی اس کے دادا کو ایسا

گھاؤ دے کر مری تھی۔ یہ داغ ان کے دامن پر کچھ نئے نہیں تھے۔

اس لیے ڈی سوزا کا باپ اکثریت سے اپنی اصلیت ہی چھپا لیتا تھا

وہ احساس کمتری کا مارا ہوا ایک ذہنی مریض تھا جس کے اندر دو عورتوں کی بے وفائی نے شگاف ڈال رکھے تھے

ایک اس کی ماں اور دوسری اس کی بیوی۔

ایک وقت میں اپنے غم بھلانے کو ڈیڈی نے خود کو مے خانوں میں بھی رسوا کیا تھا۔ جو ایک بیماری تھی۔ لیکن اپنی حلال کی کمائی کو کسی رقاصہ پر لٹانا کوئی اچھی بات تو نہیں تھی

مگر کلب کی وہ رقاصہ اس کے باپ کی وجاہت سے متاثر ہو کر مرمٹی تھی۔

دیکھا جاتا تو ڈی سوزا کی سوتیلی ماں سے کہیں زیادہ اس کا باپ وجیہہ اور شکیل تھا۔ وہ اس غم اور روگ سے نکل آتا

کسی اچھے میگزین کے لیے پوز دیتا تو راتوں رات شہرت کی بلندیوں تک پہنچ سکتا تھا۔

وہ ایک خوب صورت اور جوان مرد تھا مگر دو عورتوں کے ہاتھوں گھائل شدہ۔

جب کوئی عزت دار آدمی اپنی عورت کے ہاتھوں رسوا ہو تو اس کی مردانگی اس تازیانے اور زخم کو کبھی نہیں بھول سکتی

مرد کسی بھی معاشرے کا ہو جب بات غیرت پر آئے تو اس کی انا اور مردانگی بلبلا اٹھتی ہے۔
سلسبیل اور ڈی سوزا ایک ہی خاندان کا حصہ تھے ان کی عزت ناموس اور غیرت ہر ایک میں شراکت تھی

اس قدامت پرست خاندان میں عورت کو اسی لیے اتنی آزادی نہیں دی جاتی تھی

عورت کا کام بچے پیدا کرنا جانور پالنا مردوں کا ہاتھ بٹانا اور مصروف رہنا تھا

اس سے آگے بھی کوئی دنیا تھی؟

اس بات سے اکثر ان کے خاندان کی عورتیں ناواقف تھیں

ایسے خاندان میں روسی اور بروزو جیسے آدمیوں کو گھروں میں گھسانا بڑا مشکل امر تھا مگر کچھ چیزوں کے ساتھ سمجھوتہ بڑی مجبوری کی بات تھی

کوئنز برڈ روڈ پر ایک کارنر شاپ کا مالک بروزوان سب میں امیر آدمی تھا۔وہ مٹھائیاں اسنیکس ڈرنکس اور منجمند کھانے ڈبوں میں پیک کروا کر لے آتا تھا۔

یہ دو بچے جو اپنی آخری عیاشی بیکری کے نہ بک سکنے والے پنیر کی باقیات کو سمجھتے تھے ان کے لیے رنگا رنگ کھانے اشتہا انگیز تھے

اور ایک ایسی عیاشی جس کو لفظوں میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا تھا

دادی کو یہ دو مرد ذرا بھی پسند نہیں تھے مگر ممی کی مجبوری میں چپ ہو جاتی تھیں۔ بروزو اور روسی اس گھر میں ناپسندیدہ افراد میں شامل تھے مگر ان کو یہاں آنے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا

بروزو کے پاس اکثر ایسے میگزین ہوتے تھے جو اس گھر میں ممنوع ترین تھے۔ مے فیر' مین اونلی' پینٹ ہاؤس اس ملک میں بے حیائی کا کوئی انت نہیں تھا۔ یہاں بے پناہ ناشائستگی اور فحاشی تھی

یہ ساری برہنگی کسی فائدے کی نہیں تھی۔

پتہ نہیں لوگ برہنہ ہو کر کیسی مسرت حاصل کرتے تھے کبھی جو سلسبیل کی نظر اس میگزین پے پڑ جاتی اس سے سانس لینا بھی دوبھر ہو جاتا تھا۔ دل جیسے دھڑکنا ہی بھول جاتا۔ خوف سے وہ کانپنے لگتی تھی۔

پھر ڈی سوزا کو بتاتی

"پتہ نہیں لوگ ایسی تصاویر کیسے بنوا لیتے ہیں۔"

اسے بات کرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی

"جب حیا ختم ہو جائے تو سب کچھ آسان ہوتا ہے۔" ڈی سوزا کا جوب

"شاید ضمیر زندہ نہیں رہتا۔"

"میرا خیال ہے انسان اپنی خواہش کے پیچھے اندھا ہو جاتا ہے کچھ پانے کی دولت یا شہرت؟"

اسکول سے گھر کا رستہ تب طویل ہو جاتا تھا۔

"خواہش جنون بن جائے تو اس سے بڑا کوئی نشہ نہیں۔" ڈی سوزا کتابوں میں رہتی تھی اور کتابی باتیں کرتی تھی۔

"ایسا ہی ہے۔"

سلسبیل سر ہلا کر اتفاق کرتی

"ہم آج شام کو چائے خانہ جائیں گے۔" ڈی سوزا اسے راز داری سے بتا رہی تھی

"اور پیسے؟"۔

"میرے پاس تو نہیں ہیں۔" ڈی سوزا نے مایوسی سے کہا

"تو پھر چائے خانہ میں کیا لینے جانا ہے؟"۔

سلسبیل کا انداز خفیف تھا

"شاید وہ خوب صورت ڈاکٹر آیا ہو۔ اس کی کتاب واپس کروں گی۔" اس کا سارا زور خوب صورتی پہ تھا۔

"چلو میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" سلسبیل کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔

" آج تمہارے گھر کیا مینیو ہوگا؟"۔ ڈی سوزا کو شاید بھوک لگ رہی تھی

"بینگن کا سالن' ہرے چنے کے چاول'

پودینے کا رائتے کے ساتھ کوفتہ۔" سلسبیل کو لگا اسے بھی شدت کی بھوک لگی ہے۔

"میرے لیے بھی رکھنا۔"

اس نے تاکید کر دی تھی

" کیوں نہیں۔"

اس نے حامی بھری

"تم شام کو تیار رہنا ہم دونوں چلیں گے۔"

دونوں نے وعدہ لیا اور اپنے اپنے گھر کی طرف مڑ گئی تھیں

تب کہیں دور بروزونام کی عفریت ان دو لڑکیوں کو بغور دیکھ رہی تھی جو خود میں مگن ارد گرد سے مکمکل بیگانہ تھیں

شام کو اس نے دادی کو حسب معمول بتا دیا تھا کہ وہ ڈی سوزا کے ساتھ جا رہی ہے دادی کا دل تھا وہ ان کے ساتھ بیکری میں وقت گزارتی مگر اس کی خوشی دادی کو بہت مقدم ہوتی تھی

اس نے اپنا چھوٹا بھائی بھی ساتھ تیار کر لیا تھا۔ وہ آؤٹنگ پے باقی بچوں کی طرح بڑا ہی خوش رہتا تھا۔

وہ دادی کو خدا حافظ کہنے بیکری آئی تھی۔ اس نے دیکھا تھا دادی بیکری کی صفائی میں لگی تھی۔، وہ فرش صاف کر رہی تھی۔ شیلف جھاڑ رہی تھی۔ اور کھڑی پر لگے سائن بورڈ سے گرد اتار رہی تھی۔

وہ اس عمر میں بھی چاق و چوبند تھی۔

دادی اسے دیکھ کر مسکرا دی

"میری خوب صورت بیٹی!"۔

دادی کے چہرے پے شفیق مسکراہٹ تھی۔

"میں کچھ کام کروا دوں کیا؟"۔ اس نے فکر مندی سے پوچھا

"نہیں تمہاری اسکرٹ گندی ہو گی۔"

دادی نے شفقت سے کہا

وہ دل ہی دل میں ماشاءاللہ کہہ رہی تھی

سلسبیل کی کیسی ہی اچھی اٹھان تھی

"کب تک واپس آؤ گی؟"۔

"بہت جلدی دادی۔"

اس نے تسلی دی تھی

"دیکھ لو۔ میں انتظار کروں گی۔ اور ہم ایک ساتھ گھر چلیں گے۔"

"جیسے آپ کہیں۔" اس نے ڈینی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا

دادی کو لگا تھا وہ آج ضرورت سے زیادہ ہی خوش ہے۔اس نے آج بڑے اچھے کپڑے پہن رکھے تھے وہ دل سے تیار ہوئی تھی

دادی کا دل ہولے سے چٹکیاں بھرتا رہا اور وہ اس نامعلوم احساس کو کام میں مصروف رہ کر جھٹکتی رہی

وہ اپنی دوست ڈی سوزا کے ساتھ چلی گئی تھی

بواریا کے سب سے قدیم اور مشہور چائے خانے میں جہاں شارلوت کا گوئٹے محبت کی ایک نئی کہانی کھول کر بیٹھا تھا۔

جیسے اسے پورا یقین تھا ہشام ضرور آئے گا

بھیگی سی اس گلابی شام وہ سفید پھولوں کے ساتھ رکھے بینچ پے بیٹھا تھا وہ دنیا جہاں سے بے خبر دکھائی دیتا تھا مگر ایسا ہرگز نہیں تھا

وہ جیسے زیرِ لب کچھ سنا رہا تھا یا دھیان سے دیکھا جاتا تو یہ کلام اس کا خود سے ہی تھا

"""جب آپ اچانک ایک ایسے شخص میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو کسی پر الزام نہیں لگاتا، فضول بحثوں سے گریز کرتا ہے، جو خود پر بیتی تکلیفوں پر چرچا نہیں کرتا جو درد سہہ کر مسکرا دیتا ہے جو ہر اس غلطی کو بھی تسلیم کرتا ہے جو اس سے سرزد نہیں ہوئی ہوتی۔اور ان لوگوں کو دیکھتا ہے جو اسے چھوڑ کر جا رہے ہیں، اور ایک دبیز خاموشی سے زخموں کو قبول کرتے ہیں، تب آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ پختگی کے اعلیٰ ترین مراحل میں پہنچ چکے ہیں۔" دل بہ تو بستم گل یاس دلپذیر...

چون کودکی کہ از مدرسہ می گریزد

و گنجشک ہا و شعر ہایش را

در جیب شلوارش پنہان می کند

مجھے جب سے تم سے محبت ہوئی ہے

میری چمبیلی

میں بالکل ایسا ہو گیا ہوں جیسے اسکول سے بھاگا ہوا بچہ
اور وہ چھپاتا ہے چڑیوں کو اور ان کی نظموں کو
اپنی پتلون کی جیبوں میں۔۔۔
وقت ان دو اجنبی لوگوں میں گواہ بن کر کھڑا ہو گیا تھا
سفید پھول عقیدت سے مسکرا دیے تھے
محبت ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی تھی
اور ان دونوں کا اس پر سر تسلیم خم کرنے کا ارادہ لگتا تھا۔
جو بھی انسان کے ذہن کو سمجھتا ہے وہ جانتا ہے کہ انسان کے لئے اس خوشی کو ترک کرنا بہت مشکل ہے، جس سے وہ ایک مرتبہ لطف اندوز ہو چکا ہو۔

Whoever understands the human mind, knows that hardly anything is harder for a man than to give u pleasure which he has once experien

اس خوشی کا حساب کیسے ہو جب وہ پوچھیں جناب کیسے ہو۔
اور جیسے سفید پریاں محو رقص ہو گئی تھیں
اور اس نے سلسبیل کو براہ راست مخاطب کر کے پوچھا تھا
"تم کیسی ہو؟"
آج سے پہلے کبھی ان الفاظ میں ایسی مٹھاس محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آج سے پہلے لفظ اتنے دلفریب نہیں لگے تھے
سلسبیل کا دل چاہا وہ اس چائے خانے کی پرانی عمارت میں ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے
وہ یہاں بار بار آئے تا کہ راہ گیر اس کے نقوش کبھی بھلا نہ سکیں
انسان کو ان شہروں میں جہاں اس پر محبت گزری ہو جہاں اس نے محبت کو اوڑھا ہو جہاں اس

نے محبت کے سامنے سر جھکایا ہو ضرور جانا چاہیے

چاہے وہاں لوگ بدل چکے ہوں چہرے بدل چکے ہوں عمارتیں بدل چکی ہوں
مگر محبت اپنے نقش کہیں نہ کہیں ان رستوں پر چھوڑ چکی ہوتی ہے

یہ قدیم چائے خانہ بے شمار محبت کے ماروں کا مسکن تھا یہاں سیاست معاشرت مذہب' محبت ہر موضوع پر بحث ہوتی تھی جب ہشام ان کے لیے چائے لا رہا تھا تب پس منظر میں کوئی جوشیلا نوجوان بے شمار لوگوں کے بیچ کوئی نیا موضوع چھیڑ کر بے دریغ بول رہا تھا

تب ہشام نے ان دونوں سے کہا

"میں ہر روز اس کو سنتا ہوں۔ آج تم بھی سنو۔"

اور وہ دونوں اس نوجوان کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں

اس میں کچھ خاص تھا

وہ کسی کتاب کا متن دہرا رہا تھا یا کوئی ترجمہ پڑھ رہا تھا"

"اگر آپ ملک کا نظم و نسق سنبھالنے کا خیال رکھتے ہیں، تو پھر آپ کو سب سے پہلے اپنے خاندان کو منظم کرنا ہو گا۔"

ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک آدمی اپنے خاندان کو تعلیم یافتہ بنانے میں تو ناکام رہے، مگر وہ سماج کی تعلیم و تربیت پر بضدر ہے۔

اس لیے سب سے بہترین اور اعلیٰ شخص وہی ہے جو ملک سدھارنے کا آغاز، اپنی ذات، اپنے گھر اور اپنے خاندان کی تعلیم و تربیت سے کرتا ہے۔

حکمران صرف اسے ہونا چاہیے جو تقویٰ کی معراج پر ہو۔ جو دل سے اپنے بزرگوں کی خدمت کرنے اور حد درجہ ان کا ادب و احترام کرنے والا ہو۔ اپنے سے چھوٹوں و دیگر افراد کے ساتھ نہایت شفقت اور نرمی سے پیش آنے والا ہو۔

" کانگ اپنے خطاب کے دوران" کہتا ہے:"یہ ایسا ہے جیسے ایک ماں اپنے بچے کی دیکھ بھال

کے لیے خود کو مکمل طور پر وقف کر دیتی ہے۔" ہوسکتا ہے وہ بچے کی پرورش کرنے میں ماہر نہ ہو، لیکن وہ پھر بھی اپنے بچے کو کسی دوسری عورت کے سپرد کر کے اس سے جدا ہونا برداشت نہیں کر سکتی، حالانکہ اس نے بچے کو جنم دینے سے پہلے کبھی بھی بچوں کی پرورش کی کوئی تربیت حاصل نہیں کی ہوتی۔

جب ایک خاندان انسانیت کے اصولوں پر عمل پیرا جائے گا، تو پورا ملک انسانیت قائم کرنے کے لیے خود بخود متحرک ہو جائے گا۔

جب ایک خاندان کے ساتھ معاملات طے کرنا آسان ہو جاتا ہے، تو ملک کے تمام لوگوں کے ساتھ میل جول اختیار کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اگر ایک آدمی لالچ و فساد سے معاملات کو بگاڑ دے تو پھر پورا ملک افراتفری میں ڈوب سکتا ہے۔

حقیقی معنوں میں معاشرے کی تعمیر و ترقی اسی کلیے میں مضمر ہے اور یہ عملی طور پر واقعی اس طرح ہے۔

اس لیے کہاوت ہے کہ ''ایک لفظ سارا معاملہ جیت سکتا ہے، ایک آدمی پوری سلطنت کو آباد کر سکتا ہے۔''

یاؤ اور شون نے سلطنتوں کی بنیاد انسانیت پر رکھی اور عوام نے ان کی قیادت کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔

زی اور چاؤ نے جارحیت کے ساتھ سلطنت کے معاملات کو چلایا، لوگوں نے ان کے سامنے بھی سر تسلیم خم کیا۔

لیکن حقیقت میں لوگ ایسے قوانین کے ساتھ کبھی بھی زیادہ دیر ہم آہنگ ہو کر چل نہیں پائے جو انہیں پسند نہیں تھے۔

بہترین انسان وہی ہے جو دوسروں میں اچھائی تلاش کرنے سے پہلے وہ اچھائی خود اختیار کرتا ہے۔ وہ دوسروں کی برائیوں کو ختم کرنے سے پہلے اپنی برائیوں سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔

جو شخص دوسروں کو معاف کرنے کی صلاحیت اور باہمی تعاون کا جذبہ نہیں رکھتا وہ اپنا علم اور فن کبھی بھی دوسروں کو نہیں سکھا سکتا۔

قدیم کتابوں میں لکھا ہے کہ " آڑو کا درخت جب اپنے جوبن پر ہوتا ہے، تو پھل کے ساتھ ساتھ اس کے پھول پتے بھی غذائیت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ لڑکی جب اپنے شوہر کے گھر جاتی ہے، تو

وہ گھر میں خاندان کی بنیاد رکھنے اور خاندان کو مربوط و منظم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔" ایک بار جب گھر میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو پوری سلطنت کے نظام میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔

قدیم کتابوں میں لکھا ہے کہ:" جو شخص اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ادب واحترام کا سلوک روا رکھتا ہے اور جو شخص اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ شفقت و پیار کا معاملہ کرتا ہے، وہی شخص اس قابل ہوتا ہے کہ اپنے ہم وطنوں کی تربیت کر سکے۔

قدیم کتابوں میں لکھا ہے کہ:" ایسا شخص اپنے معاملات میں دوغلا پن نہیں اختیار کرتا، اس کا اسلوب ناقابل تغیر ہوتا ہے۔" وہ اپنے آپ کو حد درجہ تک درست کر چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا جب حکمران اپنے اندر باپ/ بیٹے، بڑے بھائی/ چھوٹے بھائی کے رشتوں میں ادب واحترام کو یقینی بناتے ہوئے تمام معاملات کو عزت سے پایہ تکمیل تک پہنچائے گا تو لوگ اس کی شخصیت کو بطور نمونہ دیکھیں گے۔

اسی لیے کہا جاتا ہے" ملک پر حکومت کرنے کی اہلیت خاندان کو ہم آہنگ کرنے میں مضمر ہے۔

خاندان کو منظم رکھنے کا راز فرد کی درست آبیاری میں مضمر ہے۔"

جب آپ کسی سے محبت کرتے ہیں تو پھر آپ باقیوں کے ساتھ تعصب رکھتے ہیں۔ جب کوئی ایسا ہے جس سے آپ نفرت کرتے ہیں، تو اس کے متعلق آپ متعصب ہوتے ہیں۔ جب کوئی ایسا ہوتا ہے جس سے آپ خوف زدہ ہوتے ہیں، تو آپ اس کے متعلق متعصب ہوتے ہیں۔ جب کوئی ایسا ہوتا ہے جس پر آپ کو ترس آتا ہے تو آپ دیگر کے متعلق متعصب ہوتے ہیں۔ جب آپ سست ہوتے ہیں تو آپ اپنی سستی اور کاہلی کے بجائے متحرک افراد سے متعصب ہوتے ہیں۔

وہ لوگ جو کسی سے پیار کرتے ہیں اور پھر بھی اس کی برائیوں سے آگاہ رہتے ہیں، یا وہ لوگ جو کسی سے نفرت کرتے ہیں اور پھر بھی اس کی شخصیت کے اچھے پہلوؤں کو جانتے ہیں، تو ایسے لوگ نہایت قلیل تعداد میں ہیں۔

اسی لیے کہاوت ہے" آدمی کو اپنے اولاد کی برائی نہیں دکھائی دیتی، اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتا اور دوسروں کی آنکھ کا تنکا دیکھتا ہے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر آپ خود اپنی تربیت نہیں کرتے، اپنے آپ میں سدھار اور بدلاؤ

نہیں لاتے تو پھر آپ اپنے خاندان کو بھی منظم نہیں کر سکتے۔"
شاید ہی ان دونوں نے آج سے پہلے اتنی اچھی گفتگو سنی ہو۔ وہ جو کوئی بھی تھا گفتگو میں بڑا ہی کمال رکھتا تھا۔

" دنیا دو نظریات پر کھڑی ہے۔ کوئی آپ کا خالص پن نہیں دیکھتا۔ سب کو ظاہر سے غرض ہے۔ ابھی آپ مجھے بولتا دیکھ رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں میری آواز خوب صورت ہے مگر جیسے ہی میں اپنے چہرے سے ہیٹ ہٹا دوں گا۔ تم سب مجھے دیکھنا اور سننا گوارا نہیں کرو گے کیونکہ تم سب ظاہر کے دلدادہ ہو۔"
وہ جزباتی نوجوان ہیٹ میں اپنا چہرہ چھپا کر ہر روز اس چائے خانہ میں آتا تھا۔ وہ بغیر کسی معاوضے کے تقریر کرتا تھا وہ لوگوں میں ایک نئی سوچ ابھار کر کسی سورج کی طرح اچانک غروب ہو جاتا تھا

نہ جانے ہشام نے اسے کہاں دیکھا تھا؟

وہ ہر روز سوچتا ہر روز اس خیال پے الجھتا اور کوشش کرتا کہ کسی دن اسے پکڑ کر ضرور پوچھے گا

"اس سے پہلے میں نے تم کو کہاں دیکھا؟"۔

مگر یہ ایک خیال ہی ہو سکتا تھا

وہ لوگوں پر سحر پھونک کر اب کسی اور موضوع کی طرف نکل رہا تھا

ہشام نے اسے دھیان سے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا"

وکٹر ہیوگو کا ناول" کبڑا عاشق "دیکھ سکتے ہیں آپ "اس نے میز سے ایک کتاب اٹھا کر لہرائی تھی

یہ ناول دراصل ایک طرف تو پندرھویں صدی عیسوی کے فرانسیسی معاشرے کا عکاس ہے جب وہاں کا عدالتی نظام ابھی معصوم اور مجرم کی شناخت سے نابلد تھا تو دوسری طرف وکٹر ہیوگو نے انسانی معاشرے میں ازل سے پائی جانے والی ہوس اور محبت کے درمیان کشمکش کو بڑی خوب صورتی سے اجاگر کیا ہے ۔ اردو میں کہانی کا عنوان "زہریلا عشق" زیادہ بہتر لگتا ہے۔ کہ میں جس سے پیار کرتا ہوں اسی کو مار دیتا ہوں۔۔۔۔ کہانی کے مطالعہ کے دوران یاد آتا ہے۔

دوسری طرف مصنف نے اپنے دو کرداروں، خوبصورت جپسی لڑکی (ایمرالڈا) اور بدصورت کبڑا عاشق (قاسمیڈو)، کے ذریعے دنیا میں پائی جانے والی مادہ پرستی کو واضح کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے

کہ دنیا کو انسان کی معصومانہ خواہش اور نیک نیتی سے کوئی غرض نہیں۔ وہ تو بس ظاہر کو دیکھ کر اپنا فیصلہ سناتی رہے گی۔

قاسمیڈو کا ایمرالڈا کے ساتھ مکالمہ کا ایک ٹکڑا پیش ہے۔

"تم یہی سوچ رہی تھیں نا کہ قدرت نے مجھے کتنی محرومیاں دی ہیں۔ ہاں میں بہرہ ہوں۔ مجھے اسی طرح بنایا گیا ہے۔ کتنی دہشت ناک بات ہے لیکن میں کیا کروں۔ میرا قصور؟ تم کتنی خوب صورت ہو!"۔۔۔" آج سے پہلے مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا کہ میں کتنا بدصورت ہوں۔ میں جب تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے اوپر افسوس ہونے لگتا ہے

یہ دنیا خوب صورت ہے

"اب وہ تھکے انداز میں کہہ رہا تھا

" مگر ضروری نہیں ظاہری طور پر اس دنیا میں ہر انسان خوب صورت ہی ہو۔"

اب اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی

" مگر لوگ خوب صورت دل سے زیادہ خوب صورت چہرے کے طلب گار ہوتے ہیں۔"

ان تین لوگوں کو لگا تھا اس کی آواز لرز رہی ہے

وہ کوئی بدصورت آدمی لگتا ہوگا؟

سلسبیل نے دکھ سے سوچا

"خوب صورتی انسان کی کیسی بڑی آزمائش ہے؟

کوئی اس آدمی کو بتا سکتا تھا؟"۔

وہ ایک دم روسٹرم دھکیل کر غائب ہو گیا تھا

وہ کوئی ایسا ہی چھلاوا تھا

اس کے جاتے ہی سحر ٹوٹ گیا

اور لوگ جیسے بھانت بھانت کی زبانیں بولنے لگے تھے

"بظاہر یہ جوان کوئی موٹیویشنل اسپیکر لگتا ہے۔ مگر اندر سے اس کو کسی مسیحا کی ضرورت ہے۔"

ہشام نے تبصرہ کیا تھا

"میں تو مسمرائز تھی جیسے وہ ابھی کہہ دے گا۔کوئی ہے جو مجھ سے شادی کر سکے؟"

اور ساتھ ہی ڈی سوزا کو جھرجھری سی آ گی

"ہم میں سے کوئی بھی ایسی جرات نہیں کر سکتا۔ہم خوب صورتی کو اپنے اردگرد دیکھنا چاہتے ہیں۔"

اس شام وہ دونوں اداس رہی تھیں تب ہشام کو یاد آ گیا تھا کہ اس نے اس موٹیویشنل اسپیکر کو کہاں اور کس جگہ دیکھا تھا

وہ اسے پہلے بھی سن چکا تھا

وہ گوئٹے انسٹیوٹ تھا جہاں مختلف زبانیں سیکھائی جاتی تھیں جن میں جرمن زبان سرفہرست تھی وہاں ہشام کے اکثر میڈیکل سے ریلیٹڈ لیکچرز ہوتے تھے وہاں اس نے اس بہروپیے کو دیکھا تھا ایک سے کئی زیادہ مرتبہ وہ بنا معاوضے کے گھنٹوں بول سکتا تھا

قسط نمبر 6

" کیا تم کو کوئی اور کتاب چاہیے؟ ۔"

ہشام نے ڈی سوزا سے پوچھا تھا۔

"یہ ایک نیکی ہے۔" وہ خوش دلی سے بولی تھی

"ویل،"۔ وہ سوچنے لگا تھا

" کیا یہ ممکن ہے کہ میرے ساتھ چلو۔"۔

اس نے کچھ سوچ کر کہا

" کہاں؟"۔ دونوں بیک زبان بولی تھیں

" زیادہ دور نہیں۔ میں تم کو اپنی لائبریری دیکھاتا ہوں۔"

"اوکے۔" ڈی سوزا تیار تھی جبکہ سلی کچھ کشمکش کا شکار لگتی تھی

" کیا ان کو جانا چاہیے تھا؟"۔

ڈی سوزا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کسی رہنما کی طرح اس کی رہنمائی کرتی سر جھکا کر اس کے پیچھے چل دی۔ وہ ہمیشہ تاحیات اس کے پیچھے چلنے کے لیے جا رہی تھی۔ اس کا گھر پوش ایریا میں تھا جہاں سیاست دان اور تاجر رہا کرتے تھے انہوں نے ایسے گھر پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے

بلاشبہ یہ امیروں کے گھر تھے۔ ان کا پہلا ٹکراؤ جس عورت سے ہوا وہ کثرت شراب نوشی سے تباہ حال عورت لگتی تھی شراب جس کو حرام سمجھا جاتا تھا جس کو ان کے خاندان میں نفرت بھرا مشروب سمجھتے تھے۔

شرابی عورت کی بھلا کیا اوقات ہوتی ہے؟ دونوں نے دکھی دل سے سوچا تھا ایک انتہائی مہذب

انسان کی انتہائی غیر مہذب ماں نے کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ان دونوں کو لائبریری چھوڑ گیا تھا خود وہ کہاں گیا تھا؟

ڈی سوزا کو کتابوں میں گم دیکھ کر سلی ایک تجسس سے بے چین ہو کر باہر چلی آئی تھی۔ اس نے ایسے شاندار گھر بس ڈراموں میں دیکھے تھے۔ ان کے قصبے سے باہر کی زیادہ جدید تھی یہاں بے شمار مشینی سسٹم تھے اور قیمتی نوادرات۔ اس نے دیکھا وہ کچن میں بہت تیزی سے کھانا گرم کر رہا تھا بہت نفاست اور لگن کے ساتھ اس نے ٹرالی سیٹ کر لی تھی۔

پھر وہ کھانا لے کر اس عورت کے پاس گیا جو شکل سے ہی بیمار لگتی تھی۔ وہ عورت چل پھر نہیں سکتی تھی۔

سلی نے دیکھا۔ وہ بڑی زمہ داری سے مصروف عمل تھا جیسے اسے یاد بھی نہ ہو کہ اس کے ساتھ دو لڑکیاں بھی گھر میں موجود ہیں۔

اس نے نیپکن کھولا اور چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر اپنی ماں کو کھلانے لگا

"آپ صبح سے بھوکی ہیں نا۔"؟

وہ خفگی سے پوچھ رہا تھا۔"

"ٹرے میں ویسے ہی کھانا پڑا رہا۔ آج میں آ نہیں سکا۔ بہت مصروف دن تھا۔"

"مجھ سے یہ نہیں کھایا جاتا۔ مجھے یہ بھوسہ لگتا ہے۔" وہ بیزاری سے بولی

"آپ ٹیسٹ لیس ہو چکی ہیں نا؟ کوئی زایقہ آپ کو محسوس نہیں ہوتا ورنہ یہ بڑی اسپیشل ڈش تھی۔"

وہ ان کو زبردستی کھلاتا رہا

"تم مجھے مار دینا چاہتے ہو نا؟ تاکہ تمہاری مجھ سے جان چھوٹے اور تم اس جادوگرنی کے پاس اپنے باپ کے وطن چلے جاؤ۔ جن سے وعدے اور قسمیں کھا رکھی ہیں۔"

ڈیزی کے ہر روز والے شک وشبہات کے وہ تسلی اور حوصلے سے جواب دیتا رہا تھا

"ایسا تو کچھ بھی نہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ صحت یاب ہو سکیں ممی۔"

"میں تم پر بوجھ ہوں۔ مجھے اولڈ ہوم چھوڑ آؤ۔ تم اپنی زندگی اچھے سے enjoy کر لو۔"

ڈیزی نے کہا۔وہ ہر روز دن میں سو مرتبہ یہ بات کہتی تھی ۔اس کو پتہ تھا اس کا بیٹا ایسا کچھ نہیں کرنے والا۔

"اس بات کو کرنے سے آپ کو تسلی ملتی ہے تو کر لیں ۔آپ جانتی ہیں میں ایسا کرنے والا نہیں ہوں۔"

وہ چھوٹے چھوٹے نوالے بنا بنا کر ڈیزی کے منہ میں رکھتا رہا۔

بیماری دن بدن اس پر سختی کر رہی تھی اس کا جسم تیزی سے فربہ ہو رہا تھا یہ موٹاپا دراصل اس کی صحت گرنے کا رجحان بتا تا تھا۔

ہشام کو خوف تھا کہ اگر موٹاپا کنٹرول نہ ہوا تو یہ چلنے پھرنے سے بلکل ناکارہ ہو جائے گی پھر ہسپتال بھی اسے قبول نہیں کرے گا۔

"یہ کون لڑکیاں ہیں؟"

اب اس کا دھیان لائبریری کی طرف تھا

"یہ۔"؟ہشام سوچنے لگا کہ ان کا کیا تعارف دے؟

"یہ میری اسٹوڈنٹس ہیں۔"وہ کہنا چاہتا تھا

پھر رک گیا۔

"ان میں ایک بوارین بیکر کی پوتی ہے جس کا پنیر آپ کو پسند ہے۔اور دوسری اس کی سہیلی ہے۔"

تعارف مکمل ہوا

"میں آپ سے ملواتا ہوں۔مگر آپ کو کھانا ختم کرنا ہوگا۔"

"مجھے نہیں ملنا۔"ڈیزی بلا کی موڈی تھی۔

"اچھا نہ ملیں۔کھانا ختم کریں۔میں دوائی تیار کرتا ہوں۔"

" کچھ فائدہ ہوگا اس کا؟"۔

وہ چڑ کر بولی تھی۔اشارہ دوائی کی طرف تھا

"ہوگا۔نہ بھی ہوا تو تسلی رہے گی۔اور جینے کے لیے آسرا کافی ہوتا ہے۔"

وہ نرمی سے بولا، پھر اس نے نیپکن سے اپنی ماں کا منہ صاف کیا تب اسے اچانک لائبریری سے کچھ آوازیں سنائی دی تھیں۔

"ارے واہ۔ڈاکٹر ہشام کی ایک بات بہت اچھی ہے ہر کتاب کے ساتھ فٹ نوٹ لکھ رکھا ہے یعنی کہانی کا خلاصہ۔اگر پسند آئے تو پڑھیں نہ پسند آئے تو نہ پڑھیں۔" ڈی سوزا کی آواز میں جوش تھا ۔ہشام مسکرادیا۔اسے آج پتہ چلا تھا کہ خوشی اتنی چھوٹی بھی ہوتی ہے؟

"میں اس کتاب کی متلاشی تھی۔" وہ مسرور تھی

" کیا ہے اس میں۔" اس کی دوست بیزاری سے پوچھ رہی تھی۔اسے کتابوں سے زیادہ اس بلی میں دل چسپی ہو رہی تھی جو باہر اچھل کود رہی تھی۔

"تم تسلی رکھو۔میں تم کو ضرور بتاؤں گی۔"

ڈی سوزا کا انداز ہ چڑانے والا تھا جیسے کہ رہی ہو تم سنو یا نہ سنو میں تم کو زبردستی سناؤں گی۔

"دیکھو اس ناول میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہیرو قاتل ہے۔

"اس نے تجسس ابھارا۔

"یہ کیا خاص بات ہوئی۔" سلی کو ذرا بھی دل چسپی نہیں ہوئی

"قاتل ہیرو نہیں پھر مجرم ہوا۔"

"نہیں اس میں قاتل ہی ہیرو ہے۔"

وہ بتانے لگی تھی"

دوستوئفسکی کا 'جرم وسزا'

روسی ناول نگار فیودر دستوئفسکی کا یہ ناول انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں لکھا گیا تھا اور ڈیڑھ صدی بعد آج بھی عالمی ادب کے افق پر پورے جاہ وجلال کے ساتھ چمک رہا ہے۔دوستوئفسکی کا یہ کمال ہے کہ اس نے ایک مجرم کی نفسیات کو بڑے بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ایک ایسا مجرم جس

کا آئیڈیل نپولین بونا پارٹ ہے اور جو اپنی عام حیثیت سے اوپر اٹھنے اور 'خاص' ہونے کے لیے بنا کسی ذاتی دشمنی کے ایک خاتون کو قتل کرنے پہنچ جاتا ہے اور دو خواتین کو کلہاڑی سے قتل کر دیتا ہے۔ وہ زندگی سے اس قدر اکتا چکا ہے کہ اسے دوبارہ سے اور نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کے لیے کوئی غیر معمولی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ وہ ایک 'جوں' کو قتل کر بھی دے گا تو کیا فرق پڑے گا، تاریخ میں ایسے بے شمار لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اجتماعی قتل کیے اور بعد میں انہیں میڈل پہنائے گئے اور لوگوں نے انہیں اپنا ہیرو بنایا۔ وہ ذہن کی انہی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا ہے اور پھر اس قتل کے نتیجے میں سرزد ہونے والے جرم اور پچھتاوے کے نفسیاتی و ذہنی طوفان میں گھر کے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ قتل کے بعد اور حتیٰ کہ عدالت میں بھی رسکولنیکوف کو اپنے جرم پہ کوئی ظاہری پچھتاوا نہیں ہوتا۔ وہ یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے کہ اس نے کوئی غلط کام کیا ہے۔

یوں تو اس سے متعلق سبھی لوگ رسکولنیکوف سے محبت کرتے ہیں مگر وہ سبھی سے بیزار ہے اور اس کی شدید خواہش ہے کہ سبھی اس کو چھوڑ دیں اور وہ اکیلا رہ جائے۔ اس تنہائی میں وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے اسے کرنے دیا جائے اور باقی سب لوگ اس سے لاتعلق ہو جائیں۔ سونیا سیمونونا وہ اکیلی انسان ہے جس سے رسکولنیکوف سب سے پہلے اس قتل اور اپنی الجھی ہوئی ذہنی حالت کے بارے میں بات کرنے کا حوصلہ کرتا ہے اور دونوں کے مابین اس طرح کا جذباتی تعلق استوار ہوتا ہے جو ناول کے آخری صفحے تک جاری رہتا ہے۔ جب رسکولنیکوف سائبیریا کے قید خانے میں اپنی سزا کے دوران ایک دن اچانک اصل دنیا میں واپس آ کر سونیا سیمونونا اور اس کی محبت کو پہچان لیتا ہے تو ناول اپنے نقطۂ عروج کو چھو لیتا ہے۔ یہ ناول کی فضا میں ایک خوشگوار تبدیلی تھی اور اس بات کا اشارہ کہ مجرم کی ذہنی سزا تمام ہوئی اور اب وہ محض جسمانی سزا بھگتے گا جو مجرم کے اپنے الفاظ میں اس کے لیے بہت معمولی سی بات ہے۔ کہرا چھٹ گیا ہے اور بالآخر وہ الجھاؤ سے باہر آ گیا ہے۔ رسکولنیکوف کو قانونی طور پہ محض سات برس کی سزا سنائی جاتی ہے مگر ذہنی طور پہ جو سزا اسے ملی ہے اس کا کوئی حساب نہیں۔ اسے کسی پیمانے پہ رکھ کے ناپا تولا نہیں جا سکتا۔ وہ ایک منہ زور سیلاب کی طرح ہے جو قاتل کے وجود کے اندر ہی اندر تباہی مچاتا پھر رہا

ہے اور قاتل کو اس میں نازک سے تنکوں ہی کا سہارا ہے۔قتل کے بعد سے چھے ماہ کا عرصہ یوں گزرتا ہے گویا صدیاں گزر گئی ہوں اور ان صدیوں میں ہمارا مرکزی کردار بھی صدیوں پرانا ہو چکا ہوتا ہے۔اس ناول کو ہم سسپنس تھرلر کہ سکتے ہیں جو تجسّس کے خمیر سے گوندھا گیا ہے اور پڑھنے والے کو لمحہ بھر کے لیے بھی ادھر ادھر نہیں جانے دیتا۔ پڑھنے والے کو ہر صفحے پہ یہی گمان ہوتا ہے کہ راز سے پردہ اب اٹھا کہ اب اٹھا اور وہ اسی انتظار میں صفحوں پر صفحے پڑھتا چلا جاتا ہے۔میں اس کو پہلے پڑھ چکی ہوں مگر میں اسے دوبارہ پڑھنا چاہوں گی۔

میں اسے بار بار بھی پڑھ سکتی ہوں اس سے مجرم کی نفسیات کی سمجھ آتی ہے۔کوئی انسان دماغی پستی کے کس مرحلے میں پہنچ کر کسی دوسرے انسان کو قتل کرتا ہے؟قتل کرنا کوئی آسان نہیں ہوتا؟انسان کو اپنا دل مارنا پڑتا ہے۔خوف مارنا پڑتا ہے۔ضمیر مارنا پڑتا ہے۔انسان کو اپنے اندر سے انسانیت کو مارنا پڑتا ہے۔اس کے بعد وہ ایک قاتل بنتا ہے۔قتل کرنا کوئی آسان تھوڑی ہوتا ہے؟اور قاتل بننا تو بے انتہا مشکل کام ہے۔"

وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی تھی

"میرا خیال ہے قاتل کے لیے کچھ مشکل نہیں ہوتا۔" سلی نے کافی دیر بعد کی خاموشی کو توڑ کر کہا تھا۔

" کیونکہ وہ اتنی بچار نہیں کرتا۔بے چار انسان کرتا ہے جس میں عقل ہوتی ہے۔قاتل ایک درندہ ہوتا ہے۔اور درندوں میں عقل نہیں ہوتی، تم یہ کتاب مت پڑھو۔مجھے اس کا موضوع ہی اچھا نہیں لگا۔انسان کا ذہن پراگندہ ہو جاتا ہے۔برے خیال آتے ہیں۔جرم بڑا نہیں لگتا۔تم یہاں سے کوئی رومانوی کتاب لے لو یا کوئی سفرنامہ۔اچھی کتاب اچھا دوست ہوتی ہے۔وہ اچھا مشورہ اور اچھا سبق دے کر رخصت ہوتی ہے۔" سلی کی فراست نے باہر بیٹھے ہشام کو حقیقت میں متاثر کیا تھا

اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ سلی اس قدر سمجھدار ہو سکتی ہے؟

" میں تم کو جرائم سے بھری کوئی کتاب پڑھنے نہیں دوں گی اس سے بہتر ہے تم گوئٹے کی شارلوت پڑھ لو۔تم کو محبت پڑھنی چاہیے۔تاکہ تمہارا ذہن اردگرد کی خوب صورتی کو محسوس کر سکے۔دنیا

نفرت زدہ نہیں بلکہ حسین ہے،"

وہ اسے دھیرے سے زندگی کا سبق سمجھا رہی تھی

"تم اتنی اچھی باتیں کب سے سوچنے لگی۔"

ڈی سوزا حیران تھی

"جب سے محبت کو پڑھنا شروع کیا۔" وہ دھیمی ہوئی تھی کہ بے خیالی میں اپنا راز ہی افشانہ کردے

"محبت کہاں سے آگئی۔" ڈی سوزا کو ہضم نہیں ہو رہا تھا

"محبت تو ہے ہی۔بس ہم محسوس نہیں کرتے۔محبت ہمارے آس پاس ہے۔ہر منظر میں ہر جگہ ۔جب ہم محبت محسوس کریں گے تو ہم میں شکر آئے گا اور جب شکر آئے گا تو اللہ کی بنائی کائنات اچھی لگے گی اور اپنی زندگی بے مقصد نہیں لگے گی۔"

اسے وہ لڑکی سبق پڑھا رہی تھی جس نے کم کتابیں پڑھ رکھی تھیں مگر اس کے پاس علم لامحدود تھا

"جب ہم شکر کرتے ہیں تو ہمیں کچھ بھی برا نہیں لگتا نہ اپنے حالات اور نہ زندگی کی تلخیاں۔پھر کتاب زندگی سے فرار کے لیے نہیں پڑھی جاتی بلکہ خود کو مصروف رکھنے کے لیے،" وہ مسکرائی

"یہ جرائم زدہ کتابیں مت پڑھا کرو۔"

سلی نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر ریک میں رکھ دی تھی

"محبت پڑھا کرو۔کیونکہ یہ کائنات محبت سے تشکیل دی گئی ہے اور ہم دونوں کا وجود رائگاں نہیں۔"

وہ پیار سے بولی تھی

ہشام مسکرا دیا۔

اس نے ڈیزی کو دوائی دی اور اس کی کی ٹانگوں پے کمفرٹ ڈالا اسے یہ چھوٹی لڑکی ہر دن کے ساتھ بڑا امتاثر کرتی تھی۔جب وہ کافی بنا کر لایا تو ان کا موضوع کچھ اور تھا

"ہشام! کیا وہ لڑکا بدصورت تھا؟"۔

انہیں چائے خانہ یاد آگیا

"میرا نہیں خیال۔" ہشام نے تبصرہ کیا

"وہ بہروپیا ہو سکتا ہے۔"

" مگر اس کی باتیں بہت اچھی تھیں۔"

ڈی سوزا نے کہا

"میں اسے سن چکا ہوں۔"

"بھلا کہاں؟"۔

"لینگویج انسٹیٹیوٹ۔"

" کیا آپ ہمیں وہاں لے جا سکتے ہو۔"

ڈی سوزا کو بڑا تجسس ہوا۔اور سلی بس اسے گھور کر رہ گئی

"ہاں کیوں نہیں۔ایک نیو بیچ آ رہا ہے۔مختلف ممالک سے کورسز کے لیے۔میری وہاں ڈیوٹی ہو گی۔تم چلنا۔"

اس نے حامی بھر لی تھی

انسٹی ٹیوٹ یہاں قریب ہی تھا۔

"ہمیں اب چلنا ہو گا۔" سلی کو وقت گزرنے کا احساس تھا

" کیوں نہیں۔میں تم دونوں کو ڈراپ کرتا ہوں۔"

وہ گاڑی کی چابی اٹھا لایا: یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔وہ ایک اجنبی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر نہیں جا سکتی تھیں ان دونوں کے گھرانوں میں یہ بات ناپسند کی جا سکتی تھی مگر دیر اس قدر ہو چکی تھی کہ وہ انکار نہیں کر سکتی تھیں۔مگر وہ اتنا اقدار کا پاس دار تھا یا سمجھ دار کچھ بھی کہہ سکتے تھے

وہ ان کو بیکری کے پاس چھوڑ گیا تھا آگے وہ پیدل جا سکتی تھیں۔جب تک وہ نظر آتی رہیں کھڑا رہا اور پھر چلا گیا

وہ کیا کوئی رہنما تھا؟

کوئی رہبر؟

یا سراہ راہ چلتا کوئی خضر؟

وہ جو بھی تھا ان دولڑکیوں کی زندگی میں ایک سنگ میل تھا۔ اس کا سرراہ ٹکرا جانا کوئی عام بات نہیں تھی ۔قدرت نے خاص طور پر ان اجنبیوں کو آپس میں ملوایا تھا اس نے خوابوں جیسی ان دو بوارین کو دیکھا۔ زندگی جیسے ان سے امتحان لیے بنا نکل رہی تھی مگر یہ ممکن تھا کہ زندگی امتحان لیے بنا ہی نکل لیتی ؟ کوئی ایک احساس ان دو کے ساتھ تھا

جیسے کوئی دیکھ رہا ہو بہت گہرائی سے جانچتا ہوا کوئی تھا جو تعاقب میں تھا گھات لگا کر بیٹھا ہوا

"مجھے لگتا ہے روسی نے دیکھ لیا۔" یہ ڈی سوزا تھی۔

روسی ہی کی جیکٹ تھی ۔وہ باڑے کی اوٹ تھا اور چوری چوری دیکھ رہا تھا

"یہ ممی کو بتا دے گا۔" سلی کو ڈر لگا

"وہم نہیں کرو۔ کسی نے بھی نہیں دیکھا۔"

ڈی سوزا نے اسے تسلی دی

"مجھے یقین ہے۔" اس کی جان نکل رہی تھی۔

" کچھ نہیں ہوتا۔" اندر سے ڈی سوزا بھی ڈری ہوئی تھی

کچھ دیر بعد جب وہ گھر پہنچی تو وہاں روسی پہلے سے موجود تھا۔

قسط نمبر 7

رات بواریا میں بہت گہری تھی آسمان خاموش تھا اور رات بول رہی تھی

بواریا میں ذہنی طور پر بے انتہا مضبوط یہ لڑکیاں ایک عجوبہ ہو سکتی تھیں۔

ایسے گھر میں جہاں رزق تلاش معاش اور گھر گرہستی کے علاوہ کوئی دوسرا مسلہ نہیں تھا

باہر کیا ہو رہا ہے؟ سیاست معاشرت کھیل فنون ان کی بلا سے

وہ دن سے رات تک پنیر دودھ مشین کہیت اور چارے میں الجھے لوگ تھے۔

قربانی کے دنوں میں مسلمان علاقوں کی طرف جانور لے کر کاروبار کی غرض سے نکل جاتے تھے

تاکہ ان کے جانور مہنگے داموں بک سکیں۔

سارا دن دودھ پنیر اور بکری کے آئٹم بڑھانے کی فکر میں غرق بے انتہائی شفیق

دادی' دنیا سے بے نیاز دادا اور محنت کش باپ

ایک بدمزاج ماں اور اس کے رشتے دار۔

اور یہ جانوروں کا باڑہ اور بھیڑ بکریاں۔

سلی دکھی دل سے سوچ رہی تھی۔

ڈی سوزا اسے گہری سوچوں میں گم دیکھ کر حیران نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی سلی اور وہ دونوں ہی ایک جیسے حالات کا شکار تھیں۔ دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ اور ایک دوسرے کو بہت اچھے سے جانتی تھیں۔

ڈی سوزا نے کہا

"اب ہمیں کچھ کھا لینا چاہیے۔"

وہ جانوروں کے فضلہ اٹھانے والے اوزاروں کو دھوتی سلی سے مخاطب تھی۔

"ہاں بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔" اس نے سارے اوزار دھو کر خشک کر دیے تھے۔ جانوروں کی جگہ صاف کر دی اور ایک جراثیم کش اسپرے بھی کر دیا۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ گو کہ ممی خوش ہونے والی نہیں تھی۔ یہ سب دیکھ کر بھی ممی نے اس میں نقص ہی نکالنے تھے۔ وہ کبھی سلی سے راضی نہیں ہو سکتی تھی

"سلی! تم چائے بنا سکتی ہو تو میں پنیر پگھلاتی ہوں۔"

ڈی سوزا کو سچ میں بھوک لگی تھی

سلی نے دادا کے بنائے چھوٹے سے کچن کا جائزہ لیا۔ یہاں ضرورت کا سب ہی کچھ دستیاب تھا۔

وہ صاف برتن لے کر گائے کا تازہ دودھ دھونے چلی گئی تھی۔

گرم گرم تازہ دودھ گائے کے تھنوں سے نکلتا دیکھ کر جو سیروں خون بڑھتا تھا اس کی خوشی کسی دوسری چیز میں نہیں تھی۔

"افففف خدا! تو کس قدر مہربان ہے۔ کیسے کیسے انسانوں کی خوراک کے انتظام کرتا ہے۔" سلی کی آنکھوں میں تشکر تھا

" سلی نے دودھ کا برتن بھر لیا اور ایک گلاس بھر کے ڈی سوزا کو دیا۔ دوسرا خود پی لیا

" کس قدر رزا لقہ ہے نا۔" وہ اپنے بھیگے ہونٹ زبان سے صاف کرتی سادگی سے بولی

" سلی! تم لوگوں کی گایوں کے اس کاروبار میں بڑی برکت ہے۔" اس نے حسرت سے کہا

" کاش میرے ڈیڈی بھی جم کر یہ کاروبار کر لیتے۔"

"تم کو تو یہ بھیڑیں پالنا پسند نہیں۔"

سلی نے کہا

"ہاں میرے خواب تو بڑے بلند ہیں۔" وہ فوراً بولی

کتابیں پڑھ پڑھ کے وہ کسی کم چیز پے راضی نہیں ہوتی تھی

خدا تمہارے خواب پورے کرے۔" اس نے دل سے کہا تھا

اس دن ممی غیر ضروری نہیں چلائی تھی۔اور نہ اس نے بہت بدزبانی کی تھی

وہ لینگوتیج انسٹیٹیوٹ میں مختلف زبانیں سیکھنے کہ درجہ اول میں داخل ہو چکی تھیں۔یہ ایک بڑی الگ سی دنیا تھی

جہاں ہر نسل ہر قوم کے لوگوں ان کے رسم ورواج بودو باش اور مزاج سمجھنے کا موقع ملتا تھا

یہ دنیا ہائی اسکول کی لگی بندھی دنیا سے بے انتہا الگ تھی یہاں کام یاب پروفیشنل لوگ بھی تھے اور ہر لحاظ سے معاشی طور پر بے فکر لوگ بھی۔یہاں روزگار کے پیچھے خوار ہوتے لوگ بھی تھے اور ایسے بھی لوگ تھے جن کا مقصدیت ہی کچھ اور تھا۔یہ لوگ کسی کاز کے پیچھے تھے جیسا کہ عین۔

عین ایک فلسطینی لڑکی تھی۔جو یہاں درجہ دوم کی طالب علم تھی۔کچھ مہینے پہلے اس کا خاندان فلسطین میں بمباری سے مارا گیا تھا۔اس کے بعد وہ یہاں نہیں رکی۔اپنے وطن واپس چلی گئی تھی اب سننے میں آیا تھا عین شہید ہو گی ہے۔

سلی نے پہلی مرتبہ سنا تھا کہ کوئی خوب صورت لڑکی اپنی ایک عبادت گاہ کی حفاظت کرتے ماری گئی تھی۔

وہ کئی ایک دن اس ٹراؤما سے نکل نہیں سکی۔کوئی جوان اور خوب صورت لڑکی کیسے خود کو مرنے کی طرف لے جاسکتی ہے۔موت کوئی خوب صورت احساس نہیں۔

تو کیسے لوگ اپنی مرضی سے مر جاتے ہیں؟

وہ کئی دن بہت پریشان رہی۔پھر اس کی پریشانی کو محبت کرنے والی دادی نے بھانپ لیا

وہ اسے بیکری پے لے آئی تھیں۔

"پیاری سلی!تم کو کیا ہے کہ بڑی غمگین نظر آتی ہو۔؟"

سلی دادی سے کچھ بھی نہیں چھپانا چاہتی تھی۔اس نے ایک ہنکارا بھر کے کہا

"اوما(دادی)!ایسا کیا ہے کہ لوگ اپنی عبادت گاہ یا مذہب کے پیچھے جان دے دیتے ہیں؟"۔

دادی اپنی پوتی کے اس سوال پر سخت خوف زدہ ہو گئی۔اس کی رنگت بگڑ گئی۔اور اس کا دل کانپ گیا

"یہ تم کو کس نے سیکھایا؟" وہ خوف بھری آنکھوں سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ میرا سوال ہے۔"

"یہ کچھ اچھا سوال نہیں۔ تم پڑھ لکھ کر اچھا روزگار تلاش کرو تو میں تمہاری شادی کر دوں گی۔"

دادی کے چہرے پے کامل سنجیدگی تھی۔

"یہ میرے بھی سوال کا جواب نہیں۔" اس کو بھی اچھا نہیں لگا

"چلو فضول باتیں مت سوچا کرو۔"

دادی نے اسکارف اچھے سے درست کیا اور کام سے لگ گئی

مگر اس کا دل عجیب وہموں میں پڑ گیا تھا

"سلی سترہ کی ہو گئی ہے ایک سال بعد اس کی شادی کر دوں گی۔"

اس نے دل ہی دل میں حساب کتاب لگایا۔

جبکہ سلی بہت دور آسمانوں میں کچھ کھوج رہی تھی

یہ کیسی بے مقصد زندگی تھی

بہت ہی فضول۔ دن سے رات تک کیا کرتے تھے؟

"دادی!"

کچھ دیر بعد اس نے پھر سے اپنی دادی کو آواز دی

"یہ میرا نام سلسبیل کس نے رکھا؟"۔

یہ سوال اتنا عام نہیں تھا جس پر اس کی دادی چونکتی نا۔

اس نے ہراساں نظر ارد گرد کے ماحول پر ڈالی۔ جیسے یقین کرنا چاہتی ہو کہ کوئی ان کو سن تو نہیں رہا

"تمہارا نام میں نے رکھا۔"

"اچھا۔" وہ تب خاموش ہو گئی تھی

مگر دوسرے دن اس نے کلاس سے باہر آتے ہوئے ڈی سوزا سے پوچھا

وہ آجکل عربی سیکھ رہی تھی۔

"میرے نام کا مطلب سمجھا سکتی ہو؟"۔

"ہاں کیوں نہیں۔" ڈی سوزا نے کہا

"تمہارا نام عربی ہے۔ اور اس پے مزید معلومات لے کے دے سکتی ہوں۔"

ڈی سوزا نے حامی بھر لی تھی

سلی کو بہت بچپن سے اپنے ارد گرد کا ماحول اور چیزیں عجیب لگتی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس جگہ کا حصہ نہیں تھی۔ اس کا کوئی گم شدہ حصہ ضرور تھا جو کسی اور خطے میں رہ گیا تھا۔ اور سلی یہاں بھٹک رہی تھی۔

ایک دن قدیم چائے خانے میں اس کی روبرو ملاقات اس بہروپیے سے ہوگئی

جس نے چہرے پے ماسک اور کاسٹیوم پہن رکھا تھا

لوگ ایک وقت میں اس سے ایک سوال پوچھ سکتے تھے۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اسے مل گیا تھا۔ بہت اچانک اور غیر متوقع

سلی نے اس سے پوچھا

"کیا میری زندگی کا کوئی مقصد بھی ہے؟"۔

بہروپیا مسکرایا۔ کہ اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں

"تم بے مقصد پیدا نہیں ہوئی چھوٹی لڑکی! تم سے وقت بہت بڑا کام لے گا۔ اور تمہاری تصویر دنیا کے اخباروں میں چھپے گی۔ اور بے شمار کیمرے تمہارا پیچھا کریں گے۔"

سلی یہ سب سن کر حیران ہوئی

"یہ کیسے ممکن ہے؟"۔

"کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا چھوٹی لڑکی! تم ایک بڑے مقصد کے لیے بھیجی گئی ہو۔ تمہارا جینا اکارت نہیں اور مرنا تو بلکل نہیں۔"" اس کے اگلے الفاظ نے سلی کے چہرے پے لہو کی گردش روک دی

تھی۔ یہاں تک کہ وہ مزید کوئی سوال پوچھتی وہ بہروپیا ایک وجد میں پڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سلی اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی

"اے نیک دل آدمی رکو!

گرمئی حیات کی حقیقت تو بتاتے جاؤ۔" سلی نے چلا کر کہا تھا

"وہ یک دم رکا۔ پلٹا اور بہت سوز بھرے لہجے میں بولا

"چونکہ کوڈ سب گڈمڈ ہو گئے ہیں

اور حقیقی سوچ کی جگہ

ظاہری نام و نمود نے لے لی ہے

چونکہ ہم

کبھی نہ لکھی جانے والی تاریخ

کے ہیرو پیدا کر رہے ہیں

جبھی ہم

مردہ ستاروں کی منتشر ہوتی ہوئی

دھول بنتے جا رہے ہیں

دوبارہ جنم لینے کی مایائی خواہش

ہماری رگوں میں سے جھانکتی ہے

اور ہم ایک بار پھر توانا ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں

جیسے بجلی کی بھٹیوں میں

اینٹیں اور شیشے کی پگھلی روئی ہوں

میں اپنے آپ کو شناخت کرتا ہوں

درختوں کے اک اک مسام میں

اور میرے گھر کا پتا ملے گا

خشک ہوتے کھیتوں کے درمیان

تب انہی گرہوں سے

میں تخلیق کرتا ہوں

ستاروں کا پورا جہاں

زمیں دوز پانی (کاریزوں) میں چھپی ہوئی،"۔اس نے ایک ایسی نظر سے سلی کو دیکھا جس میں بھید ہی بھید تھے۔لحظے کو سلی کا دل اس نظر سے ڈوب گیا اور اس کی آنکھ کے سامنے اندھیرا آ گیا

"میں دعا کروں گا تمہاری بینائی روشنی سے آشنا ہو۔"

اور پھر وہ رکا نہیں

جبکہ سلی نڈھال ہو کر وہیں گر گئی تھی۔

:سلی کو بڑے عجیب خواب ستاتے تھے۔یہ خوابوں کا سلسلہ بڑا پرانا تھا۔اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔مگر اب جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی جا رہی تھی اس کے خواب اسے پریشان کرنے لگے تھے۔وہ اپنی ذات میں گم رہنے والی لڑکی تھی مگر اب کچھ زیادہ گم رہتی تھی۔

وہ کائنات کی حقیقت پے پہروں سوچتی پھر اپنی پیدائش اور اس کے بعد اپنے زمین پر چلنے پھرنے کو۔اسے یقین تھا خدا نے اسے بے مقصد زمین پر نہیں بھیجا۔

اگلے بہت سارے دن وہ بہروپیے کا انتظار کرتی رہی۔

اس کا نام "ماسک مین" تھا۔وہ بے حد قابل انسان تھا یا اس کے پاس بہت سے علوم تھے یا وہ کوئی جوتشی تھا۔بس سلی کو اس کا انتظار رہنے لگا تھا۔وہ ہر روز اس نیت سے انسٹی ٹیوٹ جاتی تھی کہ شاید ماسک مین آج آیا ہو مگر اس کا انتظار بس انتظار ہی رہا۔

سلی کے اندر بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔اور وہ اپنی بے چینی کا ایک حل پاتی تھی اور وہ ماسک

مین سے ملاقات تھی ۔ایک روز سلی کو وہ مقامی ہاؤس فراؤ کے کاٹیج میں نظر آیا تھا۔سلی بیگ سینے سے لگائے بھاگتی ہوئی ڈھلان اتر کر اس ہاؤس فراؤ کے کاٹیج پے پہنچی ۔شدت جذبات سے اس کا چہرہ کانپ رہا تھا

وہ یہاں کسی جھگڑے کا تصفیہ کر رہا تھا۔

دو خواتین کے بیچ کوئی بحث چل رہی تھی۔

وہ دونوں ایک بھیڑ پے بضد تھیں۔دونوں کا کہنا تھا کہ بھیڑ اس کی ہے۔

سلی نے دیکھا ماسک مین بہت تسلی سے قہوہ پی رہا تھا جیسے اسے فیصلے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

پھر اس نے اپنے کام سے فراغت پا کر کہا۔

" کیا تم دونوں اس بھیڑ کی ملکیت پے قسم دے سکتی ہو؟"۔

وہ دونوں بیک زبان بول اٹھیں

" کیوں نہیں۔"

" مگر میں اس قسم پے قرار باندھنے سے پہلے تم دونوں کو ایک کہانی سناتا ہوں۔"

پھر ماسک مین نے کہنا شروع کیا

..."ایک شہنشاہ جب دنیا کو فتح کرنے کے ارادے سے نکلا تو اس کا گزر افریقہ کی ایک ایسی بستی سے ہوا جو دنیا کے ہنگاموں سے دور اور بڑی پر سکون تھی۔ یہاں کے باشندوں نے جنگ کا نام تک نہ سنا تھا اور وہ فاتح ا

ور مفتوح کے معنی سے نا آشنا تھے'بستی کے باشندے شہنشاہ اعظم کو مہمان کی طرح ساتھ لے کر اپنے سردار کی جھونپڑی میں پہنچے۔سردار نے اس کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور پھلوں سے شہنشاہ کی تواضع کی۔

کچھ دیر میں دو قبائلی فریق مدعی اور مدعا الیہ کی حیثیت سے اندر داخل ہوئے۔سردار کی یہ جھونپڑی عدالت کا کام بھی دیتی تھی۔

مدعی نے کہا۔

’’میں نے اس شخص سے زمین کا ایک ٹکڑا خریدا تھا۔ ہل چلانے کے دوران اس میں سے خزانہ برآمد ہوا میں نے یہ خزانہ اس شخص کو دینا چاہا لیکن یہ نہیں لیتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ خزانہ میرا نہیں ہے کیوں کہ میں نے اس سے صرف زمین خریدی تھی۔ اور اسے صرف زمین کی قیمت ادا کی تھی، خزانے کی نہیں‘‘

مدعا الیہ نے جواب میں کہا۔

’’میرا ضمیر ابھی زندہ ہے۔ میں یہ خزانہ اس سے کس طرح لے سکتا ہوں، میں نے تو اس کے ہاتھ زمین فروخت کردی تھی۔ اب اس میں سے جو کچھ بھی برآمد ہو یہ اس کی قسمت ہے اور یہی اس کا مالک ہے، میرا اب اس زمین اور اس میں موجود اشیاء سے کوئی تعلق نہیں ہے‘‘

سردار نے غور کرنے کے بعد مدعی سے دریافت کیا۔

’’تمہارا کوئی لڑکا ہے؟‘‘

’’ہاں ہے!‘‘

پھر مدعا الیہ سے پوچھا۔

’’اور تمہاری کوئی لڑکی بھی ہے؟‘‘

’’جی ہاں... ‘‘ مدعا الیہ نے بھی اثبات میں گردن ہلادی۔

’’تو تم ان دونوں کی شادی کر کے یہ خزانہ ان کے حوالے کردو۔‘‘

اس فیصلے نے شہنشاہ کو حیران کردیا۔ وہ فکر مند ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

سردار نے متردد شہنشاہ سے دریافت کیا۔ ’’کیوں کیا میرے فیصلے سے آپ مطمئن نہیں ہیں؟‘‘

’’نہیں ایسی بات نہیں ہے۔‘‘ شہنشاہ نے جواب دیا۔ ’’لیکن تمہارا فیصلہ ہمارے نزدیک حیران کن ضرور ہے۔‘‘

سردار نے سوال کیا۔ ’’اگر یہ مقدمہ آپ کے روبرو پیش ہوتا تو آپ کیا فیصلہ سناتے؟‘‘

شہنشاہ نے کہا کہ۔ ’’پہلی تو بات یہ ہے کہ اگر یہ مقدمہ ہمارے ملک میں ہوتا تو زمین خریدنے

والے اور بیچنے والے کے درمیان کچھ اس طرح کا جھگڑا ہوتا کہ بیچنے والا کہتا کہ: میں نے اسے زمین بیچی ہے اور اس سے زمین کی قیمت وصول کی ہے، اب جبکہ خزانہ نکل آیا ہے تو اس کی قیمت تو میں نے وصول ہی نہیں کی، اس لیے یہ میرا ہے۔

جبکہ خریدنے والا کہتا کہ:

میں نے اس سے زمین خرید لی ہے، تو اب اس میں جو کچھ ہے وہ میری ملکیت ہے اور میری قسمت ہے۔

سردار نے شہنشاہ سے پوچھا کہ، پھر تم کیا فیصلہ سناتے؟

شہنشاہ نے اس کے ذہن میں موجود سوچ کے مطابق فوراً جواب دیا کہ:

ہم فریقین کو حراست میں لے لیتے اور خزانہ حکومت کی ملکیت قرار دے کر شاہی خزانے میں داخل کر دیا جاتا۔"

"بادشاہ کی ملکیت!" سردار نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا آپ کے ملک میں سورج دکھائی دیتا ہے؟"

"جی ہاں کیوں نہیں؟"

"وہاں بارش بھی ہوتی ہے...."

"بالکل!"

"بہت خوب!" سردار حیران تھا۔ "لیکن ایک بات اور بتائیں کیا آپ کے ہاں جانور بھی پائے جاتے ہیں جو گھاس اور چارہ کھاتے ہیں؟"

"ہاں ایسے بے شمار جانور ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں۔"

"اوہ خوب' میں اب سمجھا۔" سردار نے یوں گردن ہلائی جیسے کوئی مشکل ترین بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔ "تو اس ناانصافی کی سرزمین میں شاید ان ہی جانوروں کے طفیل سورج روشنی دے رہا ہے اور بارش کھیتوں کو سیراب کر رہی ہے۔"

ماسک مین چپ ہوا تو دونوں خواتین ایک دوسرے سے نظر چرا رہی تھیں۔

" جبکہ ناانصابی' کسی کا حق غصب کرنا' کسی کا ایک خوشہ ناجائز کھانا بہت بڑا گناہ ہے۔" وہ بولتا رہا۔ دونوں عورتیں شرمندہ ہوئیں۔

" یہ بھیڑ تم دونوں کی نہیں۔ جبکہ یہ بھیڑ اس بوڑھی بیکر کے باڑے کی ہے۔" اور جیسے فیصلہ ہو گیا تھا۔ سلی بے انتہا حیران تھی۔

دادی صبح سے اپنی ایک بھیڑ کے غم میں نڈھال بیٹھی تھی۔ اور سلی نے پہلی بار کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ آجکل وہ اپنی سوچوں کے زیر اثر ہر چیز سے کٹی ہوئی تھی۔

دادی کی پریشانی اور غم بھی اسے سمجھ نہیں آیا۔ وہ ماسک مین سے ملنے کے شوق میں یہاں چلی آئی تھی تو اسے دادی کی گم شدہ بھیڑ بھی مل گئی

" سلی! کیسے آنا ہوا۔" وہ ایک رسی بھیڑ کے گلے میں گرہ لگا کر اس کے ہاتھ میں تھماتا بولا تھا

" مجھے تمہاری تلاش تھی ۔ ایسے لگتا ہے جب سے تم سے ملی ہوں میری بے چینی کم ہوئی ہے۔"

ماسک مین شاید مسکرایا ہو۔ اس نے خیر مقدمی سر ہلایا اوپر سے نیچے جیسے کہہ رہا ہو " مجھے امید تھی تم آؤ گی۔"

" کیا چاہتی ہو اچھی لڑکی۔"

اس نے چڑھائی کی طرف جاتے جاتے پوچھا۔ وہ ان رستوں کا عادی معلوم ہوتا تھا

" میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں۔ میرا نام کیا البانوی لوگ کثرت سے رکھا کرتے ہیں؟ یا بہت کم۔"؟

اس نے الجھن بھرے انداز میں پوچھا

" یہ کچھ مشکل بات نہیں۔ مسلمانوں میں یہ نام کثرت سے رکھا جاتا ہے۔" وہ بولنے لگا

" اور البانین مسلم یہ نام کثرت سے رکھتے ہیں؟"۔

سلی نے پوچھا

" بہت کم۔"

اس نے سوچ کے بتایا

"اور کون لوگ اس نام کو کثرت سے رکھتے ہیں؟"۔اس نے زچ ہو کر پوچھا

'یہ تو عربی نام ہے۔"وہ سنجیدگی سے بولا۔اب کہ سلی بے انتہا حیران ہوئی

"تو دادی نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ یہ چھپانے والی بات تو نہیں۔"

" کیا پتہ چھپانے والی بات ہو۔"اس کا انداز معنی خیز تھا۔

" کیا واقعی؟"۔

"ہاں"وہ تیز قدم اٹھانے لگا تھا۔جس کا مطلب تھا اب وہ رکنے والا نہیں تھا

"میرا عربی نام ہے تو اس کو کسی البانین نے نہیں رکھا۔اس کا کیا مطلب ہوا؟" سلی سخت حیرت میں مبتلا تھی

"اس کا مطلب یہ ہوا تمہارا نام کسی عربین نے رکھا ہوگا۔"اور پھر وہ غائب ہو گیا تھا۔یہاں تک کہ سلی کا ہاتھ بھیڑ کی رسی سے چھوٹ گیا تھا۔

وہ کسی ٹھہرے ہوئے فطری منظر کی طرح منجمند ہو گئی تھی۔

:جب وہ انسٹی ٹیوٹ میں پہنچی تب تک ڈی سوزا اسے ڈھونڈتے ہوئے ہانپ رہی تھی۔

" کہاں رہ گئی تھی تم؟"۔

وہ ناراض لگ رہی تھی۔

"اپنے ٹوٹے حصے تلاش کر رہی تھی۔"اس کا کھویا کھویا فلسفیانہ انداز دیکھ کر ڈی سوزا نے سنجیدگی سے کہا

"ٹوٹی چیزیں جڑ کر زیادہ حسین ہو جاتی ہیں۔"

"یہ تم نے کہیں پڑھا ہوگا۔"

سلی نے کہا

"تم نے نہیں سنا؟ پھر تو حیرت ہے"۔اس نے کندھے اچکائے۔

" کبھی ٹوٹی ہوئی چیزوں کو تم جوڑ کر دیکھو

جب کسی بکھری ہوئی چیز کو سمیٹا جاتا ہے
تو بہت خوبصورت دکھتی ہے
جیسے کہ بغیر پروں کے
کوئی اڑنا سیکھ رہا ہو۔۔!" ڈی سوزا مسکرائی۔
" کبھی ٹوٹی ہوئی چیزوں کو تم جوڑ کر دیکھو
جب کسی بکھری ہوئی چیز کو سمیٹا جاتا ہے
تو بہت خوبصورت دکھتی ہے
جیسے کہ بغیر پروں کے
کوئی اڑنا سیکھ رہا ہو۔۔!!

have learned to make beauty, from broken things.
managed to teach myself how to fly, without wings For" I

اس کے یہ الفاظ حیران کن تھے
سلی کو وہ ہر دن کے ساتھ حیران کرتی تھی۔
ڈی سوزا سچ میں بڑی حیران کن شخصیت تھی

"تم کو پتہ ہے آج میری ڈیڈی سے لڑائی ہوئی۔"

"یہ کوئی نئی بات ہے۔" سلی نے کندھے اچکائے۔

"میری ماں کو گالیاں دے رہے تھے فضول میں۔" وہ تلخ ہوئی

"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"تم بتاؤ تم کہاں تھی؟"۔ڈی سوزا کو اچانک خیال آیا

"میں اپنی تلاش میں ہوں۔ بتا تو رہی ہوں۔" سلی کا انداز گم صم تھا

"پھر کچھ ملا؟"۔

" کوشش جاری ہے۔ کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔" سلی نے گہری سانس بھری

" تم مجھے کیا بتانے والی ہو۔" وہ ڈی سوزا کے چہرے پہ پھیلا تجسس دیکھ رہی تھی۔

" ارے وہ۔ سن! ہماری کلاس میں ایک نیا لڑکا آیا ہے۔ خداداد۔ وہ اپنی فوج میں آفیسر ہے

۔ میرا اس کے ساتھ جھگڑا ہو گیا ہے۔"

ڈی سوزا نے بتایا

" جھگڑا کیوں؟ یہ کتنی بری بات ہے۔" سلی نے تاسف سے کہا

وہ میری سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا اور جان بوجھ کر اٹھ نہیں رہا تھا۔"

ڈی سوزا نے بتایا

" یہ جھگڑے کے لیے کوئی بڑی وجہ نہیں ہے۔" سلی متاسف ہوئی تھی۔

" بس مجھ سے غلطی ہو گئی،۔"

" تم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا جس پر بعد میں ندامت ہو۔ بلکہ کسی بھی انسان کو بہت سوچ کر زندگی گزارنی چاہیے تا کہ بعد والی زندگی کسی ریگریٹ میں نہ گزر سکے۔ اس لیے کہ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔" سلی کا انداز سمجھانے والا تھا

" مجھ سے بھول ہو گئی۔" ڈی سوزا نے افسردگی سے کہا

" یہ بات میرے ذہن سے کیسے محو ہوئی۔

نکولائی میں لکھا ہے انسان کا سب سے قیمتی اثاثہ اس کی زندگی ہے، یہ اسے صرف ایک بار ہی دی جاتی ہے، لہٰذا اسے اس طرح گزارنی چاہیے کہ اسے بیتے ہُوئے سالوں پر کوئی اذیت ناک ندامت محسوس نہ ہو، اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہو تو وہ کہہ سکے میری ساری زندگی، میری ساری طاقت دنیا کے بہترین مقصد "انسانیت کی آزادی کی لڑائی" کے لیے وقف ہو؟ ی۔" ڈی سوزا کے اگلے سوال نے جیسے سلی کی روح میں پنجہ گاڑ دیا تھا

" انسانیت کی آزادی کی لڑائی۔"

اسے فلسطینی لڑکی عین یاد آرہی تھی۔ جب ایک بار سلی نے اس سے پوچھا

"تم مرنا کیوں چاہتی ہو؟"۔

اس نے پتہ نہیں کس جذب کے ساتھ جواب دیا تھا

"انسانیت کی آزادی کی لڑائی کے لیے۔"

تب سلی اس کی بات کا مفہوم نہیں سمجھی تھی۔

اس کا دل بڑا ہی بے چین ہوا تھا۔ اس نے دعا کی کہ کاش عین زندہ ہو اور اس کے مرنے کی اطلاع ایک جھوٹ کے سوا کچھ نہ ہو۔

کیا کوئی محبت کرنے والا انسان مر سکتا ہے؟

اس کا دل ہر روز اس احساس کے ساتھ دکھی ہوتا تھا

اسے عین اور اس کی باتیں اب اکثر یاد آتی تھیں

"آہ فلسطینی لڑکی۔"

اس کو دکھ کے احساس نے بھگو ڈالا

ایک دن سلی نے اس سے سوال کیا تھا

"اچھی لڑکی! بتاناتو جہنم کیا ہے؟"۔

تب فلسطینی لڑکی نے آہ بھر کر کہا

""میں اکثر سوچتی تھی کہ جہنم کیا ہے؟ پھر مجھے جواب ملا: جہنم، انسان کا وہ درد ہے جب وہ کسی سے محبت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

جہنم آگ نہیں۔ جہنم وہ آگ ہے جس میں آپ کے پیارے جھلس کر اپنی زندگی سے دور ہو جاتے ہیں۔"

عین ایک بار سلی کو بتایا تھا

"میرا دادا میرا باپ میرا چچا اور میرا بھائی القدس کی حفاظت کرتے ہوئے جان سے چلا گیا۔"

وہ اس پل کو بھی فخر سے بتایا کرتی تھی

"القدس کیا ہے؟"۔

سلی نے حیرت سے پوچھا تھا۔

" کیا تم کو القدس کا نہیں پتہ؟" عین حیران ہوئی تھی ۔کیا کوئی دنیا میں ایسا مسلم تھا جسے القدس کا پتہ نہ ہو؟

"القدس مسلمانوں کا اولین قبلہ ہے۔"

"یا خدا۔" سلی لرز گئی تھی ۔اس کی آنکھوں کے سامنے بے شمار سیٹلائٹ پر دیکھے دل خراش مناظر آ گئے تھے۔

بچے بوڑھے اور جوانوں کے بریدہ جسم۔

"اللہ اکبر۔"

سلی نے جھرجھری لی

"اچھا تو تم پیغمبروں کی سرزمین کی بات کر رہی ہو۔" سلی کا دل جیسے لرز اٹھا تھا

وہ آج بڑی بے قراری سے عین کو یاد کر رہی تھی

کچھ وقت پہلے ایک غیر مصدقہ اطلاع ملی تھی کہ عین بمباری میں ہلاک ہوگئی ہے

تب سے آج تک سلی کو وہ زندگی سے بھرپور لڑکی کبھی نہیں بھولی تھی۔

اداد کے لیے ہمیشہ اپنا ملک چھوڑنا ایک مشکل فیصلہ ہوتا تھا مگر داؤد کی وجہ سے ایک تسلی بھی تھی ۔وہ بہت ذمہ دار تھا اور چھوٹے بہن بھائی کو سنبھال لیتا تھا۔

اس نے زندگی میں بہت سفر کیے تھے اور کچھ جاب بھی ایسی ہی تھی ۔مشکل اور سہل ہر طرح کے حالات اور سفر سے گزرنا پڑتا تھا کبھی فوجی مشقوں کے لیے کبھی جنگوں کے لیے اور کورسز کے لیے ۔ایک جگہ اس کا ٹھکانہ کم ہی ہوتا تھا

آجکل وہ جرمنی میں تھا

آہن میو خلے کے بیچ میں سے گزرتی ایک سڑک اس گاؤں کے لیے شہ رگ کی حثیت رکھتی تھی ۔گاؤں کے اکثر مکانات اس کے دائیں بائیں تھے ۔گاؤں سے گزرنے والی بس کا اسٹاپ بھی اسی سڑک پر تھا۔ پٹرول پمپ 'مہمان سرائے' اور خریداری کے سٹور بھی تھے ۔ایک بیکری بھی تھی جسے یہاں کی سب سے قدیم بیکری کہا جاتا تھا ۔اگر مشرق کی طرف منہ کر کے چلتے جائیں تو کچھ فاصلے پر پہاڑیوں کا وسیع سلسلہ دکھائی دیتا تھا۔ جو جنوب میں بدتدریج بلند ہوتا تھا۔ جو کوہستان ایلپس سے جاملتا تھا۔اس سڑک پر اکثر چلتے ہوئے متعدد جگہوں پر دور ایلپس کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں دیکھ کر انسان کا دل ایک علوی مسرت سے معمور ہوتا ہے۔بائیں ہاتھ پر بھی پہاڑیاں تھیں۔

:لیکن کمتر اونچائی کی اور سرو و صنوبر کے گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی جن کی ہوا میں خنکی اور رطوبت کے ساتھ ایک عجیب نا قابل بیان قسم کی جنگلی مہکار بسی رہتی تھی ۔ان پہاڑیوں پر ایک آبادی ہوہن موس کے نام سے واقع تھی جسے اس موضع کا صدر مقام کہتے تھے ۔یہ ایک کلیسائی حلقہ تھا۔اس علاقے کا گرجا بھی یہیں پر تھا۔ یہاں زیادہ تر مہاجرین رہتے تھے جو الگ الگ ملکوں سے ہجرت کر کے آئے تھے۔زیادہ تر البانوی مسلم یا مخنف مسلم ممالک کے لوگ تھے جو دہائیاں پہلے اپنا ملک چھوڑ کر یہاں آباد ہو چکے تھے۔ بواریا ایک پورا صوبہ ہے جس کی آبادی کٹر مذہبی ہے۔رومن کیتھولک مذھب کے پیروکار یہ لوگ بہت پرانے خیالات کے مالک تھے

گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں اس نے دوسری مرتبہ ڈی سوزا نامی لڑکی کو دیکھا تھا جس سے اس کی تلخ کلامی ہوگئی تھی ۔آج وہ اکیلی نہیں تھی اس کی سہیلی اس کے ساتھ تھی۔

دنیا کے مختلف حصوں سے آئے لوگوں کے تھکے تھکے مضطرب چہرے اچاٹ اور پریشان حال نئے ماحول میں اجنبی محسوس کرتے عجیب لگ رہے تھے۔

خداداد کو لگا کہ اسے ڈی سوزا سے اپنے غلط رویے کی معافی مانگنی چاہیے۔

:وہ کوئی بدتمیز انسان نہیں تھا مگر یہاں آتے ہی کچھ ناخوش گوار واقعات ہو گے تھے جس کی وجہ سے اس کا فوجی دماغ پھر گیا تھا

ویسے بھی فوجیوں کے بارے میں مشہور ہے کہ بد دماغ ہی ہوتے ہیں اپنی عقل کم ہی استعمال کرتے ہیں۔

کل تو بس سارا دن اپنی رہائش دیکھنے کلاس سمجھنے میں ہی گزر گیا تھا۔ سنگریزوں کی بل کھاتی پگڈنڈی اختیار کر کے جنوب کی طرف کے ایک ٹیلے پر گئے اور گوالوں کے ایک دو منزلہ کشادہ مکان کے سامنے آ رکے۔ جہاں درمیانی عمر کی ہاؤس فراؤ نے ان کا استقبال کیا تھا۔

اس کا ساتھی لڑکا خطیب فلسطینی تھا جو اس کا روم میٹ تھا۔

مکان سے باہر ایک ڈیرہ نما احاطہ تھا جس میں بے شمار جانور بندھے تھے خداداد کو یقین تھا یہ جانور اور باڑہ اسی عورت کی ملکیت تھا۔

کوریڈور میں داخل ہو کر اندازہ ہوا گھر بہت صاف ستھرا تھا خاص طور پر اوپر والی منزل پے طالب علموں کا کمرہ بہترین تھا۔ اس کے عقبی دریچے سے باہر کا منظر ایسا حسین اور روح پرور تھا جسے آج تک کوئی آنکھ دیکھ نہ سکی ہو گی۔ پہاڑی ڈھلانوں پر کھڑے ہوئے پائین اور شاہ بلوط اور صنوبر کے درخت اور ان کے درمیان بل کھاتی ہوئی کبھی اوپر چڑھتی کبھی نیچے اترتی سرمئی سڑکیں زردی مائل سے لے کر سفیدی مائل تک سبزے کے سارے رنگ جن سے فطرت اپنے مناظر کی نقش کاری کرتی تھی۔

خطیب کو بھی یہ جگہ پسند آ گئی اور انہوں نے اسے اوکے کر دیا تھا۔ خطیب کی ساتھ والے گھر میں رہائش تھی رقم پہلے سے طے شدہ تھی۔ ناشتہ ان کی ذمہ داری تھی باقی دو وقت کا کھانا وہ جہاں سے مرضی کھاتے، ایسے بہت سارے رومز اسٹوڈنٹس کو کم کرائے پے با آسانی مل جاتے تھے۔

سڑک کے ساتھ زاویہ قائمہ بناتی ہوئی ایک لمبی دو منزلہ سفید رنگ کی عمارت تھی۔ یہی خداداد کی رہائش گاہ تھی۔

اس نے مزید مکان دیکھنے سے معذرت کر لی تھی۔

خطیب سے اس کی بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی وہ دونوں ایک ساتھ انسٹیٹیوٹ آتے جاتے تھے جب ان کی ملاقات پھر سے ان دو لڑکیوں سے ہو گئی

خداداد نے سوچا

"موقع اچھا ہے معذرت کر لے یار۔"

اس نے کہا

"لیڈی فراؤ! اس دن کے بی ہیو پے معذرت چاہتا ہوں۔"

وہ دونوں لڑکیاں رک گئی تھیں

ان میں سے ایک حیران تھی

" کیسی معذرت؟"۔

دوسری نے اس کو کہنی ماری تھی

"چپ۔"

پھر اس نے تنک کر کہا

"یہ بھی اچھی بات ہے غلطی کر کے معذرت کر لی جائے۔" صاف ظاہر تھا سوری قبول نہیں ہے

"پھر سزا کے لیے بندہ تیار ہے میڈم۔" خداداد نے اپنے مزاج سے ہٹ کر عاجزی سے کہا

"ہم سزا کیوں دیں۔ اللہ آپ کو پوچھ لے گا۔"

" آپ معاملہ اللہ کی طرف نہ لے جائیں۔ از خود معاف کر دیں۔ اللہ معاف کر دے گا۔" اب کہ خطیب نے بھی کہا

"جائیں جی! ہمیں دیر ہوتی ہے۔"

"دیر تو ہمیں بھی ہوتی ہے۔" وہ اس نے مروتی پر کلس کر رہ گیا

"دیکھو تو کتنی مغرور ہے یہ جرمن کی پیداوار۔"

وہ خوب گرم ہوا تھا

"معذرت بھی ضائع کر دی۔"

"چل خیر ہے۔ ایک بار پھر سوری کر لیں گے۔" خطیب نے اسے تسلی دی تھی

ڈی سوزا کا دماغ رات سے بند تھا تبھی تو گھر آئے کرائے داروں میں بھی دل چسپی نہیں لی تھی رات سے وہ صبح کا انتظار کر رہی تھی تا کہ قدیم کتب خانے سے اٹھائی کتاب میں چھپی ایک کہانی سلی کو سنا سکے۔ جب تک اپنی پڑھی کہانی وہ سلی کو سنا نہیں پاتی تھی وہ کسی بدروح کی طرح بے چین رہتی تھی

وہ چاہتی تھی انسٹیٹیوٹ تک پہنچنے سے پہلے وہ سلی کو "پانچواں پراٹھا" سنا کر ہی دم لے

بیچ میں وہ اجنبی آ گئے تھے جن پر ڈی سوزا کو ویسے ہی تاؤ تھا

وہ بس جلد از جلد اپنی کہانی سنا کر من کو ہولا کرنا چاہتی تھی

سلی کو بھی پتہ تھا جب تک کہانی اس نے سن نہ لی جان نہیں چھوٹے گی

"ڈی سوزا! تم اپنی پڑھی ہوئی کہانی سنا دو۔ میں سننے کے لیے تیار ہوں۔"

بس اتنا کہنا تھا ڈی سوزا کی حسین آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

اس نے سلی کا ہاتھ پکڑ کر پتھر پر بیٹھا لیا

"رات میں نے ایک ہندو لکھاری کی لکھی کہانی کا ترجمہ پڑھا۔ یا مترجم اچھا تھا یا کہانی کار۔ پر مجھے ساری رات نیند ہی نہیں آئی۔ ایسے لگا جیسے کسی کی بھوک میرا پیٹ پھاڑ دے گی۔" وہ بری طرح رونے لگی تھی۔

"تم مجھے کہانی سنا کر دل ہلکا کر لو۔" سلی نے پیار سے کہا

تو ڈی سوزا شروع ہو گئی تھی

"تم دھیان سے سننا۔ مصنف لکھتا ہے۔ بٹی بڑی اور بٹو چھوٹا۔ بٹی اسکول جاتے جاتے اب تیسری کلاس میں پہنچی ہے۔ محنتی ہے، سمجھدار ہے، لیکن کبھی کبھی گھپلا ہو جاتا ہے۔ بٹو کے داخلے کی کوشش دو سال سے ہوتی آ رہی ہے۔ پچھلے سال بھی داخلہ نہیں ہو پایا۔ بابو کے پاس نہ تو پیسے ہی ہیں اور نہ وہ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جو بٹو کا داخلہ کرا سکے۔ محلے کے پندرہ بیس مکان داروں نے پانچ پانچ روپے مہینے پر رات کو پہرہ دینے کے لیے رکھا ہے۔ وہ ان ہی سے جا کر کہتے ہیں۔ وعدہ سب کر لیتے ہیں لیکن ہوتا کچھ نہیں۔ بابو کی نوکری پہلے ایک مل میں تھی۔ قریب دو سال سے باہر ہیں۔ شروع میں کچھ

دن کی چھٹنی ہوئی تھی۔ سب مزدوروں کو بٹھا دیا گیا تھا۔ بہت سے مزدور تو کام پر لے لیے گئے، باپو ابھی تک باہر ہیں۔ باپو کبھی کبھی بہت دکھی ہوتے ہیں۔ "ارے! کام کی کمی کے سبب بٹھاتے تو بات تھی۔ لگتا ہے کام کرنا ہی کال ہو گیا"۔ ان جیسے جتنے بھی بیٹھے، آج تک اٹھ ہی نہیں پائے۔

ماں آس پاس کے گھروں میں کام کرنے جاتی ہے۔ کل ملا کر تیس چالیس روپے ماں کو مل جاتے ہیں۔ وہ اپنے کرموں کو روتی رہتی ہے، "ڈھائی تین گھنٹے صبح کام کرو، اتنا ہی شام کو، تیس روپے ملتے ہیں۔ آدمی کے جسم اور محنت کا تو بیاج تک نہیں ملتا۔ جسم کی قیمت ہی نہیں تو بیاج کیا ملے گا!!" بٹیا اسکول جاتی ہے۔ اسے مہینے میں تیس دن خالی پیٹ ہی جانا پڑتا ہے۔ کبھی باپو ڈیوٹی پر سے جلدی آ گئے اور چائے بن گئی تو پیٹ میں دو گھونٹ چائے پڑ جاتی ہے، ورنہ وہ بھی نہیں۔ یہی اس کے دکھ کا سب سے بڑا سبب ہے۔ وہ چاہتی ہے دن میں ملے نہ ملے، لیکن اسکول جاتے وقت ضرور پیٹ بھرا رہے۔

اسکول میں سارا دن پیٹ میں کچھ چوں چوں کرتا رہتا ہے۔ دھیان بٹتا ہے۔ ماسٹر جی بولتے رہتے ہیں اور اس کا دھیان پیٹ کی چوں چوں میں لگا رہتا ہے۔ دوسرے بچے ہیں، وہ کھا کر بھی آتے ہیں اور پیسے بھی لاتے ہیں۔ ریسیس میں وہ کھیلتی رہتی ہے اور بچوں کو چاٹ چٹورے کھاتے دیکھتی رہتی ہے۔ پہلے اس کا ایک دوست تھا۔ جو وہ خود کھاتا تھا اسے بھی کھلایا کرتا تھا۔ اس کی اس ادا سے وہ اس کے قریب آ گئی تھی۔ ایک دن وہ پیسے نہیں لایا۔ دوست نے اس سے کہا، آج تو کھلا۔ بٹی کہاں سے کھلاتی؟ نہیں کھلایا۔ دوست نے اسے طعنہ دیا "تو بھی تو کبھی کھلایا کر۔ یا بس کھانے ہی کھانے کو ہے؟'' اسے بہت رونا آیا۔ بعد میں اس دوست نے بٹی کو بلایا بھی مگر وہ گئی نہیں۔ بیٹھنے بھی دوسری جگہ لگی۔ بولنا چالنا تو بند سا ہی ہو گیا۔ وہ بات اس نے گھر پر آ کر نہیں بتائی لیکن وہ بات اندر ہی اندر اسے کھاتی رہی۔

اس واقعے کے بعد کچھ دن تک تو بٹی چپ رہی، پھر ایک دن وہ ماں پر برس پڑی: "سب بچے گھر سے کچھ کھا کر آتے ہیں۔ تو ہمیں نہ کھانے کو کچھ دیتی ہے اور نہ لے جانے کو۔ ہم کیا کریں؟ اسکول میں بھوک لگتی ہے۔ بھوکے پیٹ ہم سے نہیں پڑھا جاتا"۔ باپو کے بارے میں وہ کبھی کچھ نہیں کہتی تھی۔ اس دن باپو پر بھی غصہ آ گیا۔ "باپو مل میں کام کرنے کیوں نہیں جاتے؟ جب مل میں کام پر

جاتے تھے تو کھانے کو ملتا تھا۔ اب گھر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ کان پور میں اتنی ساری ملیں ہیں۔ سب کام کرنے جاتے ہیں"۔۔۔ ماں کو اس کے بڑبولے پن پر غصہ آ گیا۔ اس نے بیٹی کی خوب مرمت کی۔ بیٹی روتی ہوئی کہتی رہی، ماں اب معاف کر دے۔ اب نہیں کہوں گی۔ بھوکی مر جاؤں گی پر کبھی کھانا نہیں مانگوں گی۔ کسی کو کچھ نہیں کہوں گی۔ ماں غلطی ہو گئی! مگر ماں نے تب تک نہیں چھوڑا جب تک مارتے مارتے خود تھک نہیں گئی۔ پٹائی کے بعد ماں کا دل بہت تڑپا۔ بچی کا کیا قصور تھا۔ بچہ ہے تو بھوک لگے گی ہی۔ آدمی باہر کی آگ تو برداشت بھی کر لے، اندر کی آنچ نہیں سہی جاتی۔ بیٹی کا دل بھی گر گیا۔ ماں نے پیار بھی کیا، وہ نہیں بولی تو نہیں بولی۔ بھائی اس کے چاروں طرف منڈلاتا رہا۔ وہ اسے نظر انداز کرتی رہی۔ گدگدی کر کے بلوانا۔ چاہا پر بٹی نے اسے دھکیل کر ہٹا دیا۔ چپ چاپ اپنا اسکول کا کام کیا اور عین غین ہو گئی۔

چوں کہ بٹی بڑی تھی اور ماں کے ہاتھ سے خوب مار کھا چکی تھی، اس لیے ماں کا دل اس میں اٹکا تھا۔ ماں کو اس دن ایک گھر سے مہینے کی پگار کے دس روپے ملے تھے۔ روپے ہاتھ میں آتے ہی اسے بٹی کا خیال آیا۔ اسے پراٹھے پسند تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ شش و پنج میں رہی۔ پراٹھے بنائے تو کئی دن کی روٹی یہ پراٹھے نگل جائیں گے۔ لیکن بٹیا کی شکل رہ رہ کر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی تھی۔ اس کا دل تڑپ اٹھتا تھا کہ اسے کسی طرح مسکراتے ہوئے دیکھے۔ بٹی کو جو بات لگ جاتی ہے تو لگ جاتی ہے، مشکل سے ہی نکلتی ہے۔ اس کی نظر میں بٹی کو مسکراتے ہوئے دیکھنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ اس نے چپ چاپ پراٹھے بنانے کی تیاری کر لی۔

پراٹھے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ واپس لا سکتے تھے۔ تقریباً ایک کٹوری کھلا ڈالڈا خریدا۔ ڈیڑھ روپیہ اس میں چلا گیا۔ اس کا دل قدرے کسمسایا۔ سوکھے آلو اسے زیادہ پسند تھے لیکن اس نے گیلے آلو بنانے کا فیصلہ کیا۔ چار بڑے بڑے آلو خریدے۔ قریب قریب آٹھ آنے اس میں نکل گئے۔ آٹا خریدا۔ دس روپے میں سے صرف دو روپے بچے۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ سارے کا سارا آٹا پراٹھے میں ہی نہیں لگا دے گی تھوڑا بچا لے گی۔ اس خریداری کے بعد اسے یہ بات ستانے لگی کہ ذرا سی بات

کے لیے لگ بھگ مہینے بھر کی پوری طلب ہی پھونک دی۔ لیکن اپنی اس سوچ کے کواڑ اس نے زبردستی بند کیے اوران سے پیٹھ اڑا کر کھڑی ہوگئی

کہ کہیں پھر نہ کھل جائیں۔ اس کے باوجود اس کے کانوں میں لگاتار کوئی سرگوشی کررہا تھا: ایک وقت کے کھانے میں آٹھ روپے! تیرا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟ اس سرگوشی کی طرف سے بھی اس نے کانوں میں روئی ٹھونس لینے کی ٹھان لی۔ پھر دوسری بات اسے تنگ کرنے لگی۔ بچوں کا لاڈ پیار غریبوں کے لیے منع ہے،

پاپ ہے۔ آدمی اپنے حق میں بھی گناہ کرتا ہے اوران کے حق میں بھی۔ اس بات سے بھی اس نے منہ موڑ لیا اور تیزی سے چلنے لگی۔ چلتے چلتے شوہر کی حالت کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔ کتنا دوڑے، کتنا پیسہ کھلایا۔ ایک ایک چیز تک گروی ہوگئی۔ اس کڑکی میں روٹی کو ہم نہیں کھاتے، روٹی ہمیں کھاتی ہے۔ پراٹھوں کا منہ تو اور بھی بڑا ہوتا ہے۔

ماں نے گھر جا کر چپ چاپ آٹا گوندھا۔ سبزی بنائی۔ نام کے لیے تھوڑا سا گھی ڈالا کہ تھوڑی رونق آجائے۔ پراٹھے سینکتے وقت ذرا سا گھی چھوا دیا۔ سب سے پہلے بٹی کو پکارا، پھر بٹو کو آواز لگائی۔ بٹو پہلے آگیا۔ بٹی تھوڑا نخرے کے ساتھ آئی۔ شاید وہ نہ بھی آئی ہوتی لیکن پراٹھے سینکنے کی خوشبو نے معاً اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ پراٹھے بنتے دیکھ کر اس کی ساری ناداستگی مسکراہٹ میں بدل گئی۔ کنویں میں کانٹا ڈال کر جیسے ڈول نکالا جاتا ہے اسی طرح بٹیا کی ہنسی ماں کی خوشی کو بھی باہر نکال لائی۔ ماں نے پراٹھا سینکنا بند کر کے اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا اور بنا کچھ کہے آنچل سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ بٹو ہنسے جارہا تھا، بٹی کو چڑا رہا تھا۔

"اے بٹی دیدی!! روز ماں سے پٹا کر۔ تجھے ماں کے گلے لگنے کو ملے گا اور ہمیں پراٹھے کھانے کو"۔ ماں نے ہنس کر اسے ڈپٹ دیا، "چپ رہ! بہت بولتا ہے۔" چوں کہ بٹی بڑی بھی تھی اور ماں کے ہاتھ سے پٹی بھی تھی، ماں نے پہلا پراٹھا بٹی کے سامنے ہی پروسا۔ بٹو اس بات سے چڑ گیا اور بیٹھا بیٹھا غصے میں پیر چلانے لگا۔ زور زور سے رونا شروع کردیا۔ ہمیں روز مارتی ہے تو کچھ نہیں۔ اور دیدی

کو ایک آدھ بار مار دیا تو اس کے لیے پراٹھے بننے شروع ہو گئے۔ دیدی کو ہی سب پوچھتے ہیں، ہمیں کوئی نہیں پوچھتا۔ ہم تو فالتو ہیں۔ جب ہم پہلے آئے تو پراٹھا دیدی کو پہلے کیوں دیا؟ ماں اسے سمجھاتی جا رہی تھی تو میرا بہت راجا بیٹا ہے۔ دیدی کا کیا؟ دیدی تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ تو تو میرے پاس ہی رہے گا۔ جانے والے کو کھلا پلا کر جلدی سے رخصت کر دینا چاہیے۔ دیدی چلی جائے گی تو دونوں ماں بیٹے روز پراٹھے بنا کر کھایا کریں گے۔ لیکن بٹو ضد پر اڑا تھا۔ بٹی کا ہاتھ بار بار لقمہ توڑنے کے لیے بڑھتا تھا اور رک جاتا تھا۔ اس کا چہرہ مرجھاتا جا رہا تھا اور کھسیاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر اس نے اپنا پراٹھا اٹھا کر اس کی طشتری میں ڈال دیا اور تیزی سے بولی "لے کھا، نگل!"

بٹو نے جھٹ سے رونا بند کیا اور پراٹھا کھانے میں جت گیا۔ کھاتے کھاتے وہ بٹی کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ حالاں کہ اس کی آنکھیں گیلی تھیں لیکن وہ ہنس رہا تھا۔ پراٹھا بناتے بناتے ماں اب اسے سمجھانے لگی تھی۔ "اس کی بات کا برا مت مان۔ یہ تو سرے سے بگڑ گیا ہے۔ دن بھر ڈھور کی طرح گھومتا ہے۔ جس دن یہ اسکول جائے گا گنگا نہاؤں گی۔ اتنا جل ککڑ ہے کہ بہن کے منہ میں پانی کا گھونٹ تک جاتے نہیں دیکھ سکتا"۔ بٹو کھانے میں مگن تھا اور بٹی کو طرح طرح کا منہ بنا کر چڑا رہا تھا۔ ماں کی بات کا اس پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ماں نے اگلا پراٹھا بٹی کو پروس دیا۔ بٹی نے آنکھیں پونچھ کر پراٹھا کھانا شروع کر دیا۔ بٹی

نے جیسے ہی کھانا شروع کیا، بٹو فوراً بولا، "بٹی دیدی کو تم پراٹھے دو یا نہ دو، میں پیٹ بھر کر پراٹھے کھاؤں گا۔" ماں کا چہرہ تھوڑا اتر گیا۔ آگ جل رہی تھی۔ پراٹھے سینکتے وقت خوب دھواں اٹھ رہا تھا۔ ماں پہلے

اسے دیکھتی رہی، پھر بولی، "زیادہ پراٹھے کھانے سے پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔ ٹٹیاں آنے لگتی ہیں۔ جن کو پراٹھے کھانے کی عادت ہوتی ہے ان کی بات اور ہوتی ہے۔ پراٹھے، وہ بھی گیہوں کے ہضم کرنے کو فولاد کا پیٹ چاہیے۔ بس دو دو ملیں گے۔ باپو بھی تو کھائیں گے نا؟" بٹی نے ماں کی طرف دیکھا۔ گردن نیچی کر کے کھاتی رہی۔ ماں نے بھی بٹی کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بٹی کا پہلا

پراٹھا ختم ہو گیا تھا۔ توے پر پراٹھا سِک کر تیار تھا۔ بٹو کا پراٹھا بھی ختم ہو رہا تھا، ایک دو لقمے باقی تھے۔ ماں نے پراٹھا جلدی سے بیٹی کی طشتری میں ڈال دیا۔ بٹی کی باچھیں کھل گئیں۔ بٹی نے گرم کی پرواکی نہ ٹھنڈے کی، جلدی سے ٹکڑا توڑا، آلو کے پانی میں بھگویا اور کھانا چالو کر دیا۔ بٹو نے شور مچا دیا: "پھر بٹی دیدی کو دے دیا! ہم بھی کھا چکے تھے"۔ ماں نے اسے جھڑکا" کچا ہی دے دوں کیا؟ سکتے سکتے ہی تو سکے گا"۔ پر وہ بڑبڑ کرتا رہا، ''جب ہمیں کوئی چاہتا ہی نہیں تو ہمیں بھگوان اپنے پاس کیوں نہیں بلا لیتا؟ ماں زور سے چلائی، اگر اب پھر ایسی بات کہی تو زبان پر گرم گرم چمٹا رکھ دوں گی۔ بھگوان کو بلانے کے لیے ہی تو ہڈیاں گلا گلا کر پال رہے ہیں تجھے۔" پراٹھا سک گیا تھا، اسے اس کی رکابی میں رکھ دیا۔ بغیر ماں کی ڈانٹ کا خیال کیے بٹو پراٹھا کھانے میں لگ گیا۔ ماں کی نظر بار بار بٹیا پر جا رہی تھی۔ آدھا پراٹھا تو اس نے جلدی جلدی کھایا تھا، اب وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے توڑ رہی تھی، اس طرح سے شاید وہ بچے ہوئے پراٹھے کو دیر تک کھانا چاہتی تھی۔ وہ سبزی بھی زیادہ نہیں لگا رہی تھی۔ زیادہ تر شوربے میں ہی ٹکڑا بھگوتی تھی۔ کبھی کبھی آلو کا ٹکڑا توڑ کر پراٹھے کے ٹکڑے کے ساتھ کھا لیتی تھی۔ بٹو جلدی جلدی کھا رہا تھا۔ وہ اگلا پراٹھا اٹھا لینے کے چکر میں تھا۔ اسے اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ ماں اگلا پراٹھا بھی دیدی کی طشتری میں نہ ڈال دے، اور اس کی چھٹی ہو جائے۔ اس بیچ ماں ایک پراٹھا سینک کر روٹی کی ٹوکری میں رکھ چکی تھی، دوسرا توے پر تھا اور تیسرا چکلے پر۔ پراٹھا ختم ہوتے ہی بٹی نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے آنکھ چرالی۔ بٹو اپنا پراٹھا ختم کر کے تیسرے پراٹھے کے لیے ضد کرنے لگا۔ ماں بڑے تردد میں تھی، پھر بھی اس نے اسے سمجھانا چاہا۔ "بس اور نہیں!!!"

بٹو کیوں کہ چھوٹا اور نا سمجھ تھا، اس لیے ضدی بھی تھا۔ وہ اس پر بضد تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ پراٹھا ضرور لے گا۔ ماں کا دھیان بار بار ختم ہوتے آٹے اور گھی پر جا رہا تھا۔ پراٹھے بنانے میں یہی تو مصیبت ہوتی ہے۔ چاہے پیٹ بھر جائے، نیت n0 نہیں بھرتی۔ آج سارا آٹا ختم کر دیا تو کل کا انتظام کہاں سے ہوگا؟ پھر ادھار۔ وہ بولی "جیبھ کی کھوائی پیٹ نہیں اٹنے دیتی۔ اپنے پیٹ کی سمائی دیکھ۔" ماں کی بات بٹو کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔ آخر ماں نے آٹے کی چھوٹی سی لوئی بنائی اور ایک

چھوٹا سا پراٹھا بنا کر اسے دے دیا۔ "میرا چھوٹا سا بیٹا اور اس کا چھوٹا سا پراٹھا۔"

بٹی کھا تو چکی تھی مگر بیٹھی تھی۔ کٹوری میں تھوڑی سی سبزی بھی بچی تھی۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ ماں بار بار نظر بچا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ چار پراٹھے سک چکے تھے، پانچواں بیل رہی تھی۔ بٹو وہ پراٹھا بھی ہڑپ کر گیا تھا۔ وہ ماں سے ایک پراٹھا اور مانگنے لگا۔ اس بار ماں نے سختی سے ڈانٹ دیا۔ جاتا ہے یا بتاؤں؟"

مارنے کو بیلن اٹھایا تو وہ نو دو گیارہ ہو گیا۔ بٹی ہنس دی۔ ماں کو بھی ہنسی آ گئی۔ دھیرے سے بولی، بہت شیطان ہو گیا ہے! پھر دھیرے دھیرے ست ہوتی گئی اور دکھ بھرے لہجے میں بولی، "ماں باپ کا نام اوڑھے سے کیا فائدہ!!، جو بچوں کو پیٹ بھر روٹی بھی نہ دے سکے۔ بانجھ ہوتی تو دھیرج رہتا کہ نہیں ہوئے۔ اے بھگوان! بچے دے تو ایسا مت کر کہ بچے پراٹھے جیسی چھوٹی چیز کو ترس جائیں اور آنچل سے آنسو پوچھنے لگی۔ بٹی چپ چاپ بیٹھی ماں کو دیکھ بھی رہی تھی اور بات بھی سن رہی تھی۔ پانچواں پراٹھا سک چکا تھا۔ اسے ماں نے ٹوکری میں رکھ دیا تو بٹی دھیرے سے بولی آٹا تو بچا ہے۔ ایک اور بنا دو۔"

ماں تھوڑی دیر اسی طرح چکلہ بیلن پر ہاتھ رکھے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ توا خالی جلتا رہا۔ گھی لگا ہونے کے سبب دھواں بھبھک کر اٹھ رہا تھا اور ماں کے منہ پر سے گذر رہا تھا۔ بٹی اپنے آپ ہی بولی: اس وقت نہیں کھاؤں گی، سویرے کے لیے رکھ دوں گی۔"

"ہم اتنے بڑے آدمی نہیں کہ بچوں کو ناشتہ کرا کے اسکول بھیجیں۔ دو وقت کی روٹی مل جائے تو بہت ہے۔ بار بار کھانے والے دوسروں کا حصہ بھی کھاتے ہیں۔ اپنے حصے پر ہی صبر کرنا چاہیے۔" بٹی کا چہرہ اتر گیا۔ آلو کا بچا ہوا جھول پی کر وہ اٹھنے لگی۔ اس کے اٹھنے کے انداز سے لگا کہ اس کے گھٹنے اسے اٹھنے نہیں دے رہے ہیں۔ ماں اسے اٹھتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اٹھ کر چلنے لگی تو ماں نے اسے پکارا۔ سن! وہ لوٹ آئی۔ ماں نے پانچواں پراٹھا اٹھا کر اسے دے دیا۔ "لے!!، بٹو کو مت بتانا۔ سوچا تھا تیرے بابو کو بھر پیٹ کھلا دوں گی۔ ویسے ان کی خوراک ہی اب کہاں رہی۔ پانچ تو بہت ہیں۔ چار ہی کھا لیں تو غنیمت ہے۔"

بٹی دوڑی دوڑی گئی اور کاغذ لا کر اس میں لپیٹ لیا۔ جس کوٹھری میں سب سوتے تھے، دبے پاؤں گئی اور پراٹھے کو چھپانے کی تدبیر کرنے لگی۔ زمین پر بستر بچھے تھے۔ بستر کیا، گدڑی ہی تھی۔ اس نے ہوشیاری سے چاروں طرف دیکھا، بٹو آس پاس کہیں نہیں تھا۔ جس طرف وہ سوتی تھی وہاں اس نے کاغذ میں لپٹا پراٹھا ٹھونس دیا۔ تھوڑی دیر اس پر بیٹھی رہی۔ اسے بیٹھے بیٹھے ہی محسوس ہوا کہ

پراٹھا ابھی گرم ہے۔ کل صبح اسکول جاتے ہوئے کھا کر جائے گی۔ اگر گرم نہیں بھی رہا تو ملائم تو رہے گا۔ پراٹھا کھا کر جانے میں کتنا مزہ آئے گا۔ کوئی کہے گا بھی کہ کچھ کھا لو تو کہہ دوں گی کہ گھر سے کھا کر آئی ہوں۔ پھر رک کر بدبدائی، آدھا اس کے لیے لے جاؤں گی۔ طعنہ دیتا تھا، کبھی کھلایا بھی کرو۔ پر آدھے کا کیا لے جانا! تو پھر پورا لے جاؤں گی۔ اس نے دوبارہ گدڑی اٹھا کر دیکھا۔ پراٹھا کاغذ میں لپٹا جوں کا توں رکھا تھا۔ اس کا دل نہیں مانا۔ اس نے اسے نکال لیا۔ کاغذ ہٹا کر دیکھا، چکنا ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیا سوچا کہ ایک طرف سے توڑ کر چٹ سے

کھا گئی۔ روکھا ہی مزہ دیتا ہے، بے کار ہی لوگ پراٹھا سبزی سے کھاتے ہیں۔ باقی اس نے کاغذ میں جلدی سے لپیٹا اور پھر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر وہ بغیر منھ چلائے اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی، پھر دھیرے دھیرے منھ چلانا شروع کیا۔ کافی دیر تک اسی طرح چلاتی رہی۔

بٹو ماں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اسے پھر بھوک لگی تھی۔ ماں اسے ڈانٹ رہی تھی۔ باپو آنے والے تھے۔ باپو شام کو لیمن جوس کی چھوٹی سی دکان لے کر سڑک کے کنارے

بورے پر بیٹھ جاتے تھے۔ آٹھ دس آنے مل گئے تو مل گئے نہیں تو ڈبا اور بوریا لے کر آٹھ بجے تک گھر آ جاتے تھے۔ باپو کے آنے کے وقت بٹی باہر نکل کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ جیسے ہی انھیں آتا دیکھتی تھی، ویسے ہی آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے سامان لے لیتی تھی۔ اس دن باپو تھوڑا جلدی آ گئے۔ وہ باہر جا کر سامان نہیں لے پائی۔ باپو نے آتے ہی پوچھا:

"آج بٹی کہیں گئی ہے کیا؟"

"نہیں تو"!! ماں نے کہا۔

باپو خود ہی بولے " لگتا ہے میں ہی آج جلدی آ گیا۔ "ماں نے کہا تو کچھ نہیں لیکن ہنس دی۔
باپو ہاتھ پیر دھونے میں لگ گئے۔ بیٹی نے جلدی سے تختہ بچھا کر لوٹا اور تھالی سجا دی۔ دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ باپو کو بھی پراٹھے پسند ہیں۔ پراٹھے دیکھ کر باپو بہت خوش ہوں گے۔ مل میں کام کرتے تھے تو تیسرے چوتھے دن پراٹھے بنوایا کرتے تھے۔ اچار کے ساتھ پراٹھا کھانا انھیں بہت اچھا لگتا تھا۔ تب ماں اچار بھی ڈال دیتی تھی۔ اب تو کبھی کبھار کام والے گھروں سے دو چار پھانکیں مانگ لاتی ہے۔
باپو کھانے بیٹھے۔ ماں نے سبزی اور پراٹھے پروسے تو اس کی آنکھوں میں خوشی جھلکتی پڑ رہی تھی لیکن باپو کو اپنی طرف بجھی بجھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پا کر اس کی خوشی دوپہر بعد کی دھوپ کی طرح سمٹتی چلی گئی۔
باپو دھیرے سے بولے "بٹی کی ماں!........، جملے کو ادھورا چھوڑ کر وہ کھانے میں لگ گئے۔
کھاتے کھاتے
بولے ''بہت گھی لگ گیا ہوگا ... پراٹھا کم بخت بہت گھی پیتا ہے۔ پانی میں بن سکتا تو سب کے منھ پڑ جاتا۔''
تھوڑی دیر بعد پھر پوچھا، بچوں نے کھائے یا نہیں؟ ماں نے گردن ہلا دی۔
جب دو چار لقمے لے لیے تو ماں نے بتانا شروع کیا۔ '' آج بٹی کو مار دیا۔ اس کی غلطی بھی نہیں تھی۔ بچے کو بھوک لگی ہو اور کھانے کو نہ ملے تو چلائے گا نہیں؟ وہ الٹا سیدھا بول گئی۔ بول کیا گئی، بھوک نے بلوا دیا۔ میں مار بیٹھی۔ بہت روئی بیچاری۔ رمی بابو کی بہو جی نے مہینے کے دس روپے دیے تھے۔ بہت روکا پر دل نہیں مانا۔ سوچا تمھیں بھی اچھے لگتے ہیں۔ بٹی اور بٹو بھی چاؤ سے کھاتے ہیں۔ ہمت کر کے جگاڑ بٹھا ہی دیا۔ " باپو چپ چاپ کھاتے رہے۔ چوتھا پراٹھا بھی انھوں نے لے لیا۔ کھا کر اٹھے تو دھیرے سے بولے، دیکھو آج کے یہ پراٹھے کتنے دن تک سہارا دیتے ہیں، اور ہلکی سی ہنسی ہنس دیے۔
"تم نے نہیں کھایا؟" ہاتھ دھو کر باپو نے پوچھا۔
"سویرے سے پیٹ نرم تھا، اس لیے بھات ڈال دیا ہے۔''
باپو نے ماں کی طرف دیکھا اور باہر نکل گئے۔ بٹو سو گیا تھا۔ بٹی غٹر غٹر سب دیکھ رہی تھی۔ اگلے

دن صبح باپو چوکیداری سے تھوڑی دیر ہوئے لوٹے تھے۔ اصل چوکیداری کا وقت تو پانچ ساڑھے پانچ بجے کا ہی تھا۔ آج کل پانچ بجے دن نکل آتا تھا۔ جن گھروں کی چوکیداری کرتے تھے، ان میں سے کوئی دودھ لانے کو کہہ دیتا تھا تو کوئی چائے کی پتی منگانے بھیج دیتا تھا۔ اس بہانے باپو کو بھی دو گھونٹ چائے مل جاتی تھی۔ کبھی کبھی باسی کوسی کھانا بھی دے دیتے تھے۔ کھانا باپو وہاں نہیں کھاتے تھے، گھر لے آتے تھے۔ ماں کو سویرے ہی چھ بجے سے پہلے گھروں کا کام نپٹانے کے لیے نکل جانا ہوتا تھا۔ بٹی اپنے آپ ہی تیار ہو کر جاتی تھی۔ بٹو یا تو سوتا رہتا تھا یا پھر اٹھ کر بہن سے جھگڑا کرتا تھا: "بھوک لگی ہے۔"

باپو اگر وقت سے آجاتے تو چائے والے مل جاتی تھی نہیں تو بٹی سات بجے تک بٹو کو گھر چھوڑ کر اسکول چلی جاتی تھی۔ اسکول جانا اسے پسند تھا۔ وہاں اسے کھلا پن لگتا تھا۔

بٹی صبح جلدی اٹھ گئی۔ اٹھتے ہی اس نے سب سے پہلے بستر ہٹا کر پراٹھا دیکھا۔ کاغذ میں لپٹا رکھا تھا۔ اس نے زیادہ ٹوہ نہیں کی، رکھا دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔ ٹٹی کے لیے چلی گئی۔ ٹٹی کے لیے اسے تھوڑا دور جانا پڑتا تھا۔ بم پولیس کی ٹٹیوں میں تو سویرے بھیڑ لگی ہوتی تھی، اس لیے فارغ ہونے گھاٹ پر چلی جاتی۔ بٹو تو وہیں نالی کے کنارے بیٹھ کر پھر لیتا تھا۔ بٹی اب تھوڑی بڑی ہو چلی تھی۔ لوٹ کر وہ جلدی جلدی نہائی۔ کتابیں جمع کیں۔ وہ اپنے اس فیصلے سے خوش تھی کہ چاہے اسے خود آج کھانے کو ملے نہ ملے، وہ دوست کو ضرور پراٹھا کھلا کر چھوڑے گی۔ اس دن اس نے ایسی بات کیوں کہی تھی؟ اس نے بٹو کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے سو رہا تھا۔ بہت سنبھل کر اس نے بستر ہٹایا۔ پراٹھا گم تھا۔ صرف کاغذ پڑا تھا۔ اس نے سوچا، ہو سکتا ہے پراٹھا نیچے کھسک گیا ہو۔ اس نے پورے کا پورا بستر پلٹ دیا۔ پراٹھا واقعی غائب تھا۔ کہاں چلا گیا؟ کون لے گیا؟ بٹو سو رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی اس نے آنکھیں کس کر بند کر لیں اور جیسے گہری نیند میں سو گیا۔

بٹی کو لگا جیسے اسے کسی نے بجلی کا کرنٹ چھوا دیا ہو۔ اس نے پوچھا، میرا پراٹھا تو نے کھایا؟ وہ سوتا ہوا بنا رہا۔ وہ اس کے پاس گئی اور زور زور سے اسے ہلانے لگی۔ اس نے آنکھیں کھول کر بٹی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے نیند میں ہو، اور آنکھیں بھینچ لیں۔

بٹی بار بار چلا رہی تھی: بولتا کیوں نہیں؟ تو نے میرا پراٹھا کھایا؟ بول، .... بول، بول! اس نے اس کے بال پکڑ کر کھینچنے شروع کر دیے۔ بال کھنچے تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ پوری طرح روہانسا ہو گیا تھا۔

بتا؟ پراٹھا کہاں گیا؟ وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔۔۔ بول بول!! تو نے میرا پراٹھا کیوں کھایا؟

وہ دھیرے سے بولا: "بھوک لگی تھی دیدی۔"

بٹی کو اور زور سے غصہ آ گیا۔ وہ اس کے اوپر چڑھ بیٹھی اور اس کی گردن پکڑ کر مارنے لگی۔ بٹو کو روتے روتے کھانسی آنے لگی، لیکن وہ رکی نہیں۔ باپو آ رہے تھے۔ ان کے ڈنڈے کی آواز دور سے سنائی دینے لگتی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر اٹھ گئی۔ اٹھ کر بٹو کی طرف دیکھا۔ بٹو کی زبان تھوڑی باہر نکل آئی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا اور زبان کو اندر کرنے میں لگ گئی"...

کہانی ختم ہوتے ہی ڈی سوزا کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ وہ ایسی ہی حساس تھی وہ اتنی ہی نرم دل تھی۔ سلی کو لگتا تھا یہ کتابیں ڈی سوزا کو ختم کر دیں گی

:مگر وہ اسے کتابیں پڑھنے سے روک نہیں سکتی تھی بلکہ وہ خود بہت شوق سے کتابیں پڑھتی تھی وہ دونوں آپس میں کتابوں کی کہانیوں کو ڈسکس کرتے کرتے رو پڑتی تھیں

ان دونوں کو ہی خبر نہیں تھی کہ ایک وقت آنے والا تھا جب وہ خود بھی ایک کہانی ایک کتاب کا حصہ بننے والی تھیں

میں نے کچھ دن پہلے ایک کتاب پڑھی تھی "باہمی امداد" "اور باہمی تعلقات"۔ وہ بولتی رہی ۔۔بے دریغ مسلسل۔

"میوچل ایڈ/ Mutual Aid (امداد باہمی) ایک مشہور روسی انارکسٹ پیٹر کروپوٹکین کی 1902 میں لکھی گئی کتاب ہے۔ کتاب اس وقت کے مروجہ تصور کو چیلنج کرتی ہے کہ مقابلہ اور جدوجہد ارتقاء کی محرک قوتیں تھیں۔ اس کے بجائے، پیٹر کروپوٹکین دلیل دیتے ہیں کہ تعاون اور باہمی امداد نے انسانی اور حیوانی دونوں معاشروں کی ترقی اور کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ پیٹر کروپوٹکین مزید لکھتے

ہیں کہ، مقابلہ بازی جنگل کا قانون ہے جب کہ باہمی امداد، باہمی تعلقات تہذیب کا راستہ ہے، پیٹر کروپوتکین کی یہ کتاب بہت شاندار ہے، اس میں مُشاہدہ کی بنیاد پر چیزوں کو دکھایا گیا ہے، جس میں چرند پرند، جانور، اور انسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ انسان اپنی زندگی خود مختاری اور باہمی امداد سے گزار سکتا ہے۔ اور یہی صورتحال ہی انسان کی زندگی، آزادی اور خوشحالی کی ضمانت دیتی ہے۔

باہمی امداد کمیونٹی کمیون) کی ایک شکل ہے، جہاں کسی علاقے میں لوگوں کے گروپس یا کمیونٹی ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں، وہ ہر مسئلے کو کمیونٹی کمیون کا مسئلا سمجھ کر باہمی امداد سے کام لیتے ہیں، مطلب جہاں کمیون کے لوگ سرکاری اداروں کی مدد کے بغیر کمیونٹی کی اہم ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔

اکثر اوقات بعض طبقوں کے لوگوں کے لیے حکومت کی فراہمی میں کوتاہی کی وجہ سے، باہمی امداد اجتماعی سماجی اور اقتصادی تعاون کا ایک ذریعہ ہے، باہمی امداد آسان الفاظ میں مشترکہ بھلائی کے لیے تعاون ہے۔

باہمی امداد اپنی تمام شکلوں اور اقسام میں ایک آفاقی (بے تعصب) عمل ہے، لیکن کسی بھی طرح سے ان کو ایک واحد تصور کے طور پر بیان کرنے کا مقصد نہیں ہے، باہمی امداد ایک پرانا عمل ہے جس نے جانوروں کی بادشاہی سے متعدد پرجاتیوں کے درمیان سماجی تعلقات کو نمایاں کیا ہے۔

ایک اصطلاح کے طور پر اس کا تصور سب سے پہلے روسی ماہرین فطرت اور ماہر حیوانیات نے کیا، سب سے مشہور (کارل کریسلر) کا مقالہ (دی لا آف میوچل ایڈ) اس تحقیق کا استعمال ڈارون اور سوشل ڈارونزم کے بیانیے کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا گیا تھا، جنہوں نے ارتقاء کے سب سے اہم عنصر کے طور پر صرف سب سے زیادہ موزوں کی بقا' پر توجہ مرکوز کی تھی،

اس تناؤ کی بنیاد پر پیٹر کروپوتکین نے انسانی فطرت کے نظریہ کو آگے بڑھایا جس کی جڑیں باہمی امداد میں تعاون پر مبنی ہیں، ارتقاء میں ایک عنصر پرندوں، اور دوسرے "ملنسار جانوروں" کے سفاکانہ سائبیرین ٹنڈرا کے بارے میں اپنے مشاہدے سے متاثر ہو کر، کروپوتکین نے تمام نامیاتی زندگی کو دیکھا جس کی تعریف کی اور باہمی نگہداشت کے خود مختارانہ باہمی تعلقات کے انتظام سے ہوتی ہے۔

کتاب کے چند اہم نکات یہ ہیں باہمی امداد کے ذریعے ارتقائکروپوتکین مختلف شعبوں جیسے بشریات، حیوانیات اور تاریخ سے ثبوت پیش کر کے "سب سے موزوں ترین کی بقا" کے ڈارون کے خیال کو چیلنج کرتا ہے۔ وہ دلیل دیتے ہیں کہ شدید مقابلے کے بجائے باہمی امداد اور تعاون پر جاتیوں کی ترقی اور بقا کے بنیادی عوامل رہے ہیں۔

جانوروں کی سوسائٹیاں: کروپوتکین جانوروں کی مختلف انواع کا معائنہ کرتا ہے، کیڑوں سے لے کر ستنداریوں تک، یہ واضح کرنے کے لیے کہ فطرت میں باہمی امداد اور تعاون کس طرح رائج ہے۔ وہ اس بات پر بحث کرتا ہے کہ جانور کیسے کمیونٹیز بناتے ہیں، وسائل کا اشتراک کرتے ہیں، ایک دوسرے کی حفاظت کرتے ہیں، اور شکاریوں کے خلاف اجتماعی دفاع میں مشغول ہوتے ہیں۔

انسانی معاشرے کروپوتکین نے اپنے تجزیے کو انسانی معاشروں تک پھیلایا ہے، جس میں پوری تاریخ میں تعاون اور باہمی امداد کی مثالوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ مقامی معاشروں، قرون وسطیٰ کے شہروں اور ایک کمیونٹی کے تمام اراکین کے فائدے کے لیے مل کر کام کرنے کے لیے انسانوں کے فطری جذبے کو تلاش کرتا ہے۔

ارتقائی فوائد۔ کروپوتکین کا استدلال ہے کہ تعاون ارتقائی فوائد پیش کرتا ہے، جو افراد اور معاشروں کی بقا اور ترقی کے امکانات کو بڑھاتا ہے۔ وہ اس تصور کو چیلنج کرتا ہے کہ انفرادی خود غرضی ہی واحد محرک ہے، جو سماجی جبلتوں کی اہمیت اور باہمی امداد کی فطری خواہش پر زور دیتا ہے۔

ریاست اور سرمایہ داری: کروپوتکین ریاست اور سرمایہ داری کے درجہ بندی کے ڈھانچے پر تنقید کرتے ہیں، جنہیں وہ باہمی امداد کی راہ میں رکاوٹ کے طور پر دیکھتا ہے۔ اس کا استدلال ہے کہ یہ نظام مسابقت، عدم مساوات اور مضبوط کے ذریعے کمزوروں کے استحصال کو فروغ دیتے ہیں، جس سے تعاون کی طرف فطری رجحان کو نقصان پہنچتا ہے۔

انارکسٹ پرسپیکٹیو: کتاب انارکسٹ تھیوری کے لیے ایک بنیادی متن کے طور پر کام کرتی ہے، رضا کارانہ تعاون، باہمی امداد اور طاقت کی وکندریقرت پر مبنی معاشرے کی وکالت کرتی ہے۔ کروپوٹکن

ایک ایسے مستقبل کا تصور کرتے ہیں جہاں لوگ خود کو آزادانہ طور پر قائم کردہ انجمنوں کے ذریعے منظم کرتے ہیں، یکجہتی اور اجتماعی بہبود کو فروغ دیتے ہیں۔

باہمی امداد ایک ارتقائی عنصر ہے، جتنی یہ زمین پرانی ہے، باہمی امداد اپنی تمام شکلوں اور اقسام میں ایک آفاقی عمل ہے، کیا اکیلا فرد ایک وقت کے لیے زندہ رہے گا؟ لیکن معمولی سی چوٹ یا بیماری کے ساتھ وہ جلد ہی فاقہ کشی یا شکاریوں کے سامنے دم توڑ جائے گا، پھر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ فطری یا انسان ساختہ آفات اکثر کمیونٹیز/کمیون کو اپنے وسائل کو اکٹھا کرنے کے لیے متحرک لمحہ بن جاتی ہیں۔

عام آفات کے دوران ایک سمندری طوفان، زلزلہ ایک ایسا رجحان ہے جسے رضا کارکنور جنس کہتے ہیں، جس کے تحت لوگ متاثرہ علاقوں میں جمع ہونے میں مدد کے خواہشمند ہوتے ہیں، بعض اوقات اتنے زیادہ لوگ اور اتنا عطیہ شدہ مواد ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انتظامی مسائل بھی پیدا کرتے ہیں، جیسا کہ 2017 میں (گرینفیل ٹاور) میں آگ کے دوران دیکھا گیا تھا،

ہر پیکٹ لائین کو حمایت کی ضرورت ہے، ہر ہڑتال کو حمایت کی ضرورت ہے، ہر کامریڈ باہمی امداد کی حمایت کا مستحق ہے، ایک نئی دنیا کے آغاز پر مشتمل باہمی امداد کا تصور کرنے کے بجائے، ہمیں موجودہ تنظیموں پر باہمی امداد کا اطلاق کرنا ہوگا، جو حقیقت میں ہیں۔

"مئی ڈے" میوچل ایڈ میڈیکل اسٹیشن' پہلی تشکیل تھی، اور اسی طرح، بلیک پینتھر پارٹی پیپلز فری میڈیکل کلینکس (1969 /1975) کے درمیان ہسپتالوں میں سیاہ فام لوگوں کے خلاف صحت کی عدم مساوات اور نظامی امتیاز کو دور کرنے کے لیے چلائی گئیں۔

(روسکا)

(روٹیٹنگ سیونگز اینڈ کریڈٹ ایسوسی ایشن)

دوسری صورت میں علاقائی طور پر کنڈیناس (میکسیکو)، ہگباد (صومالیہ)، سٹوک ویل (جنوبی افریقہ) سوسو (مغربی افریقہ اور کیریبین) ہوئی (چینی کمیونٹیز) پالو واگن (فلپائن) گامیہ (مصر) کائی کے نام سے جانا جاتا ہے، (جنوبی کوریا)، بنو موشیکو (جاپان)، پنڈیروس (برازیل)، کچوبال (گوئٹے

مالا)، جنٹاس، کوئینیلا یا پینڈ روس (پیرو)، اور بھی بہت مثالیں موجود ہیں۔

سٹرائیک فنڈز

ہڑتال کے فنڈز ٹریڈ یونینوں کے پاس رکھے گئے جو مالیاتی ذخائر ہیں، جو ہڑتال پر رہنے والے اراکین کو مادی مدد فراہم کرنے کے لیے موجود ہیں بعض اوقات طویل مدت کے لیے۔

بیل فنڈز قانونی معاونت امریکہ میں جہاں مشروط رہائی یا ضمانتیں منیٹائز کی جاتی ہیں، نیشنل بیل فنڈ نیٹ ورک جیسے ڈھانچے کمیونٹی بیل فنڈز کی ایک ڈائرکٹری کو مربوط کرتے ہیں، تاکہ ان لوگوں کی مدد کی جاسکے جو ان شرائط کو پورا کرنے کے متحمل نہیں ہیں، برطانیہ میں، 2010 میں طلباء کی تحریک پر بڑے پیمانے پر احتجاج اور پولیس کے جبر کے بعد مظاہرین کو قانونی مدد اور رہنمائی فراہم کرنے کے لیے گرین اور (بلیک کراس) کا قیام عمل میں آیا۔

"باہمی امداد" انارکسٹ فکر میں ایک اہم کام کے طور پر جاری ہے، جو اس خیال کو فروغ دیتا ہے کہ مقابلہ کے بجائے تعاون، انسانی اور حیوانی معاشروں میں ایک محرک قوت ہے۔ یہ اپنے وقت کے مروجہ نظریات کو چیلنج کرتا ہے اور ہماری سماجی اور ارتقائی تاریخ کی تشکیل میں باہمی امداد کی اہمیت کے لیے ایک زبردست دلیل فراہم کرتا ہے۔

اسی طرح جب ایک غیر ریاستی سماج کا قیام ہوگا، اس میں افراد میں مابین امداد باہمی کی مشترکہ تنظیمیں برسرعمل ہوں گی۔ اور مختلف انارکسٹ سماجوں کے درمیان امداد باہمی کا ربط قائم رکھیں گی۔ ان کی مثالیں جو چند اوپر دی گئی ہیں۔ اس سے مزید نکھرتے ہوئے وہ تمام سماج جو اس وقت قرہ ارض پر انارکسٹ یا غیر ریاستی سماج ہیں، ان میں امداد باہمی کا تصور اور عمل دخل ہے جو اس سارے معاملے کی شہادت دیتے ہیں۔"

اس نے کتاب کے مصنف کا سارا متن بیان کرنے کے بعد بھوک پر بولنا شروع کر دیا تھا

" کسی بھی معاشرے میں کوئی روٹی کے ایک ٹکرے کے لیے بھوک سے مرجائے یا کسی عزیز کی جان لے تو اس معاشرے کو باہمی امداد کا سبق کون سکھائے گا؟"۔

وہ ایک کہانی پڑھ کر اس قدر جذباتی ہو رہی تھی۔ سلی کو شام کا وہ بچہ ٹی وی پر بلکتا نظر آنے لگا جو رو پورٹر کے سوال پر کہہ رہا تھا

"میں اللہ سے تم سب کی شکایت کروں گا۔"

پھر اسے فلسطین کی ایک بچی کا خیال آیا جو بمباری سے برباد ہوئے گھر کے ملبے پے بیٹھ کر کہہ رہی تھی

"بھوک سے مجھے نیند نہیں آتی۔"

پھر اسے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ اپنے بھیانک خوف زدہ کرنے والے برے اور اچھے خواب

اسے لگا اس کا دل اب کہ پھٹ جائے گا

"بھوک ایک کہانی نہیں ہے۔ بھوک ایک حقیقت ہے۔ کسی بھی معاشرے مذہب یا ملک سے بالاتر بھوک کا درد مساوی ہے۔ ایک ہی جیسا آنتوں کو کھینچتا ہوا۔"

سلی نے اپنے آنسو صاف کیے

وہ دو لڑکیاں ان لوگوں میں سے تھیں جو کسی جانور کی بھوک نہیں دیکھ سکتی تھیں کسی انسان کی تو بہت دور کی بات ہے۔

پتھر کے پیچھے کھڑے وہ دو جوان ان دو چھوٹی سی دیہاتی لڑکیوں کی سوچ پر دم بخود تھے

میرا دل چاہتا ہے پیٹر کی یہ کتاب "امداد باہمی" پوری دنیا کے ناشروں سے چھپوا کر ایوانوں میں بھجوا دوں ان کو بتاؤں کہ کرہ ارض پے سب سے بڑا مسئلہ امن اور بھوک کا ہے۔"

اس کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔

❀ ❀

ناول سلسبیل کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 12 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 8

"انسان کا سب سے بڑا مسلہ بھوک ہے۔ بھوک ایک دائمی مسلہ ہے اسی بھوک سے تنگ آ کر لوگ اپنی زندگیوں کے ساتھ کھیل جاتے ہیں۔ بھوک بہت ازیت ناک ہے۔"

انسٹیٹیوٹ میں دو طالب علم ایک دوسرے سے بھوک پہ بات کر رہے تھے۔ سلی کی ان فلسطینیوں سے بہت اچھی سلام دعا ہو گئی تھی۔ ان کے روم بھی سلی کے برابر والی ہاؤس فراد کے گھر میں تھے۔

وہ اکثر ان کے پاس بیٹھنے لگی تھی۔

وہ دونوں لڑکے انقلابی ذہن کے تھے۔ ان میں ایک تو سلی کو نجانے کیوں "بہروپیا" لگتا تھا۔ یہ بات اس نے ڈی سوزا سے بھی کہی تھی۔

"یہ لائبریری والا بہروپیا لگتا ہے۔"

وہ دونوں فلسطینی خداداد اور ڈاکٹر ہشام کے دوست تھے کیونکہ وہ دونوں اکثر کیفے میں نظر آتے تھے۔

خطیب تو خداد کا گہرا دوست بن چکا تھا۔

جب ڈی سوزا اسے پانچواں پراٹھا سنا رہی تھی نجانے کس وقت وہ عربی جوان ان کے پیچھے نمودار ہوا تھا۔ وہ ان کے قریب بیٹھ گیا تھا پھر اس نے کہا۔

" کتابوں میں لکھی بھوک پر بات کرنا بہت آسان ہے۔" اس کی آنکھیں سرخ تھیں

"پیاری لڑکیو! تم کو کہانی پڑھنے اور سننے کا بہت شوق ہے؟ تو چلو میں تم کو ایک کہانی سناتا ہوں۔"

اس لڑکے خطیب نے سر پر سرخ رومال کو زور سے کسا۔

"اب تک آپ ایسی کہانیاں پڑھنے کے عادی ہوں گے، جن کا آغاز رومانوی قسم کے جملوں

سے ہوتا ہے۔

جیسے ”نرم اور خنک ہوا چل رہی تھی۔۔۔“

یہ ایک مہکتی ہوئی گلابی شام تھی۔۔۔“

”جب ہم آپس میں ملے تو۔۔۔“

تاہم میری کہانی کا آغاز اس خوب صورت روایت سے بالکل مختلف ہے۔ یہ میری زندگی کا ایک سیاہ ترین دن تھا جب ایک سانڈ جیسے پولیس افسر نے ہتھکڑیاں ڈال کر مجھے حوالات میں دھکیل دیا۔ مجھے جس تھانے میں بند کیا گیا، وہاں شدید سردی تھی، تھانے کے عملے کے چہروں سے بھی سرد مہری عیاں تھی۔ سچ پوچھیں تو مجھے بچپن ہی سے پولیس والوں کی شکل دیکھنے سے نفرت رہی ہے۔ انھیں بھی میرے جیسے بے گھر مزدور سے کیسے محبت ہوسکتی ہے۔ جوان کے کسی کام کا نہیں۔ اگر دیکھیں تو میرے زندہ دل اور بااخلاق ہونے کی وجہ سے زیادہ تر لوگ مجھ سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ انھیں میرا علم اور حِلم پسند ہے، لیکن ایک پولیس والا میرے جیسے عام آدمی کو کیسے ایک قابل ذکر شخصیت جان سکتا ہے۔

ہمارے علاقے کا پولیس اسٹیشن گاؤں کے مرکزی چوک میں واقع ہے۔ جس گلی سے مجھے گرفتار کیا گیا، وہ اس چوک سے تقریباً پانچ سو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ مکروہ اور کریہہ شکل والے پولیس افسر نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی اور دھکا دیتے ہوئے غصے سے چلایا!

”تیزی سے قدم اٹھاؤ“!!

مجھ سے چپ نہیں رہا گیا، میں نے جواب میں کہا۔

”مردِتم! اللہ تمھاری اپنی زندگی کا سفر تیز کرے، تاکہ موت کی منزل تک آسانی سے پہنچ سکو“

میری بات سن کر اس نے زور سے اپنی لات میری کمر پر رسید کی۔ اس کے بدلے میں، مجھ سے کچھ نہ ہو پایا تو انتقامی کارروائی کے طور پر میں نے بھی اپنی پیشانی اسی زور سے زمین پر دے ماری۔

”تمھیں کم از کم بدلہ لینے کا طریقہ مجھ سے سیکھنا چاہیے“

قانون نافذ کرنے والے غیر قانونی شخص نے مجھے ایک اور لات رسید کی۔ جوابی حملے کے

طور پر میں نے بھی اپنی لات زمین پر دے ماری۔

''کیا ہم سب مٹی کے بنے ہوئے نہیں ہیں؟ اور ہم نے کیڑے مکوڑوں کا رزق نہیں بننا؟''

میں نے زمین پر تھوکا اور اس جگہ کو اپنے پاؤں کی ایڑی سے مسل دیا۔

پولیس افسر نے میری ہتھکڑی کو مزید کس دیا، وہ سختی سے مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

میں نے پولیس والے کی شکل کو غور سے دیکھا۔ وہ مجھے بجمیری کا ہم شکل لگا۔ آپ بجمیری کو نہیں جانتے، یہ وہی شخص تھا جس کا میں نے فاقہ کشی کی حالت میں گدھا چرایا تھا، میں آسانی سے اپنا کام کر چکا تھا۔ وہ تو موت آئے اس کی بیوی کو جو بے وقت نیند سے بیدار ہوگئی اور اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ شور کی آوازیں سن کر لوگ اکٹھے ہوگئے اور میرا پول کھل گیا، تو میں یہ کہہ رہا ہوں: یہ پولیس والا بھی بجمیری کی طرح تنگ پیشانی والا تھا، بالکل جیسے کسی یتیم بچے کی تنگ پیشانی ہوتی ہے۔ میرے پاؤں کی انگلیاں میرے جوتوں سے باہر نکل رہی تھیں۔

یہ صورت حال میرے لیے خاصی پریشان کن تھی۔ میں وہاں سے فرار ہونے کا سوچنے لگا، میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ خدانخواستہ اگر میں فرار کی اس کوشش میں ناکام ہو جاتا تو پھر مجھے ساری عمر جیل میں گلتے سڑتے ہوئے گزارنا پڑنی تھی۔ میری بے گناہی سے کسی کو کوئی غرض نہ تھی۔ قانون اندھا ہوتا ہے اور عدالت بھی اس قانون کی پابند ہوتی ہے۔ ایک جج ہر معاملے میں تحریر شدہ دستاویزات کو سامنے رکھتا ہے، ثبوت مانگتا ہے، چاہے وہ جھوٹ کا پلندہ ہی کیوں نہ ہوں۔

میں چوں کہ پاگلوں کی جنت میں رہتا ہوں اس لیے مکمل طور پر اپنے حواس کھو چکا ہوں، اب مجھے اقراری مجرم قرار دے دینا چاہیے۔ کیوں کہ مجھے اب اپنے کسی بھی جرم کا اقرار کرتے ہوئے ذرا بھی خوف یا شرمندگی نہیں ہوتی۔ مجھے پانچ سال کی سزا تو اپنی پہلے جرم پر مل سکتی تھی، وہی گدھا چرانے کا جرم۔

دوسرا جرم یہ تھا کہ میں نے مُکا مار کر صرافہ بازار کے ایک سود خور جیولر کے اگلے دو دانت توڑ دیے تھے۔ اس نے اپنی دکان پر میری بیوی کی شادی کی رہن رکھی ہوئی سونے کی انگوٹھی واپس کرنے

سے انکار کر دیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ مجھے ادھار لی گئی رقم واپس کرنے میں کچھ تاخیر ہو گئی تھی لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا، میرے پولش نسل کے اسرائیلی مالک نے مجھے تنخواہ دینے میں اچھی خاصی تاخیر کر دی تھی ۔میرے اس جرم کی سزا بھی کم از کم پانچ سال ملے گی۔

اس وقت مجھے اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کی یاد بھی آ رہی تھی، مجھے ان دونوں سے سخت نفرت ہے۔ بچے سے خاص طور پر، کیوں کہ وہ سخت سردی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی پیدائش کے دوسرے ہی دن، مَیں ایک لانڈری سے بچوں کا اونی کمبل چراتے ہوئے پکڑا گیا تھا، لانڈری کے بڑی توند اور بھاری جیب والے مالک نے میرے خلاف شکایت کر دی تھی ۔اتنے بڑا جرم کی سزا کم از کم عمر قید تو ہوتی ہے۔

سچ پوچھیے تو میں اب پاگلوں کی طرح ہر جرم کو تسلیم کرنے کا عادی ہو چکا ہوں ۔اس وقت میری دلی خواہش تھی کہ اپنی بیوی سے ملوں اور اسے اس خفیہ جگہ کے بارے میں بتاؤں جہاں میں نے ان جرائم سے حاصل ہونے والا اربوں روپے کا مال چھپایا ہوا ہے، تاکہ وہ میری اسیری کے دنوں میں اپنی اور بچے کی کفالت کر سکے۔

پولیس اسٹیشن کا فاصلہ اب دو سو میٹر رہ گیا تھا۔ میں نے کنکھیوں سے پولیس افسر کی جانب دیکھا تو وہ بڑی حقارت سے میری ہی طرف متوجہ تھا۔ میں نے کسی میمنے کی طرح لجاجت سے گزارش کی:

’’کیا تم مجھ پر ایک احسان کر سکتے ہو، میں اس کے بدلے میں تمھیں دس پاؤنڈ دوں گا؟‘‘

’’مجھے میرے بیوی بچوں کی قسم میں اپنا وعدہ پورا کروں گا‘‘۔

’’مجھے تھوڑی دیر کے لیے گھر جانے دو، میں واپس آ جاؤں گا‘‘

’’تم ایک پولیس والے کو رشوت دے رہے ہو، اس کی سزا جانتے ہو؟ یہ تو بہت بڑا جرم ہے‘‘

یہ بات کر کے اس نے اپنی رفتار تیز کر لی۔ ہتھکڑی کی وجہ سے مجھے بھی تیز تیز چلنا پڑا۔

راستے میں سڑک پر گاڑیوں کا تیز شور تھا، فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والوں کی کثرت تھی۔

’’اوہ میرے خدا! بے جان مشینوں کو سڑکوں پر چلنے کی پوری آزادی ہے، ایک انسان ہے جو اس ملک میں نسل در نسل غلام بنا لیے گئے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم

کر دیا گیا ہوں۔ میری آزادی کی کوئی قدر نہیں، میری نجی زندگی سے کسی کو کوئی دل چسپی نہیں۔

میں عدالت میں موجود جج کو کیسے اس بات کا قائل کر سکوں گا کہ مجھے اس معاشرے نے مجبور اور پاگل بنا کر مجھ سے میری انسانیت چھین لی ہے۔

میں نے اپنی بیوی اور بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے گدھا چوری کیا، کیوں کہ میں پاگل تھا۔ میں نے اپنے شیر خوار بچے کو سردی کی شدت سے بچانے کے لیے کمبل چوری کیا۔ کیوں کہ میں پاگل تھا۔

میں نے لڑائی میں جیولر کے دو دانت اس لیے توڑ دیئے تھے کہ وہ اپنے پاس رہن رکھی ہوئی میری انگوٹھی واپس نہیں کر رہا تھا، اس دن وہ انگوٹھی بیچ کر میں اپنے گھر کا راشن لینا چاہتا تھا۔ میرے بیٹے کو سکول کی نئی وردی چاہیے تھی اور میری بیوی کا جوتا پرانا ہو کر بگھار ابن گیا تھا۔

ہم پولیس اسٹیشن کے قریب پہنچے تو میں پوری طرح اپنے مستقبل سے مایوس ہو چکا تھا، اب کوئی بھی یہاں میری ضمانت دینے کے لیے نہیں آئے گا، شاید میرے بیوی بچوں کو بھی مجھ سے ملنے کی اجازت نہ ہوگی۔ مجھے زندگی کے بچے کھچے دن ایک بدبودار قید خانے میں گزارنے پڑیں گے۔ تاریک اور ویران قید خانہ۔

میں خیالوں کے یہ تانے بانے بُن ہی رہا تھا کہ اچانک دور سے تیز روشنی چمکی جس سے ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ یہ ایک تیز رفتار کار کی ہیڈ لائٹس تھیں، جو بڑی تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ آن واحد میں وہ ہمارے قریب آن پہنچی۔ میں نے موقع دیکھتے ہی پولیس والے کو جو میرے آگے آگے چل رہا تھا، زور سے گاڑی کی طرف دھکا دیا۔ مجھے اس کی خوف ناک چیخ سنائی دی۔ تیز رفتار کار کی ٹکر سے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے ہتھکڑی اتاری اور تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔

اب میں ہتھکڑی سے زخمی ہونے والی اپنی کلائی پر مرہم پٹی کروانے کے لیے ہسپتال میں موجود ہوں، اور یہاں اپنے بیوی اور بچوں کا انتظار کر رہا ہوں۔"

اس کہانی میں بیوی بچوں کو حذف کر دو تو یہ خطیب کی کہانی ہے۔ اور خطیب میں ہوں ۔ اور میرے ماں باپ بہن بھائی اسرائیلیوں کے ظلم کا شکار ہو چکے ہیں۔ کہانی بیوی اور بچے کی جگہ میری ماں

تھی اور میری بہن اور چھوٹا بھائی ۔ میں آج بھی اس ہسپتال میں لیٹے فرضی آدمی کی طرح اپنے گھر والوں کا انتظار کر رہا ہوں "، اس کی سرخ آنکھیں بہہ رہی تھیں ۔ آج سلی کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ بہروپیا یہ لڑکا خطیب ہی تھا۔ اس کا انداز بیان بالکل ویسا ہی تھا

☆......☆......☆

شافیہ کو شاویز سے عجیب سا دھڑ کا لگا ہوا تھا۔

اسے لگتا تھا اس کی زندگی کی کہانی بس سمٹنے کے قریب ہے ۔ شاہ ویز کی اس میں دل چسپی بڑھ رہی تھی ۔ اس نے سوچا کہ وہ جی جی کو بتا دے ۔ تا کہ شاہ ویز کی والدہ تک بات پہنچ سکے مگر نجانے کیوں وہ ہر بار ڈر جاتی تھی

شاہ ویز کی گستاخیاں بڑھتی جا رہی تھیں ۔

وہ دیدہ دلیری سے شافیہ کا رستہ روک لیتا تھا اب تو اسے خداداد کا لحاظ بھی نہیں رہا تھا جب سے خداداد گیا تھا یوں لگتا تھا کالونی میں اب کو سربراہ ہی نہیں رہا

شاہ ویز کے انداز میں جارحیت نظر آتی تھی یا دولت کا گھمنڈ تھا۔ مارکیٹ سے واپسی پر جس طرح وہ شافیہ کی کلائی مروڑ کر زبردستی اسے کار میں بیٹھا کر کالونی لے آیا تھا تب سے شافیہ بہت خوف زدہ تھی

" آرام سے بیٹھ جاتی تو یوں سختی نا کرنی پڑتی ۔ " وہ اس کی سرخ کلائی کو دیکھ کر تاسف سے کہہ رہا تھا۔

" میڈم! میں نے تم کو کھا تو نہیں جانا تھا۔ " اس کو برا لگا۔

" ہم پڑوسی بھی تو ہیں ۔ جی جی کی وجہ سے میں تمہارا خیال رکھتا ہوں ۔ سنا ہے انہوں نے تم کو بیٹی بنا رکھا ہے ۔ " صاحب کے احسانات تو دیکھنے والے تھے،

" آپ کی کسی نے منت نہیں کی کہ خیال رکھیں ۔ " وہ بدتمیزی سے بولی تھی

" یہ دیدہ دلیری شریفوں کا شیوہ نہیں " ۔ شافیہ زہر خند تھی ۔

" اچھا ۔ " اس کا اچھا بہت معنی خیز تھا۔

"تم کو کس نے کہا میں شریف ہوں۔"

شاہ ویز مسکرایا تو شافیہ نے کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ جس طرح وہ زبردستی اسے کار میں گھسیٹ کر بیٹھا چکا تھا یہ بات شافیہ کے دماغ میں لوہے کی طرح پیوست تھی اس لیے جب وہ اترنے لگ ءتھی تو اس نے انتقاما شاہ ویز کے منہ پر گھونسہ دے مارا تھا وہ اس حملے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ اس لیے اسے ناک سے بہتا خون پونچھنا بھی یاد نہیں رہا اور شافیہ بھاگ کر اپنے فلیٹ میں گھس گئ تھی

جبکہ تنہائی میں اسے اپنے انتہائی اقدام سے خوف آرہا تھا

"اب کیا ہوگا؟

"وہ کیا کرے گا؟

معاف تو بلکل نہیں کرے گا؟

کچھ دن بعد اس نے انتقام انسانی جبلت اور جارحیت پر ایک فیچر پڑھا تھا جو اسے موت کی زردیاں دیکھا رہا تھا۔

انسان کی جبلت

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان ایک پرتشدد مخلوق ہے۔ گھریلو تشدد سے لے کر بڑے پیمانے پر عالمی جنگیں، یوں لگتا ہے جیسے جارحیت ایک بنیادی انسانی رویہ ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پرتشدد رویہ ہماری جبلت ہے؟ یا ہم اسے سیکھتے ہیں؟ تشدد تمام ہی انسانی معاشروں میں کسی نہ کسی صورت اور کسی نہ کسی سطح پر موجود ہے جب کہ تشدد، حملوں اور جارحانہ رویوں کی کئی وجوہات ممکن ہیں، مگر ایک شے شاید بہت واضح ہے اور وہ یہ کہ تشدد کسی نہ کسی صورت میں 'اطمینان' سے جڑا ہوا ہے۔ جس جس معاشرے میں تشدد سے اطمینان کا عنصر کم کیا جاتا رہے گا، وہاں پرتشدد رویوں کی شرح بھی اسی نسبت سے کم ہوتی جائے گی برطانوی فلسفی اور ریاضی دان ایلن ٹورنگ نے کہا تھا، " آپ جانتے ہیں کہ لوگ تشدد کیوں پسند کرتے ہیں؟ کیوں کہ تشدد کر کے لوگوں کو اچھا محسوس ہوتا ہے۔ تشدد سے لوگوں کو اطمینان ملتا ہے۔ آپ تشدد سے اطمینان نکال دیں، تو یہ سارا عمل خالی پن میں بدل جائے گا۔"

جدید عمرانیات میں انسان کو معاشرتی حیوان Social Animal قرار دیا گیا ہے۔ اس تصور کی بنیاد پر دو قسم کے افراد وجود میں آئے ہیں۔ علم البشریات anthropology کے مطابق بہترین انسانی اقدار کے لیئے کوشاں ہونا انسان کی جبلت میں شامل ہے ہر انسان چاہے وہ جس معاشرے کا بھی فرد ہو انسانیت کے جبلتی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور طبعی میلان بھی۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہ بہترین انسانی اقدار ناپید ہیں؟

انسانی زندگی کا آغاز غاروں اور جنگلوں سے ہوا ہے ننگے بدن اپنے زیست کی شروعات کرنے والے انسان نے اپنے بدن کو ڈھانپنے کیلیئے درختوں اور جھاڑیوں کے بڑے بڑے پتوں کا استعمال جب شروع کیا تو یہ دنیا میں عقل کا پہلا آغاز اور قدم تھا پھر اسی انسان نے جب اپنے شکم کی پیاس بجھانے کے لئے لیے اپنے سے تیز اور گھاس تک مختلف جانوروں کا شکار اپنے بنائے ہوئے نوک دار ہتھیار سے شروع کیا تو یہ عقل کے استعمال کا دوسرا قدم تھا اس کے بعد اس عقل نے جب اسی شکار کیے گے جانور کو کاٹنے کے لئے پتھر کا چاقو (پتھر کے اوزاروں کا پہلا استعمال تقریباً 25 سے 27 لاکھ سال قبل ایتھوپیا میں ہوا اور اس کے بعد یہ تکنیک آہستہ آہستہ دنیا کے باقی حصوں میں بھی پھیل گئی) اور پکانے کے لیے پتھر سے پتھر کو رگڑ کر آگ جیسی نعمت کا سراغ لگایا تو یہ عقل کا تیسرا قدم تھا اس کے بعد شکار کے دوران جب پہلا جنگلی انسان گر کر زخمی ہوا تو اس جنگلی فرد نے اپنا زخم ٹھیک کرنے کے لیے جب جڑی بوٹیوں سے اپنے زخموں سے رستے خون کو روک کر درد سے راحت پائی تو یہ انسان کا چوتھا بڑا قدم تھا اس ڈارک اتج میں کسے معلوم تھا کہ غار سے نکلنے والے یہ چند ایک قدم مستقبل میں آسمان کی وسعتوں میں چہل قدمی کرنے والے ستاروں کے سر پر پہنچ جائیں گے اپنے اس شروعاتی دور میں انسانی عقل نے مزید قدم اٹھا کر ثابت کیا کہ عقل نے اپنی ارتقائی منازل طے کرنا شروع کر دی ہیں اور اب راستے میں پڑھنے والی بڑی سے بڑی رکاوٹوں حادثات اور قدرتی آفات کو خاطر میں نہ لانے کا فیصلہ کر لیا ہے عقل تخلیق کار کی وہ دین اور نعمت ہے جس نے انسان کو دوسرے جانداروں اور دیگر مخلوقات میں اسے اشرف المخلوقات بنا کر ممتاز کر دیا ہے مگر اس قدیم ترین دور کی وہ یادگاریں اب تک

کسی نہ کسی شکل وصورت میں اس کی مذہبی سوچ کی عملی تفسیر "شعائر" کی صورت میں موجود ہے۔ اس موضوع پر ایک آرٹیکل"

کیا آپ انسانی جارحیت کی نفسیات سے واقف ہیں؟ میں لکھتے ہیں کہ انسان ظلم کیوں کرتے ہیں؟

انسان جنگیں کیوں لڑتے ہیں؟

کیا جارحیت انسان کی فطرت کا حصہ ہے؟

کیا قتل کرنا انسان کی سرشت میں شامل ہے؟ انسانوں کی جارحیت ماہرین بشریات' نفسیات اور سماجیات کے لیے ایک سوال ہے، ایک معمہ ہے، ایک بجھارت ہے، ایک پہیلی ہے اور ایک سنجیدہ مسئلہ ہے۔ اگر چہ جارحیت کے سوال کا کوئی تسلی بخش جواب اور اس مسئلے کا کوئی تسلی بخش حل ابھی تک نہیں ملا لیکن ایرک فرام نے، جو ماہر نفسیات بھی ہیں اور ماہر سماجیات بھی، اپنی کتاب THE DESTRUCTIVENESS HUMAN OF ANATOMY میں مختلف ماہر پماہرین کا موقف تھا کہ جارحیت انسان کی جبلت میں شامل ہے اور اسی جبلت کی وجہ سے انسان ظلم بھی کرتا ہے اور جنگیں بھی لڑتا ہے۔ لورنز اور مورس نے انسانی جارحیت کو اس کی فطرت اور جبلت سے جوڑا۔

ایرک فرام ان دونوں ماہرین کے نظریے سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ لورنز اور مورس دونوں ماہرین بشریات ہیں۔ انہوں نے مچھلیوں، پرندوں اور جانوروں پر تحقیق کرنے کے بعد جو نتائج اخذ کیے انہیں انسانوں پر بھی لاگو کر دیا۔ ایرک فرام کا کہنا ہے کہ انسان کی فطرت کو سمجھنے کے لیے ہمیں جبلت کے علاوہ اور بھی بہت سے محرکات کو سمجھنا ہوگا۔

ایرک فرام نے جس تیسرے ماہر کا نظریہ پیش کیا ان کا نام بی ایف سکنر تھا جو ایک بیہیورسٹ تھے۔ سکنر کا کہنا تھا کہ انسانی نفسیات کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس کے اعمال پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے کیونکہ ہم اس کے اعمال کو لیبارٹری میں ٹیسٹ کر سکتے ہیں۔ س کنر نے انسانی نفسیات کی تحقیق میں جذبات، خیالات اور نظریات کو نظر انداز کیا کیونکہ ہم انہیں ٹیسٹ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کا انسان کی داخلی زندگی سے تعلق ہے۔ ایرک فرام سکنر سے بھی اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر انسان کا ایک مخصوص

کردار ہوتا ہے اور اس کردار کو سمجھے بغیر ہم اس کے اعمال کے محرکات کو پوری طرح پرکھ نہیں سکتے۔

اریک فرام نے جس چوتھے ماہر کے خیالات اور تصورات پیش کیے ان کا نام سگمنڈ فرائڈ ہے۔

فرائڈ نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے آخری دور میں لکھا کہ انسان کی دو جبلتیں ہیں۔ زندگی کی جبلت اور موت کی جبلت اور انسان کی جارحیت کا تعلق اس کی موت کی جبلت سے ہے۔

Sigmund Freud

فرائڈ کا موقف تھا کہ انسان ساری عمر اپنی ذات کی شعوری اور لاشعوری جبلتوں اور خواہشوں میں تضاد محسوس کرتا ہے اور اپنی ذہنی صحت اور بلوغت کے حوالے سے فیصلے کرتا ہے۔ فرائڈ نے انسانوں کے شعوری فیصلوں کے ساتھ ساتھ اس کے لاشعوری محرکات کو بھی اہمیت دی اور انسانی جارحیت کی تفہیم میں گرانقدر اضافے کیے۔ اس کتاب میں پانچواں نظریہ خود اریک فرام کا اپنا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ انسان حیوان سے بہت مختلف ہیں۔ انہوں نے کہا کہ انسانوں میں دو طرح کی جارحیت پائی جاتی ہے۔ پہلی قسم کی جارحیت بینائن جارحیت BENIGN AGGRESSION ہے اگر کسی انسان پر کوئی حملہ آور ہو تو وہ اپنی جان بچانے لیے جارحیت کا اظہار کر سکتا ہے۔ یہ جارحیت جانوروں کی جارحیت کی طرح ہے، جانور جب بھوکا ہو تو وہ شکار کرتا ہے اور اس پر حملہ ہو تو وہ بھی جوابی کارروائی کے طور پر اپنی جان بچانے کے لیے حملہ آور ہوتا ہے۔ لیکن شیر سیر ہو چکا ہو اور اسے جنگل میں کوئی خطرہ لاحق نہ ہو تو وہ بھی بہت پر سکون رہتا ہے اور بے وجہ خون نہیں بہاتا۔

انسان کی دوسری قسم کی جارحیت زیادہ خطرناک جارحیت ہے اس لیے اریک فرام اسے میلگنٹ اگریشن MALIGNANT AGGRESSION کا نام دیتے ہیں۔ اس جارحیت کا انسان کی بقا سے کوئی تعلق نہیں۔ اس جارحیت کا تعلق انسان کی طاقت سے شہوت سے ہے۔ اس جارحیت کی وجہ سے وہ تشدد کرتا ہے۔ اس تشدد سے وہ دوسرے انسانوں کو کنٹرول کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی انا کی خاطر بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اپنے دشمن کو تباہ و برباد اور ذلیل و خوار کرنا چاہتا ہے۔ وہ اسے نیست و نابود کرنا چاہتا ہے۔ وہ دوسرے انسانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتا ہے ۔ اریک فرام کا کہنا ہے کہ انسان نے کچھ

ایسے نظریات تخلیق کیے ہیں جو جارحیت کو ایک آئیڈیل کے حصول کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ انسان نے ایسے آدرش بنائے ہیں جن کی خاطر وہ بڑے فخر سے نہ صرف اپنی جان دیتا ہے بلکہ اوروں کی جان لیتا بھی ہے۔ ایرک فرام کی نگاہ میں ایسے مذہبی نظریات اور سیاسی آدرش انسانیت کےمستقبل کیلیے خطرناک ہیں کیونکہ وہ جارحیت اور تشدد کو محترم، معزز اور مقدس بنا دیتے ہیں۔ ایرک فرام نے دو طرح کے انسانی کرداروں کا نظریہ پیش کیا۔ ایک کردار کو انہوں نے نیکروفلس کردار PHILOUS-NECRO CHARACTER کا نام دیا۔ ایسا کردار موت سے محبت کرتا ہے۔ اسے ظلم جبر اور تخریب کاری سے خوشی ملتی ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں ظلم کرتا ہے اور سماجی زندگی میں ظالمانہ سوچ اور جابرانہ طرز زندگی کے مقناطیس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ وہ فاشسٹ نظام کا حصہ بن جاتا ہے اور اپنے ظالم ہونے پر فخر کرتا ہے۔

دوسرے کردار کو انہوں نے بایوفلس کردار CHARACTERPHILOUS-BIO کا نام دیا۔ ایسا کردار زندگی سے محبت کرتا ہے۔ وہ آشتی کے قریب جاتا ہے اور دوسرے پرامن انسانوں کے ساتھ مل کر پرامن معاشرے تعمیر کرنیکی کوشش کرتا ہے۔ ایرک فرام کا کہنا ہے کہ ہمیں اپنے گھروں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایسا ماحول تعمیر کرنا چاہیے تاکہ ہمارے بچے جوان ہو کر نیکروفلس کردار اپنانے کی بجائے بایوفلس کردار اپنائیں تاکہ ہم سب اس کرہ ارض پر پرامن معاشرے قائم کرسکیں۔ انسانی ارتقا کا سفر ایک سست رو سفر ہے جس کے لیے ایک میراتھون رنر کی صبر و استقامت کی ضرورت ہے۔ انسانوں نے انفرادی اور اجتماعی طور پر فیصلہ کرنا ہے کہ انہوں نے موت سے محبت کرنی ہے اور ظلم اور جبر و تشدد کو گلے لگانا ہے یا زندگی سے محبت کرنی ہے اور امن و آشتی سے بغلگیر ہونا ہے۔ اسی فیصلے پر انسانیت کے مستقبل کا دارومدار اور انحصار ہے۔ ہاں اگر وہ انا کو قابو رکھتی غصے کو حاوی نا ہونے دیتی اور فطرت سے جنگ لڑتی تو یقینی طور پر شاہ ویز پے ہاتھ نا اٹھاتی۔

انسان اپنے جارحانہ رویوں پے قابو پا لے تو ایسے پچھتاوے سے بچ سکتا ہے جو اس وقت شافیہ کو گھیر رہا تھا

ساری رات اسے نیند نہیں آتی تھی۔ کچھ دن سے اس نے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ رکھا تھا ایک دن حسان سنہرے کا پیام بھی لایا تھا

"باجی! آپ کو میری بہن یاد کر رہی ہے۔"

اس پے پیام کو سن کر بھی شافیہ ڈر گئی تھی۔

کیا پتہ یہ پیام شاہ ویز کی طرف سے ہو

اسے بہت خوف آنے لگا تھا۔ وہ جی جی کے گھر جانا بھی ترک کر چکی تھی۔ جی جی کا فون تسلسل سے آنے لگا تھا

"شافی! تم کدھر ہو؟ کیوں نہیں آ رہی۔"

اور شافیہ بخار کے بہانے بنا دیتی تھی۔

اس گھونسے کے بعد شاہ ویز کا رویہ کیا ہو گا؟

یہ تصور ہی ہولناک تھا

شافیہ کوئی بہادر لڑکی نہیں تھی وہ ایک بزدل لڑکی تھی اور بہت زیادہ پر اعتماد بھی نہیں تھی۔ وہ سب غیر ارادتا تھا۔

اور اب اسے سوچ سوچ کر غم کھائے جا رہا تھا۔ وہ جس معاشرے میں رہتی تھی ایسی کوئی بہادری افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

آ بھی تو خواب دیکھنے محبت سمجھنے کی عمر تھی وہ کوئی بھی بدنامی کیسے افورڈ کر سکتی تھی

جب سمیرا جیسی سوتیلی ماں اور عرشیہ جیسی بہن تھی۔

رات کو بالکنی میں کھڑے ہو کر گہرا آسمان دیکھتے ہوئے وہ سخت دل برداشتہ تھی۔

The true harvest of my life is intangible—a little star dust caught, a portion of the ''have clutchedrainbow

Henry David Thoreau,

Life in the WoodsWalden, or, A

کل ملا کر میری زندگی کا اثاثہ

میرے پلو سے بندھی کچھ نایاب چیزیں

جنہیں چھو کر تو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔

مگر میرے دل سے صاف دکھتی ہیں۔۔

کھلے صحن میں لیٹ کر ستاروں بھرے آسمان سے چرا ء چھوٹی سی کہکشاں،

ہلکی بارش میں پہاڑ کے پیچھے سے جھانکتی مٹھی بھر قوس قزح

شام کے وقت بہت دور کسی گاؤں کے ایک کچے مکان کی چمنی سے اٹھتا دھواں

مجھے بے تحاشا ہنستے دیکھ کر تمہاری آنکھوں کی وہ چمک تمہارے جانے کے بعد میرے دل میں اترتی خاموشی بڑی انمول ہیں یہ سب

میری زندگی کا اثاثہ ہیں

اثاثہ سمجھتے ہو ناں؟

اس نے گہرے آسمان پہ سب سے چمکتے ستارے سے کہا تھا

یہ ستارہ کیا دور دیش

ہشام عیسیٰ کو شافیہ کا پیغام دے گا؟

شاہ ویز سے دشمنی لینا کچھ آسان نہیں تھا اور وہ اس گھونسے کو انا کا مسلہ بنا سکتا تھا اس میں کوئی دو رائے نہیں تھیں۔

اس کی ایک ہفتے کی غیر حاضری جی جی سے ناقابل برداشت تھی۔وہ ہر روز کال کر رہی تھیں تنگ آکر سمیرا نے بھی نوٹس لے لیا تھا۔

"تم جی جی سے ملنے کیوں نہیں جا رہی؟ اتنے دن سے وہ فون کر رہی ہیں۔"

سمیرا کا انداز نارمل بھی ٹوہ لینے والا معلوم ہوتا تھا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

شافیہ نے نگاہ چرا کر کہا تھا۔

"بظاہر تو ٹھیک لگتی ہو۔"

سمیرا نے گہری نظر سے دیکھا تھا وہ کچھ الجھی الجھی لگ رہی تھی

سمیرا کے لمبے چوڑے سوالوں سے بچنے کے لیے شافیہ گھبرا کر باہر نکل آئی تھی۔اب رستے میں شاہ ویز کا گھر تھا۔وہ جذبات میں نکل تو آئی تھی مگر آگے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔جس طرح وہ خوف سے زرد پڑتی جی جی کی کوٹھی میں جا رہی تھی اگر کوئی اسے دیکھ لیتا تو اس کی حالت زار پے رک کر سوال ضرور کرتا۔

وہ جیسے ہی ٹھنڈے ہال میں داخل ہوئی تھی ۔اسے جی جی کی بہت ہی نرم آواز سنائی دے رہی تھی۔وہ اپنے فون پر سے کچھ پڑھ کر سنا رہی تھیں۔

شافیہ رک سی گئی تھی۔

"قربانی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اپنا جانور زبح کر لیں۔"

شافیہ کو محسوس ہوا تھا وہ چند دن بعد بکرا عید کے حوالے سے بات کر رہی تھیں

"قربانی میں ایک خاص عشق تھا۔

وہ ہی عشق جو بے خطر آگ میں کود گیا تھا پھر وہ ہی عشق بیٹا زبح کرنے چل پڑا تھا۔یہ کوئی معمولی جذبہ نہیں تھا، عشق کچھ بھی کروا سکتا ہے۔"

وہ حضرت ابراہیم کی بات کر رہی تھیں۔شافیہ بھی سننے لگی تھی نجانے فون پر کون تھا؟

شاید ہشام تھا؟

"میں نے کچھ دن پہلے یہ پڑھا تھا۔میں تم کو سناتی ہوں۔"

وہ بڑی محبت سے بول رہی تھیں یا کوئی لکھا ہوا پڑھ کر سنا رہی تھیں،

"۔ ذرا غور کرنا ان الفاظ پر کہ اللہ کے نبیوں میں کیسا عشق اور قربانی کا جذبہ تھا۔"

جی جی اب جوش سے بول رہی تھیں۔

"آپ نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کبھی ایک بات نوٹ کی؟۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کی personality کے متعلق کافی کچھ بتایا ہے مثلاً دو جگہ تو یہ بتایا ہے کہ وہ ایک بہت ہی نرم دل کے مالک تھے، ایک بہت پیار کرنے والی شخصیت، ایک رحمدل انسان۔

(التوبہ 114:09، ھود 75:11)

لیکن اگر آپ میری طرح قرآن پاک کو سٹڈی کر رہے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن پاک میں ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی نظر آتا ہے۔

ایک متجسس شخصیت، ایک curious personality۔

مثلاً کبھی وہ ستاروں کی طرف دیکھ کر سوچتے ہیں کہ شاید یہ میرا رب ہے، لیکن پھر اسے غروب ہوتا دیکھ کر اس سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

(الانعام 76:06)

پھر کبھی وہ چاند کو چمکتا دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاید یہ میرا رب ہے لیکن وہ بھی غروب ہو جاتا ہے۔

(الانعام 77:06)

صرف یہاں تک ہی نہیں بلکہ جب وہ سورج کو نکلتا دیکھتے ہیں تو اس کی بارے میں بھی تجسس کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ تو سب سے بڑا ہے، شاید یہ میرا رب ہے لیکن بالآخر اسے بھی غروب ہوتا دیکھ کر اس سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ (الانعام 78:06)

آپ کچھ نوٹس کر رہے ہیں He is pondering, He is curious۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ نبوت کے بعد بھی ان کی curiosity، ان کا تجسس ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ مجھے مردے زندہ ہوتے دیکھنے ہیں (البقرۃ 260:02) اور

اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتے بھی ہیں کہ ابراہیم کیا تمہیں ایمان نہیں ہے؟ تو وہ آگے سے جواب دیتے ہیں کہ ایمان تو ہے لیکن اے اللہ میرے دل کو سکون آجائے گا۔ (البقرۃ 260:02)

اور پھر چار پرندے ذبح کر کہ پہاڑوں پر رکھنے والا واقعہ ہوتا ہے کہ جو زندہ ہو کر ان کے پاس بھاگتے چلے آتے ہیں۔ (البقرۃ 260:02)

لیکن اپنے اس پیٹرن میں مجھے جو سب سے خوبصورت بات نظر آ رہی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کے تجسس کو پورا کیا۔

ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات دکھادیں تاکہ اسے پورا یقین آجائے۔ (الانعام 75:06)

صرف ایک منٹ کے لیے امیجن کرو کہ انہوں نے کیا کیا مخلوقات دیکھ لی ہوں گی۔

اگر آپ امیجن نہیں کر پا رہے تو میں آپ کو ایک hint دے دیتا ہوں۔

عبدالرحمن بن عائش ایک تابعی تھے، انہیں یہ بات ایک صحابی نے بتائی کہ ایک مرتبہ ہم صبح کے وقت محمد الرسول اللہؐ کے پاس گئے تو دیکھا کہ آپ کے چہرے پر ایک حیرت انگیز سی خوشی اور چمک نظر آ رہی ہے۔

جب ہم نے پوچھا تو آپؐ نے ہمیں رات کو دیکھا اپنا ایک خواب سنایا کہ آج رات میں نے اپنے رب کو سب سے بہترین شکل میں دیکھا اور میں نے کہا کہ...

اے اللہ میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں! اور پھر اس نے اپنا ہاتھ میرے دونوں کندھوں کے درمیان اس طرح رکھا کہ مجھے اپنے سینے میں اس کی ٹھنڈک محسوس ہوئی اور اس وقت آسمانوں اور زمین کی ہر چیز میرے سامنے آگئی۔ (مسند احمد 8979)

اور یہاں تک بتانے کے بعد پھر آپؐ نے الانعام کی وہی آیت تلاوت کی (جو میں نے ابھی آپ کو بتائی) کہ ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور
زمین کی تمام مخلوقات دکھادیں تاکہ اسے پورا یقین آجائے۔

اور اب آپ امیجن کریں کہ ابراہیمؑ کو کون کونسی مخلوقات دکھا دی گئی ہوں گی۔

امیجن کریں کہ اس وقت ابراہیمؑ نے کیا کیا کچھ دیکھ لیا ہوگا کہ جس نے انہیں اتنا یقین دلا دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو بھی قربان کرنے لگے تھے۔

لیکن مزے کی بات کہ پیٹرن، یہاں break نہیں ہوتا۔

جس رات آپؐ معراج پر گئے تھے، اس رات کے لیے سورۃ نجم میں بالخصوص ایک آیت آئی۔

ایک ایسی آیت جو چھٹے اور ساتویں آسمان کے realm کے حوالے سے ہے۔

(سدرۃ المنتہیٰ اور جنت الماویٰ کے قریب) اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے کچھ نشانیاں دیکھ لیں۔ (النجم 18:53)

ساتویں آسمان کے اوپر وہ جگہ، جہاں بڑی بڑی نشانیاں موجود ہیں، آپؐ نے ایک اور شخص کو بھی دیکھا تھا۔ ایک ایسے نبی، کہ جو نشانیوں کے بارے میں بہت متجسس ہوا کرتے تھے۔۔۔ حضرت ابراہیمؑ۔

لیکن دلچسپ بات تو یہ ہے کہ پیٹرن یہاں بھی break نہیں ہوتا۔

حضرت ابراہیمؑ کے بیٹھنے کے posture پر غور کریں، آپؐ نے بتایا کہ وہ بیت المعمور کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ (مشکوۃ المصابیح 5863)

جیسے ایک مطمئن شخص، اپنے تمام تجسس پورے ہونے کے بعد ٹیک لگا کر سکون سے بیٹھا ہو۔ یاد ہے انہوں نے ہی تو وہ دعا مانگی تھی کہ اے اللہ، مجھے کوئی بڑی نشانی دکھا دے تا کہ میرے دل کو سکون آ جائے۔

اور اس وقت بڑی بڑی نشانیوں والی جگہ پر وہ کیسے پرسکون ہو کر ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔

لیکن میرا پیٹرن یہاں بھی break نہیں ہوتا۔

اس تھریڈ کا آغاز میں نے ابراہیمؑ کی شخصیت کے ایک خاص پہلو سے کیا تھا جس کی اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ تعریف کی ہے کہ ابراہیمؑ ایک بہت نرم دل انسان تھے، ایک مخلص دل والے انسان۔

لہٰذا ساتویں آسمان کے اوپر انہیں ایک ایسا چارج دیا گیا جسے واقعی ایک نرم دل والا انسان ہی کر سکتا ہے۔

امام بیہقی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں معراج کی رات کا واقعہ بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ وہ واقعہ ہے کہ جس کے اندر مجھے اپنا پیٹرن پورا ہوتا ہوا ملا۔

کہ جب آپؐ نے حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا تو اس وقت ان کے پاس بہت سارے چھوٹے چھوٹے بچے بھی کھیل رہے تھے، یہ ان بچوں کی روحیں تھیں جو بہت چھوٹی عمر میں ہی فوت ہو جایا کرتے ہیں اور یہ وہ بچے ہیں جن کی روحیں ایک بہت ہی نرم دل نبی کے پاس ساتویں آسمان پر کھیلنے چلی جاتی ہیں۔

وہ نرم دل نبی جو اپنے تمام تجسس پورے ہونے کے بعد پر سکون ہو کر بیت المعمور کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔

ایک ایسے درخت کے نیچے کہ جس کے پتے چراغوں جیسے ہیں۔"

وہ خاموش تب ہوئی تھیں جب ان کی نظر شافیہ پر پڑی تھی وہ بے آواز رو رہی تھی اس کے آنسو اس قدر تیزی سے گر رہے تھے کہ جی جی اپنی بات بھول گئی تھیں۔ انہوں نے ہشام سے کہا تھا

"اچھا بیٹا! میں بعد میں بات کرتی ہوں۔"

انہوں نے فون بند کر دیا تھا اور اپنی بانہیں شافیہ کے لیے کھول دی تھیں۔

شافیہ تیزی سے آگے بڑھی تھی اور ان کی کھلی بانہوں میں سما گئی تھی

محبت ایسا ہی لازوال جذبہ ہے یہ دلوں کو تقویت دیتا ہے۔ مردہ روحوں کو شوق سفر عطاء کرتا ہے آج وہ اپنے بیٹے کو یہی بات سمجھا رہی تھیں۔

انہوں نے شافیہ کی غیر حاضری پہ کوئی سوال نہیں اٹھایا تھا ان کو لگ رہا تھا کہ وہ اداس ہے اپنے کچھ مسلوں میں الجھی ہوئی ہے۔ اور کسی ایسے رستے کی تلاش میں ہے جو اس کو منزل تک پہنچا دے۔

اس کو رستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا اور وہ کسی کا ہن کو پہچان بھی نہیں پا رہی تھی۔

اس کے ارد گرد ایسے لوگ تھے جو اس کے مسلے حل نہیں کر سکتے تھے

وہ اسے گفتگو سے بہلاتی رہی تھیں۔ ان کے پاس بے شمار قصے تھے جو کسی بھی مایوس انسان کے لیے روشنی کی کرن بن سکتے تھے

جی جی نے کہا

"جب میں ہشام کو کوئی قصہ سناتی ہوں وہ بلکل ہمہ تن گوش ہو کے سنتا ہے۔وہ کہتا ہے میں اس قصے کا کردار بن جاتا ہوں۔"

"یہ سچ ہے جی جی! آپ کا انداز بیان ہی ایسا ہے۔" شافیہ نے تائید کی تھی

"اب الجھن کیا ہے؟"۔

انہوں نے محبت سے پوچھا

"سمجھ نہیں آتی کس رستے کی طرف چلوں؟۔"

اس نے اپنے دل کی گرہ کھول دی تھی،

"خود کو آزاد چھوڑ دو۔اس وقت تک جب تک تمہارا رہنما سامنے نہیں آجاتا۔کوئی ایسا کاہن جو تم کو بھٹکائے نہیں۔"

''ایک بات تو طے ہے مجھے اسود جیسا کوئی رشتہ منظور نہیں۔" اس نے بالکل اچانک کہہ دیا تھا

جی جی تسلی سے اسے دیکھتی رہی تھیں

وہ اس کے بال سہلا رہی تھیں۔

"میں تم کو ایک قصہ سناتی ہوں۔۔"

وہ اس کا جی بہلاتے ہوئے بولی تھیں

''اصل میں دنیا کا واحد گناہ جہالت ھے"۔

انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"ایک چھوٹا لڑکا بھاگتا ھوا "شیوانا" (قبل از اسلام کے ایران کا ایک مفکّر) کے پاس آیا اور کہنے لگا" .. میری ماں نے فیصلہ کیا ھے کہ معبد کے کاھن کے کہنے پر عظیم بُت کے قدموں پر میری چھوٹی معصوم سی بہن کو قربان کردے . آپ مہربانی کر کے اُس کی جان بچادیں" ..

شیوانا لڑکے کے ساتھ فوراً معبد میں پہنچا اور کیا دیکھتا ھے کہ عورت نے بچی کے ھاتھ پاؤں

رسیوں سے جکڑ لیے ہیں اور چھری ہاتھ میں پکڑے آنکھ بند کیئے کچھ پڑھ رہی ہے .. بہت سے لوگ اُس عورت کے گرد جمع تھے اور بُت خانے کا کاھن بڑے فخر سے بُت کے قریب ایک بڑے پتّھر پر بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا .. شیوانا جب عورت کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ اُسے اپنی بیٹی سے بے پناہ محبت ھے اور وہ بار بار اُس کو گلے لگا کر والہانہ چوم رہی ھے مگر اِس کے باوجود معبد کدے کے بُت کی خوشنودی کے لئے اُس کی قربانی بھی دینا چاھتی ھے ..

شیوانا نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیوں اپنی بیٹی کو قربان کرنا چاہ رہی ھے .. عورت نے جواب دیا" .. کاھن نے مجھے ھدایت کی ھے کہ میں معبد کے بُت کی خوشنودی کے لئے اپنی عزیز ترین ھستی کو قربان کر دوں تا کہ میری زندگی کی مشکلات ھمیشہ کے لئے ختم ھو جائیں" ..

شیوانا نے مسکرا کر کہا" .. مگر یہ بچّی تمہاری عزیز ترین ھستی تھوڑی ھے ..؟ اِسے تو تم نے ھلاک کرنے کا ارداہ کیا ھے .. تمہاری جو ھستی سب سے زیادہ عزیز ھے وہ تو پتّھر پر بیٹھا یہ کاھن ھے کہ جس کے کہنے پر تم ایک پھول سی معصوم بچّی کی جان لینے پر تُل گئی ھو .. یہ بُت احمق نہیں ھے .. وہ تمہاری عزیز ترین ھستی کی قربانی چاھتا ھے .. تم نے اگر کاھن کی بجائے غلطی سے اپنی بیٹی قربان کر دی تو یہ نہ ھو کہ بُت تم سے مزید خفا ھو جائے اور تمہاری زندگی کو جہنّم بنا دے" ..

عورت نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بچّی کے ھاتھ پاؤں کھول دیئے اور چھری ھاتھ میں لے کر کاھن کی طرف دوڑی مگر وہ پہلے ھی وھاں سے جا چکا تھا .. کہتے ھیں کہ اُس دن کے بعد سے وہ کاھن اُس علاقے میں پھر کبھی نظر نہ آیا ..

*دنیا میں صرف " آگاھی " کو فضیلت حاصل ھے اور واحد گناہ " جہالت " ھے .. جس دن ہم اپنے " کاھنوں " کو پہچان گئے ہمارے مسائل حل ھو جائیں گے۔"

انہوں نے پیار سے پوچھا

"تم اپنے کاہن پہچان جاؤ گی پھر تمہارے دل میں کوئی غم کوئی فکر نہیں رہے گا۔تم تھوڑا دوستوں میں وقت گزارو اس بچی سنہرے کے پاس چلی جایا کرو۔وہ اچھی بچھی ہے تمہارے مزاج کی ہے،"

وہ اس کو سمجھا رہی تھیں مگر سنہرے کے ذکر کے ساتھ شاہ ویز کا ذکر بھی تو آتا تھا شافیہ کا دل بیٹھ گیا۔

شافیہ چاہ کر بھی جی جی کو اس واقعہ کی خبر نہیں دے سکی تھی۔

کاش کہ وہ ان سے ذکر کر دیتی ہماری زندگی میں بہت سارے کاش حسرت بن کر رہ جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

خطیب کبھی کبھی بہت اداس ہو جاتا تھا، یہ بات خداداد نے بہت دفعہ نوٹ کی تھی

جرمنی کی اس دودھیا سویر میں جب وہ کلاس لے رہے تھے اور ان کے ٹیچر ان کو گوئٹے کی وہ نعت سنا رہے تھے جس کے بارے میں خداداد کو بھی علم نہیں تھا۔

پوری کلاس میں سکوت طاری تھا جب ان کے ٹیچر نے بتایا

"تم میں سے بہت ہی کم لوگوں کو پتہ ہو گا کہ گوئٹے نے مسلمانوں کے پیغمبر کے لیے ایک نعت لکھی تھی۔"

ٹیچر کے بتانے پر خداداد

اور خطیب جیسے سحر زدہ رہ گئے تھے۔

ان کے ٹیچر کہہ رہے تھے

"یہ نعتِ رسولِ کریم ﷺ ہے اس کو گوئٹے نے لکھا۔

گوئٹے سے تو تم میں سے بہت سے واقف ہیں۔ لیکن اس نے ایک نعت مبارکہ بھی کہی اس کا شاید بہت کم احباب کو علم ہو گا۔ آج میں نے پڑھی تو فوراً آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ گوئٹے نے نعت جرمن زبان میں لکھی تھی۔ جرمن سے انگلش میں ترجمہ ہوا اور انگلش سے ڈاکٹر شان الحق حقی نے اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ یہ نعت اور یہ ترجمہ خاصے کی شے ہے۔" ان کے جرمن ٹیچر بڑی عقیدت سے ذکر محمد ﷺ کر رہے تھے۔

"نغمہ محمدؑ

شاعر جان وولف وین گوئٹے

اس کا انگلش ترجمہ ایملی ایزسٹ نے کیا ہے۔

Song for Mohammed

Johann Wolfgang von Goethe By

Behold this rocky spring,
bright with joy
like a twinkling star;
above the clouds
its youth was nourished
by good spirits
among the cliffs in the bushes.
Fresh as a youth
it dances out of the cloud
down to the marble rocks,
cheering again
to the sky.
Along mountainous paths
it chases after colorful pebbles,
and with the step of a young leader
springs journey-its companion
with it onward.
Below in the valley
flowers appear from its footprints,
and the meadow
derives life from its breath.

But no shaded valley can stop it,
no flower,
clasping its knees
:and imploring it with loving eyes
toward the Plains it presses its course,
twisting like a snake.
Brooks nuzzle up
sociably. Now it treads
into the Plain, resplendent with silver,
and the Plain grows silver too,
and the rivers of the Plain
and the brooks of the mountains
!"Brother:cheer and shout
Brother, take your brothers with,
take them with you to your ancient father,
to the eternal ocean,
whose outstretched arms
await us,
has opened them in vainwho, ah
to embrace his yearning children;
for the bleak wasteland's
the sun abovegreedy sand devours us;
a hillsucks up all our blood;
Brother, !clogs us into a pool
take your brothers from this Plain,

take your brothers from the mountains,
!take them with you to your ancient father
-!Come all of you
swells the spring and now
an entire race more grandly
!lifts the prince up high
And in rolling triumph
it gives names to the lands and cities
that grow in its path.
Irresistibly it rushes onward,
tipped towers-leaving a wake of flaming
creations-and houses of marble
of its bounty.
Like Atlas it bears cedar houses
upon its giant's shoulders;
over its head, the wind noisily
blows a thousand flags
as testimony of its glory.
And so it brings its brothers,
its treasures, its children,
effervescent with joy,
to the waiting parent's bosom.
Translation from German to English
by Emily Ezust

"نغمہءِ محمدی

وہ پاکیزہ چشمہ

جو اوجِ فلک سے چٹانوں پہ اترا

سحابوں سے اوپر بلند آسمانوں پہ جولاں ملائک کی چشم نگہداشت کے سائے سائے

چٹانوں کی آغوش میں عہد برنائی تک جوئے جولاں بنا

چٹانوں سے نیچے اترتے اترتے

وہ کتنے ہی صد رنگ اَن گھڑ خزف ریزے

آغوشِ شفقت میں اپنی سمیٹے

بہت سے سسکتے ہوئے رینگتے، سُست کم مایہ سوتوں کو چونکاتا، للکارتا ساتھ لیتا ہوا خوش خراماں چلا

بے نمو وادیاں لہلہانے لگیں

پھول ہی پھول چاروں طرف کھل اٹھے

جس طرف اُس ﷺ کا رخ پھر گیا

اُس ﷺ کے فیضِ قدم سے بہار آ گئی

یہ چٹانوں کے پہلو کی چھوٹی سی وادی ہی کچھ

اُس ﷺ کی منزل نہ تھی

وہ تو بڑھتا گیا

کوئی وادی، کوئی دشت، کوئی چمن، گلستاں، مرغزار

اُس ﷺ کے پائے رواں کو نہ ٹھہرا سکا

اُس ﷺ کے آگے ابھی اور صحرا بھی تھے

خشک نہریں بھی تھیں، اُترے دریا بھی تھے۔

سیلِ جاں بخش کے، اُس ﷺ کے سب منتظر

جوق در جوق پاس اُس ﷺ کے آنے لگے
شور آمد کا اُس ﷺ کی اٹھانے لگے
راہبر ﷺ ساتھ ہم کو بھی لیتے چلو
کب سے تھیں پستیاں ہم کو جکڑے ہوئے
راہ گھیرے ہوئے، پاؤں پکڑے ہوئے
یاد آتا ہے مسکن پرانا ہمیں
آسمانوں کی جانب ہے جانا ہمیں
ورنہ یونہی نشیبوں میں دھنس جائیں گے
جال میں اِن زمینوں کے پھنس جائیں گے
اپنے خالق کی آواز کانوں میں ہے
اپنی منزل وہیں آسمانوں میں ہے
گرد آلود ہیں پاک کر دے ہمیں
آ، ہم آغوشِ افلاک کر دے ہمیں
وہ رواں ہے، رواں ہے، رواں اب بھی ہے
ساتھ ساتھ اُس کے اک کارواں اب بھی ہے
شہر آتے رہے شہر جاتے رہے
اُس ﷺ کے دم سے سبھی فیض پاتے رہے
اُس ﷺ کے ہر موڑ پر ایک دنیا نئی
ہر قدم پر طلوع ایک فردا نئی
قصر ابھرا کیے خواب ہوتے گئے
کتنے منظر تہہِ آب ہوتے گئے

شاہ اور شاہیاں خواب ہوتی گئیں
عظمتیں کتنی نایاب ہوتی گئیں
اُس ﷺ کی رحمت کا دھارا ہے اب بھی رواں
از زمیں تا فلک
از فلک تا زمیں
از ازل تا ابد جاوداں، بیکراں
دشت و در، گلشن و گل سے بے واسطہ
فیض یاب اس سے کل
اور خود کل سے بے واسطہ۔"

ان کے ٹیچر بھی مسحور ہو چکے تھے۔ پوری کلاس سحر زدہ تھی وہ دو لڑکیاں سلسبیل اور ڈی سوزا بھی گم صم بیٹھی تھیں۔

قسط نمبر9

"مجھے بھی یقین ہے اس کے پیچھے کوئی راز ہوگا۔"

"اچھا تم وہم نہیں کرو۔"

سلسبیل نے پھلوں کی ٹوکری کو چشمے کے پانی سے دھویا اور ایک بڑے پتھر پر خشک ہونے کے لیے رکھ دیا۔ جب وہ پیچھے مڑی تو کیا دیکھتی ہے کہ قریب ایک چکنا کارڈ پڑا ہوتا ہے جس کے اوپر ڈچ میں ایک تحریر لکھی ہوتی ہے

"میری تم سے بات ہو یا نہ ہو
فرق ہی کیا پڑتا ہے
تمہارے سخن میں اک دیرینہ دوست کی طرح
ہمدردیوں کے دریا بہتے ہیں
اور میرے وجود کے تمام ساکت آہنگ
تھرتھراتے نغموں میں ڈھل جاتے ہیں
تمہارے جانے سے یوں لگتا ہے
جیسے اچانک پڑنے والی شدید ضرب نے
ایک ہی جھٹکے میں بڑی آسانی کے ساتھ
تعلق کی تمام ڈوریں کاٹ کر رکھ دی ہوں
کیوں نہ تمہاری رمز بھری خاموشی کے

اس انمول تحفے کو امر کر لیا جائے
سو اب تم خاموش ہی رہو کچھ مت کہو،
لوگ بہت سیانے ہیں
باتوں سے خیالات کو جانچ لیتے ہیں
جیسے سیاہ اُڈتے بادلوں کی تاریکی
طوفان کی آمد کا پتہ دیتی ہے
میرے نزدیک دن کی اہمیت
اس کے مقصد اور مزاج سے ظاہر ہوتی ہے
جیسے بارش محسوس کرتے ہیں
چناروں کے پتے اک نئی سج دھج کے ساتھ
جنگل میں جگمگا اُٹھتے ہیں۔"

"ارے یہ کون ہوسکتا ہے؟" سلسبیل کے لبوں پے مسکراہٹ تھی

اس کے نیچے بھی کچھ تھا۔ایک پیکٹ جس میں کتابچہ تھا، جس کے فرنٹ پے بھی کچھ لکھا تھا:
۔شاید کسی مترجم کی تحریر تھی یا کسی لکھاری کے جذبات تھے۔

"پہلے اس چہرے کا ذکر جو بہت زخموں کی طرح کھینچے لمبی لکیروں کی وجہ سے لمبا ہو گیا تھا۔لکیریں جنھیں اسکی بے خواب راتوں نے کھینچا تھا۔بری طرح صفا چٹ چہرہ جس پر وقت کی مار صاف دکھائی دیتی تھی۔اس پر درج کرب کے گہرے زخم کو واضح طور پر پڑھا جا سکتا تھا جسے پھر سے سبز کرنے کی لیئے ہاتھ کا کوئی اشارہ یا بڑی نگاہ کافی تھی۔وہ اجالے سے کتراتا دن کا اجالا ہو یا رات میں لیمپ کا، یہاں تک کہ پورے چاند کی روشنی سے بھی وہ بچتا۔اجالا اسے ننگا کر دیتا۔اسکی جلد کو چھید کر اسکی داخلی پشیمانی اور اس کے نہ بہنے والے آنسوؤں کو اجاگر کر دیتا۔وہ اجالے کو اپنے جسم پر آگ کی لپٹ کی طرح گزرتے محسوس کرتا۔لگتا روشنی کی وہ آگ اس کے مکھوٹے کو جلا ڈالے گی۔اسے یہ بھی لگتا

کہ روشنی ایک دھاردار چاقو کی طرح ہے جو رفتہ رفتہ اسکے اس دبیز نقاب کو پھاڑ رہا ہے۔اس نقاب کو جو اسکے اور دوسروں کے درمیان دوری بنائے رکھتا تھا۔بغیر اس حفاظتی دوری کے وہ اُن لوگوں کے درمیان ننگا اور بے بس ہو جاتا جو اپنے دلوں میں اضطراب،شک اور کبھی نفرت کے لئے مسلسل اس کا پیچھا کر رہے تھے۔کیونکہ ان لوگوں کے لئے اس چہرے پر چھائی خاموشی اور واضح ہوتی ذہانت کو برداشت کرنا مشکل تھا۔ان کے لئے اس کی پراسرار موجودگی برداشت کے باہر تھی۔"

اس کو اب عجیب سی بے چینی ہونے لگی تھی

"اور میں تو وہ ہی ہوں جس کو تمہاری تلاش تھی۔"

اگلے الفاظ سلسبیل کی روح کھینچنے کو کافی تھے۔

اس سے آگے پڑھنا مشکل تھا مگر وہ پڑھ رہی تھی

"شاعر: پابلو نیرودا، نظم: دور مت جانا، مترجم: یونس خان

دور مت جانا

دور مت جانا، ایک دن کے لیے بھی نہیں، کیونکہ
کیونکہ —— میں نہیں جانتا کہ اسے کیسے کہنا ہے: ایک دن طویل ہے۔
اور میں آپ کا انتظار کروں گا، جیسا کہ ایک خالی اسٹیشن پر
ٹرینیں کہیں اور کھڑی ہوتی ہیں، گہری نیند میں۔

مجھے ایک گھنٹے کے لیے بھی چھوڑ کر مت جانا، کیونکہ
پھر غم کی چھوٹی چھوٹی بوندیں سب ایک ساتھ چلیں گی
دھواں جو گھر کی تلاش میں منڈلا رہا ہے وہ ڈھیر ہو جائے گا
میرے اندر، میرے کھوئے ہوئے دل کو دباتے ہوئے۔

اوہ، آپ کا ساحل سمندر پر بنا تصویری خاکہ کبھی تحلیل نہ ہو

تمہاری پلکیں کبھی کھو کھلے فاصلے پر نہ پھڑ پھڑائیں

مجھے ایک لمحے کے لیے بھی مت چھوڑنا، میرے پیارے،

کیونکہ اس لمحے آپ بہت دور جا چکے ہوں گے۔

میں ساری زمین پر الجھن میں بھٹکتا ہوا پوچھوں گا،

کیا آپ واپس آؤ گے؟ کیا آپ مجھے مرتے ہوئے یہیں چھوڑ جاؤ گے؟۔"

سلسبیل کا دماغ سنسنا اٹھا

"اس راستے سے کون گزرتا ہے۔"

اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

"وہ خداداد ہے یا خطیب؟"

اس نے کچھ دیر کے لیے سوچا،

اسے بے حد تپ چڑھی تھی۔

"میں اس کو سزا ضرور دوں گی کیا سمجھ کر یہ لکھا گیا؟"

سلسبیل نے باآواز سوچا تھا۔

اس رات وہ گھر آ کر جب دادی کے ساتھ لیٹی تب بھی اس کے ذہن میں خداداد کی لکھی باتیں گردش رہی تھیں۔ اس کی دادی کوئی اسلامک کتاب پڑھ رہی تھی۔ اور ٹی وی پر کسی ملک کے ٹرانس جینڈر رایکٹس کی خبریں چل رہی تھیں۔ شاید وہ کوئی اسلامل ملک تھا جس کے کسی مشہور آدمی نے ہم صنف سے شادی کر لی تھی۔ اس کی دادی نے ٹی وی آف کرتے نجانے کتنی ہی بار استغفار پڑھا تھا۔

سلسبیل نے پوچھا

"دادی! یہ جرم ہے؟ اور گناہ بھی؟"۔

"یہ جرم نہیں عظیم جرم ہے۔ اس گناہ پر تو ایک پوری قوم اللہ نے تباہ کر دی تھی۔"

"۔ اچھا۔' سلی کو دلچسپی ہوئی تھی۔

کچھ دیر کے لیے اس کا دھیان بٹ گیا تھا۔

" آپ مجھے واقعہ سنا سکتی ہیں۔"؟

" ارے کیوں نہیں میری بیٹی۔"!

دادی نے فرط شوق سے کہا

" یہ قوم لوط کی بد عادت تھی۔"

دادی نے اسکارف کھول کر کہنا شروع کیا۔

" قوم لوط جنہوں نے ایسی برائی کو ایجاد کیا۔ جو ان سے پہلے دنیا میں کسی قوم نے نہ کی تھی۔ ایسی بدکاری جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس قوم نے ایسا کیا کام کیا تھا اور ان کا کیا انجام ھوا۔ حضرت لوط علیہ السلام اللہ کے ایک برگزیدہ نبی تھے آپ کے والد کا نام حاران تھا جو تابش کے بیٹے تھے آپ کی پیدائش عراق کے قدیم شہر "عر" میں ہوئی تھی اس شہر میں ابراہیم علیہ السلام کا مسکن تھا۔ دراصل لوط علیہ السلام کے والد حاران حضرت ابراہیم کے سگے بھائی تھے یعنی حضرت لوط علیہ السلام کے والد حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے چونکہ حضرت لوط علیہ السلام کے والدان کے بچپن میں ہی انتقال کر چکے تھے لہذا حضرت لوط کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹا بنا کر پالا تھا آپ حضرت ابراہیم پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں شامل ہیں

آپ حضرت ابراہیم کے زمانے میں اہل سدوم کی رہنمائی کے لئے نبوت کے منصب پر فائز ہوئے۔ حضرت لوط کے بہت سارے معجزات ہیں آپ جس وقت بارش کے لیے دعا کرتے تھے تو آسمان بادلوں سے بھر جاتا اور خوب بارش ہوتی تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام جس پتھر پر سر رکھ کر سوتے تھے اس پتھر پر آپ کے سر مبارک کا نشان بن جاتا تھا سدوم وہ علاقہ تھا جہاں لوط علیہ السلام مبعوث فرمائے گئے

سدوم کے آس پاس پانچ نہایت ہی خوبصورت شہر آباد تھے جن میں سے ہر ایک کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ تھی یہ علاقے نہایت سرسبز و شاداب اور قدرت کی فیاضی کا حسین شاہکار تھا یہاں باغات

کی کثرت تھی لہلہاتی کھتیاں یہاں کی ضروریات سے زیادہ تھیں اردن، شام اور اسرائیل کے درمیان بسا ہوا۔ یہ علاقہ نہایت ہی زرخیز تھا وہاں طرح طرح کے اناج پھل میوے بکثرت پیدا ہوتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ آس پاس کی بستیوں کے لوگ، اپنی معاشی اور غذائی ضرورت کے لئے ان بستیوں کی طرف آتے تھے مگر یہ بات اہل سدوم کے لوگوں کو بالکل بھی پسند نہ تھی ان کے خیال میں ان کی بستیوں میں پیدا ہونے والے پھلوں اناج اور سبزیوں پر صرف ان کا ہی حق تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ دوسری بستیوں کے لوگ ان کے علاقے میں آئیں۔ ایک دن سدوم کے لوگ اس بات پر غور و فکر کر رہے تھے

کہ باہر سے آنے والے لوگوں کو یہاں آنے سے آخر کیسے روکا جائے۔ کہ ایک بزرگ کی شکل میں ابلیس ان کی محفل میں آیا اور کہا اگر تم ان سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو تو میرے کہنے پر عمل کرو۔ اس اجنبی بزرگ کی بات لوگوں نے بہت توجہ سنی۔ اور ابلیس نے کہا باقی بات میں کل بتاؤں گا۔ دوسرے دن کی ابلیس ایک خوبصورت جوان لڑکے کے بھیس میں آیا

اور انہیں اپنی عورتوں کی بجائے۔ مردوں کے ساتھ فعل بد کرنا سکھایا۔ ابلیس نے کہا کہ اگر تم ان بستیوں کے لوگوں سے نجات چاہتے ہو۔ جو تمہاری بستی میں آجاتے ہیں تو ایسا کرو کہ جب بھی کوئی شخص تمہارے علاقے میں آئے تو تم لوگ زبردستی اس کے ساتھ اپنی خواہش پوری کرو۔ اس طرح یہ لوگ اس بستی میں آنا چھوڑ دیں گے۔ اپنی نفسانی خواہشات کے لیے مردوں سے بدفعلی اس قوم کا دستور بن گیا تھا۔

یہاں بے حیائی عام ہوگئی تھی۔ حکمران، سردار، رعوسہ، ہر طبقے میں گھر گھر یہ عمل پھیل گیا تھا۔ بھری محفل میں یہ لوگ اس فحاشی کے اس کام کو کر کے خوش ہوتے تھے کوئی بھی محفل اس کام کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی تھی۔ خاص کر مسافروں میں سے کوئی خوبصورت لڑکا ہوتا تو یہ لوگ اسے اپنا شکار بنا لیتے طلموت میں لکھا ہے کہ اہل سدوم اپنی روزمرہ کی زندگی میں سخت ظالم دھوکہ باز اور بدمعاملہ تھے

کوئی مسافر ان کے علاقے سے بخیریت نہیں گزر سکتا تھا کوئی غریب ان کی بستیوں سے روٹی کا ایک ٹکڑا نہ پا سکتا تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ باہر کا آدمی ان کے علاقے میں پہنچ کر فاقوں سے مر جاتا تھا اور یہ لوگ اس کے کپڑے اتار کر اس کی لاش کو برہنہ دفن کر دیتے۔ اپنی وادی کو انہوں نے ایک باغ بنا

رکھا تھا۔ جس کا سلسلہ میلوں تک پھیلا ہوا تھا اس باغ میں وہ انتہائی بے حیائی کے ساتھ اعلانیہ بدکاریاں کرتے تھے۔

حضرت لوط علیہ السلام نے انہیں توحید کی دعوت دی اور بدکاری کے اس گھناونے عمل سے توبہ کرنے کا حکم دیا۔ حضرت لوط نے کہا تم یہ کیوں کرتے ہو کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر لذت حاصل کرنے کے لیے مردکی طرف مائل ہوتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم احمق لوگ ہو۔ تو پھر حضرت لوط اہل سدوم کو دن رات وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ لیکن اس قوم پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

بلکہ وہ بہت فخریہ انداز میں یہ کام کرتے تھے انہیں حضرت لوط کا سمجھانا بھی برا لگتا تھا لہذا انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر تم ہمیں اسی طرح بھلا کہتے رہے اور ہمارے کاموں میں مداخلت کرتے رہے تو ہم تمہیں اپنے شہر سے نکال دیں گے۔ حضرت لوط نے نصیحت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ لہذا ایک دن اہل سدوم نے خود ہی عذاب الہی کا مطالبہ کردیا۔

اللہ تعالی نے اب تک ان کے اس بدترین عمل فحاشی اور بدکاری کے باوجود ڈھیل دے رکھی تھی۔ لیکن جب انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے ایک دن کہا کہ اگر تم سچے ہو تو ہم پر عذاب لے آؤ۔ لہذا ان پر عذاب الہی کا فیصلہ ہو گیا۔ اللہ نے اپنے خاص فرشتوں کو دنیا کی طرف روانہ کردیا۔ یہ فرشتے دراصل حضرت میکائیل، جبرائیل اور اسرافیل علیہ السلام تھے پھر یہ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر تشریف لے آئے۔

حضرت لوط نے جب ان خوبصورت نوعمر لڑکوں کو دیکھا تو سخت گھبراہٹ اور پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ انہیں یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ اگر ان کی قوم کے لوگوں نے انہیں دیکھ لیا۔ تو نہ جانے وہ انکے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ حضرت لوط کی بیوی کا نام وائلہ تھا اس نے آپ پر ایمان نہیں لایا تھا اور وہ دراصل منافقہ تھی۔ وہ کافروں کے ساتھ تھی لہذا اس نے جا کر اہل سدوم کو یہ خبر دے دی۔

کہ لوط کے گھر دو نوجوان لڑکے مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں یہ سن کر بستی والے دوڑتے ہوئے۔ حضرت لوط کے گھر پہنچے حضرت لوط نے کہا کہ یہ جو میری قوم کی لڑکیاں ہیں یہ تمہارے لیے جائز اور

پاک ہیں اللہ سے ڈرو مجھے میرے مہمانوں کے سامنے رسوانہ کرو۔ کیا تم میں سے کوئی بھی شائستہ آدمی نہیں، حضرت لوط علیہ السلام کی بات سن کر وہ لوگ بولے

تم بخوبی واقف ہو کہ ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی حاجت نہیں اور جو ہماری اصل چاہت ہے اس سے تم بخوبی واقف ہو۔قوم لوط کے اس شرم سار جواب سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ فیل بد میں کس حد تک مبتلا ہو چکے تھے جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم ان کے گھر کی طرف دوڑتی ہوئی آئی تو حضرت لوط نے گھر کے دروازے بند کر دیے اور ان نوجوانوں کو ایک کمرے میں چھپا دیا۔

ان بدکار لوگوں نے آپ کے گھر کا گھیراؤ کیا ہوا تھا اور ان میں سے کچھ گھر کے دیوار پر بھی چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے حضرت لوط علیہ السلام اپنے مہمانوں کی عزت کے خیال سے بہت زیادہ گھبرائے ہوئے تھے فرشتے یہ سب منظر دیکھ رہے تھے جب انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی بے بسی اور پریشانی کا یہ عالم دیکھا۔تو حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے یوں فرمایا۔

اے لوط ہم تمہارے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں یہ لوگ ہرگز تم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ ابھی کچھ رات باقی ہے تو آپ اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو اور تم میں سے کوئی شخص پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔ اہل سدوم حضرت لوط علیہ السلام کے گھر کا دروازہ توڑنے پر بضد تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے گھر سے باہر نکل کر اپنے پر کا ایک کونا انہیں مارا۔جس سے ان کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر نکل آئے اور بصارت ظاہر ہوگئی یہ خاص عذاب ان لوگوں کو پہنچا۔ جو حضرت لوط کے پاس بدنیتی سے آئے تھے۔حضرت لوط علیہ السلام حقیقت حال جان کر مطمئن ہو گئے اور اپنے گھر والوں کے ساتھ رات کو ہی نکل کھڑے ہوئے۔لیکن پھر بھی ان کی بیوی ان کے ساتھ تھی لیکن کچھ دور جا کر وہ واپس اپنے قوم کی طرف پلٹ گئی اور قوم کے ساتھ جہنم واصل ہوگئی۔

صبح کا آغاز ہوا تو اللہ کے حکم سے حضرت جبرئیل نے بستی کو اوپر سے اکھاڑ دیا اور پھر اپنے بازو پر رکھ کر آسمان پر چڑھ گئے یہاں تک کہ آسمان والوں نے بستی کے کتے کے بھونکنے اور مرغوں کے بولنے کی آوازیں سنیں۔ پھر اس بستی کو زمین پر دے مارا جس کے بعد ان پر پتھروں کی بارش ہوئی۔ ہر

پتھر پر مرنے والے کا نام لکھا ہوا تھا۔ جب یہ پتھر ان کو لگتے تو ان کے سر پاش پاش ہو جاتے۔

صبح سویرے شروع ہونے والا یہ عذاب اشراک تک پوری بستی کو نیست و نابود کر چکا تھا قوم لوط کی ان خوبصورت بستیوں کو اللہ نے ایک انتہائی بدبودار اور سیاہ جھیل میں تبدیل کر دیا۔ جس کے پانی سے رہتی دنیا تک کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ سمندر کے اس حصے میں کوئی جاندار مچھلی، مینڈک وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے اسے ڈیڈ سی یعنی بحیرہ مردار کہا جاتا ہے

جو اسرائیل اور اردن کے درمیان واقع ہے۔ ماہرین آثار نے دس سالوں کی تحقیق و جستجو کے بعد اس تباہ شدہ شہر کو دریافت کیا تھا۔ تحقیقات سے پتہ چلا تھا کہ اس شہر میں زندگی بالکل ختم ہو چکی ہے۔ شہر کے راستے اور کھنڈرات کو دیکھ کر ارکلوجسٹ نے یہ اندازہ لگایا کہ جب یہ شہر تباہ ہوا تو اس وقت لوگ روزمرہ کے معاملات اور کاموں میں مشغول تھے اور یہاں زندگی اچانک ختم ہو گئی تھی

اہل سدوم جنہیں پتھر بنا دیا گیا تھا۔ ان کے بت ابھی تک بحیرہ مردار کے پاس موجود ہیں جو لوگوں کے لیے ایک عبرت ہے آج یورپی ممالک میں انسانی آزادی کے نام پر اس بدکاری کی اجازت دی جاتی ہے اور اس فحش عمل کو باعث فخر سمجھا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم جنس پرستی بالکل فطرت کے خلاف ہے جس سے انسانی معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے

روایتوں کے مطابق ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے شیطان سے پوچھا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بدترین عمل کیا ہے ابلیس بولا جب مرد مرد سے بدفعلی کرے اور عورت عورت سے خواہش پوری کرے۔ حضرت ابن عباس سے روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص پر اللہ پاک کی لعنت ہو جو قوم لوط والا عمل کرے۔

استغفار۔" سلمیٰ نے خوف سے جھرجھری لی۔

"یہ کیسی انسانی آزادی ہے جو انسان کو گمراہ کر دے۔"

"خدا سب جو امان میں رکھے۔" دادی نے پوتی کو چوما۔

"اے میری نیک بیٹی! سو جاؤ اب۔"

جب دادی اسے سلا رہی تھیں تو اس کے ذہن میں خداداد نہیں بلکہ ہشام کا خیال تھا وہ ڈھیر سارے خوابوں کے بیچ سونے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔

اگلی صبح بڑی دل فریب تھی۔اس کی می نے اسے کچن میں آتا دیکھ کر کہا

"جاؤ پے انگ گیسٹس کو ناشتہ دے آؤ۔"

پگھلا پنیر اور نرم سلائس فرائی انڈوں کے اس ناشتے کو اٹھا کر خداداد کے روم میں آنے تک وہ بھول چکی تھی کہ کل کیا ہوا تھا۔

جب اس نے دروازے پے دستک دی تھی۔اندر سے خداداد ہی نکلا تھا۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"نیک لڑکی!اپنی می کو میرا اسلام کہنا۔"

اس نے ناشتے کی ادائگی فوری طور پے کر دی تھی۔اس لیے سلی کی می کو یہ کرائے دار بہت پسند تھے۔

جب وہ جانے لگی تو کوریڈور میں ایک چمکتا کارڈ پلانٹ کے پاس دکھائی دیا تھا،سلی نے کارڈ دیکھتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔پیچھے کوئی بھی نہیں تھا

سلی نے کارڈ اٹھالیا۔

اس پر ایک نظم تحریر تھی۔

سلی حیران ہوگئی

یہ کارڈ اس کا پیچھا کرتے گھر بھی آ چکے تھے؟

اس نے تجسس سے مجبور ہو کر دیکھا

وہ مردہ نہیں ہیں،

جو ہمارے لیے خوشی کو یاد کرنے کا یہ عظیم ورثہ چھوڑ گئے ہیں۔

وہ اب بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں،

اس سکھ میں جس سے ہم آشنا تھے،

ان خوابوں میں جو ہم نے مل کر دیکھے تھے۔

وہ اب بھی سانس لیتے ہیں،

اپنے پسندیدہ پھولوں سے گزرنے والی معطر ہواؤں میں۔

وہ اب بھی چاند کی روپہلی چاندنی میں مسکراتے ہیں،

اور سورج کی سنہری تابناک کرنوں میں ہنستے ہیں۔

وہ اب بھی ان لفظوں کی بازگشت میں بولتے ہیں جو ہم نے انہیں بار بار کہتے ہوئے سنا ہے۔

وہ اب بھی حرکت پذیر ہیں،

لہراتی گھاس کی تال میں،

لچکتی شاخوں کے رقص میں۔

وہ مردہ نہیں ہیں؛

ان کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ ہے،

ہمارے غم میں راحت ہے۔

وہ ہم سے جدا نہیں ہیں، بلکہ ہمارا حصہ ہیں،

کیونکہ محبت ابدی ہے،

اور جن سے ہم محبت کرتے ہیں وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔

’They are not dead

by Toni Kane

They are not dead,

Who leave us this great heritage of remembering joy.

They still live in our hearts,

In the happiness we knew, in the dreams we shared.

They still breathe,

In the lingering fragrance, windblown, from their favourite flowers.

s silver,'They still smile in the moonlight

s sparking gold'.And laugh in the sunlight

ve'They still speak in the echoes of the words we heard them say again and again.

They still move,

In the rhythm of waving grasses, in the dance of the tossing branches.

They are not dead;

Their memory is warm in our hearts, comfort in our sorrow.

They are not apart from us, but part of us,

For love is eternal,

And those we love shall be with us throughout all eternity

:سلسبیل اب کہ تھوڑا خوف زدہ ہوئی تھی

"یہ سب کیا تھا آخر؟

اس صبح سلسبیل نے ناشتہ ہی نہیں کیا تھا۔

وہ جب بہت پریشان ہوتی تو دادی کے کہنے پر دو نفل پڑھ لیتی تھی آج اس نے چار نفل ادا کیے

اور ڈینی سے صبح کا سلام کر کے سوزی کے ساتھ انسٹیٹیوٹ کے لیے نکل آئی تھی۔

آج ان کے انسٹیوٹ میں ڈاکٹر ہشام کا لیکچر تھا۔ یہ لیکچر سال میں دو بار مسلم طالبا کے لیے ہوتا تھا مگر اس کو ہر مذھب کے لوگ اٹینڈ کر سکتے تھے

اگر ہشام کا لیچر نہ ہوتا تو سلی آج بلکل بھی انسٹیوٹ نہ جاتی،

اس کا بلکل ارداہ نہیں تھا۔ آج وہ آزردہ تھی۔ ۔اور کسی حد تک خوف زدہ بھی تھی،

جانے کیوں اسے خداداد کوئی جاسوس یا کھوجی معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی خاص مقصد کے لیے اس کے گھر میں یا اس کے بوار یا میں موجود تھا۔

وہ اور سوزی جب پہنچے تب ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہاں ایسا رش ہشام کی وجہ سے ہوتا تھا کیونکہ ایک عالم اس کا مداح تھا لوگ اسے دور دور سے دیکھنے آتے تھے کیونکہ وہ ایک بڑا پبلک فگر رکھتا تھا اور عوام میں بہت مقبول تھا،

اس کا لیکچر شروع ہوئے بیس منٹ گزر چکے تھے۔

وہ مائک پے بول رہا تھا اور اس کی میٹھی آواز دل موہ لینے والی تھی

آج وہ کس پے بیان کر رہا تھا؟

سلی کو سمجھنے میں کچھ وقت لگا

"بنی اسرائیل اور ہمارے علماء کے کردار میں بعض عجیب مماثلتیں"۔

سیدنا مسیح علیہ الصلوۃ والسلام کی بعثت کے وقت یروشلم کے مذہبی علماء مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ معمولی مسائل کے حل و فصل پر ان کے درمیان مناظرہ بازی کا شغل میلہ رچانے کا رسم بد عام تھا۔ ان علماء کا کردار نہایت ہی بھیانک اور دوغلا تھا، یہ جو کرتے تھے وہ کہتے بالکل نہ تھے اور جو کہتے تھے وہ ہرگز نہیں کرتے تھے، یعنی کردار و گفتار کے لحاظ سے واضح طور پر منافق اور مذبذب تھے، ان کے قول و فعل اور ظاہر و باطن میں زبردست تضاد تھا، اس کے باوجود وہ قوم سے عزت کے طالب اور مال و دولت کے خواستگار تھے، وہ چاہتے تھے کہ معاشرہ میں سب سے زیادہ انہیں ہی عزت ملے، وہ شہرت اور

نام ونمود کے بھی بھوکے تھے۔

بنی اسرائیل کے علماء کے ایک طبقہ کو ''فریسی'' کہا جاتا تھا جیسے کہ ہمارے ہاں لفظ ''مشائخ'' کا اطلاق مذہبی علماء ایک طبقے پر کیا جاتا ہے، علماء کا یہ (فریسی) طبقہ نہایت شدت پسند مذہبی رہنماؤں پر مشتمل ہوتا تھا جیسے کہ ہمارے ہاں اہل ظواہر و اہل حدیث یا اہل تصوف حضرات ہیں، یہود کے یہ شدت پسند علماء بھی معمولی معمولی بات پر لوگوں کی تکفیر و تضلیل کر کے انہیں راندہ درگاہ ٹھہراتے تھے اور پھر ان کی گردنیں اتارنے کے فتوی دیتے پھرتے تھے۔

سیدنا مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عوام کے سامنے ان علماء کی حقیقت بیان کی اور انہیں ایسوں سے ہوشیار رہنے کیلئے متوجہ کیا۔ آپ کے چند ارشادات یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض مقامات کی تشریح و توضیح بریکٹس میں بند ہیں۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے ان ہی ارشادات کی روشنی میں آج ہم اپنے ہم عصر علماء و مشائخ اور مذہبی رہنماؤں کے کردار کا بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں:۔

اے عوام فریسی علماء، موسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ لہذا جو کچھ یہ تمہیں سکھائیں اسے مانو اور اس پر عمل کرو۔ لیکن ان کے نمونے پر مت چلو کیونکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔

یہ علماء ایسے بھاری بھرکم بوجھ جس کا اٹھانا مشکل ہے، باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں اور خود انہیں انگلی بھی نہیں لگاتے۔ یعنی اپنی فقہی موشگافیوں اور نکتہ رسی سے دین کو بہت مشکل بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے اور نہ ہی کر سکتے ہیں۔

یہ علماء ضیافتوں میں صدر نشینی چاہتے ہیں اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں، اور یہ چاہتے ہیں کہ بازاروں میں لوگ انہیں جھک جھک کر ملیں اور ''ربی'' کہہ کر پکاریں۔ لیکن تم ربی نہ کہلاؤ کیونکہ تمہارا رب ایک ہی ہے اور تم سب بھائی بھائی ہو۔

اے شریعت کے عالمو اور فریسیو! اے ریاکارو! تم پر افسوس، کیونکہ تم نے آسمان کی بادشاہی یعنی جنت کو لوگوں کے داخلے کیلئے بند کر رکھا ہے، کیونکہ نہ تو خود اس میں داخل ہوتے ہو اور نہ ہی ان لوگوں کو داخل ہونے دیتے ہو جو اس میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔

اے شریعت کے عالمو اور فریسیو! اے ریاکارو! تم پر افسوس، تم بیواؤں کے گھروں پر قبضہ کر لیتے ہو اور دکھاوے کیلئے لمبی لمبی دعائیں بھی کرتے ہو۔ تمہیں زیادہ سزا ملے گی۔ زمینوں پر قبضہ کرنے کی روایت ہمارے مذہبی طبقے میں بھی عام ہوگئی ہے، کئی بڑے بڑے مدارس اور مساجد قبضے کی زمینوں پہ قائم ہیں۔

اے شریعت کے عالمو اور فریسیو! اے ریاکارو! تم پر افسوس، کیونکہ تم کسی کو اپنا مرید بنانے کیلئے تو تری اور خشکی کا سفر کر لیتے ہو اور جب بنا لیتے ہو تو اسے اپنے سے دُگنا جہنمی بنا دیتے ہو۔ یعنی اپنے سے دو چند بے عمل کر دیتے ہو۔

اے شریعت کے عالمو اور فریسیو! اے ریاکارو! تم پر افسوس، کیونکہ تم پودینہ، سونف اور زیرہ کا دسواں حصہ یعنی زرعی پیداوار پر عُشر تو خدا کے نام پر تو لیتے ہو لیکن شریعت کے زیادہ وزنی احکام یعنی انصاف، رحم دلی اور ایمان کو فراموش کر بیٹھے ہو۔ تمہیں لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔

اے شریعت کے عالمو اور فریسیو! اے ریاکارو! تم پر افسوس، کیونکہ تم پیالے اور پلیٹ کو باہر سے تو صاف کر لیتے ہو مگر ان کے اندر لوٹ اور عدم انصاف یعنی حرام مال سے کمائی ہوئی رزق سے بھرا ہوا ہے۔ اے اندھے فریسی! تمہیں چاہیے تھا کہ پیالے اور پلیٹ کو اندر سے پہلے صاف کرتے تا کہ وہ باہر سے بھی صاف ہو جاتی۔

"اے اندھے رہنماؤ! تم مچھر تو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔" یعنی معمولی باتوں پر تو مین میخ نکالتے ہو لیکن دین کے بڑے بڑے احکامات کو فراموش کئے بیٹھے ہو۔"

"اے شریعت کے عالمو اور فریسیو! اے ریاکارو! تم پر افسوس، کیونکہ تم نبیوں کے مقبرے تو بناتے ہو اور راستبازوں کی قبریں آراستہ کرتے ہو، اللہ تمہارے پاس نبیوں، داناؤں اور شریعت کے عالموں کو بھیج رہا ہے۔ تم ان میں سے بعض کو قتل کر ڈالتے ہو، بعض کو صلیب پر لٹکا دیتے ہو اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑوں سے مارتے ہو۔

"دسویں پوائنٹ سے اس بات کا اندازہ کیجیے کہ بنی اسرائیل میں بھی مردہ پرستی کا رسم عام تھا، وہ

بھی اپنے نیک زندہ لوگوں سے ایسا ہی سلوک کرتے تھے جو ہمارے ہاں کیا جاتا رہا ہے اور مرنے کے بعد ان کے عالیشان مقبرے تعمیر کرتے تھے اور تعریفوں کے قصیدے پڑھتے تھے جیسے کہ ہمارے ہاں رواج ہے۔"

(''انجیل شریف'' متی باب 23 سے چند اقتباسات)

پھر اس نے القدس پے بات کی جس پر سلی نے خطیب کو روتا ہوا دیکھا۔ وہ القدس اور مسجد اقصی کا ذکر سن کر رو رہا تھا۔ یہی بے چینی خداداد کے چہرے پے تھی۔

پھر اس نے مسلمانوں کے کردار پے بات کی تھی

توحید نبوت رسالت امامت اور چیز کو واضح ڈسکس کیا۔ وہ بار بار فلسطین پر ہونے والے مظالم کی بات کر رہا تھا

"انسانیت کو ایسا زوال ہے۔ وہ القدس میں لاشوں کے ٹکرے نہیں اٹھاتے مہاجرین کی بھوک دور نہیں کرتے قبریں بنا کر ان کو پوجتے ہیں۔ آج اسلام کو کیا ہو گیا ہے۔

:ایسا کس کا حوصلہ تھا۔ جو مغرب میں بیٹھ کر القدس کی بات کرے؟

مگر وہ عالم اسلام کو للکار رہا تھا۔

وہ کس کی بات کر رہا تھا؟ عظیم مسجد اقصیٰ کی؟

قدسی کے جنوبی حصے میں واقع مسجد اقصیٰ کی بات مغرب کے ایک دیہات میں ہو رہی تھی؟

مسجد اقصی مسلمانوں کا قبلہ اول اور خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے بعد تیسرا مقدس ترین مقام ہے۔ مسجد اقصی حقیقت میں مسلمانوں کی میراث ہے جو تاریخی اور مذہبی حقائق سے ثابت ہے مگر یہ جس جگہ پر تعمیر کی گئی ,یہود کے موقف کے مطابق اِس جگہ پر پہلے سُلیمانی ہیکل تھی۔ مُسلمانوں کے یروشلیم شہر پر قبضہ کرنے کے بعد یہ مسجد تعمیر کی گئی۔ حالانکہ کہ قرآن میں سفر معراج کے باب میں اس مسجد کا ذکر ہے۔ گویا یہ مسجد حضورﷺ کے بعثت سے بھی پہلے موجود تھی۔ متعدد روایات کے مطابق خانہ کعبہ کے بعد دوسری عبادت گاہ الاقصیٰ تعمیر ہوئی تھی۔ مسجد کا تعلق اللہ کی عبادت سے ہے اور ہر نبی کو عبادت کے لئے

مسجد کی ضرورت تھی۔ یہاں تک درست ہے کہ موجودہ دور میں اس مسجد کی معروف نسبت حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ ہے حتیٰ کہ ایک روائت کے مطابق اس مسجد کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات سے تعمیر کرایا۔لیکن اسے کلیتہً ہیکلِ سلیمانی قرار دینا تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ ہیکل کا لفظ رہائش گاہ، محل یا دربار کے لئے استعمال ہوتا ہے۔گمان غالب ہے کہ نبی اللہ سلیمان علیہ السلام نے اپنی رہائش کا حجرہ بھی مسجد میں ہی بنا رکھا ہو اور اپنے متبعین کا اجتماع بھی مسجد میں ہی کرتے ہوں اس لحاظ سے اس مسجد کو ہیکل سلیمانی یعنی سلیمان علیہ السلام کا محل یا دربار کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہو۔حالانکہ یہ مسجد فی الواقع زمین پر دوسری تعمیر ہونے والی مسجد ہے۔

مقامی مسلمان اسے المسجد الاقصیٰ یا حرم قدسی شریف (عربی الحرم القدسی الشریف) کہتے ہیں۔ یہ مشرقی یروشلم میں واقع ہے جس پر اسرائیل کا قبضہ ہے۔یہ یروشلم کی سب سے بڑی مسجد ہے جس میں 5 ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے جبکہ مسجد کے صحن میں بھی ہزاروں افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔2000ء میں الاقصیٰ انتفاضہ کے آغاز کے بعد سے یہاں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہو گیا تھا۔

آج صبح کے آغاز کے ساتھ اس کی زندگی میں عجیب واقعات رونما ہو رہے تھے

جب وہ سوزی عشایئے کے لیے ایسے ہال میں اترے جہاں امرا کے علاوہ کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

اب وہ روشن دنیا میں داخل ہوئیں۔سامنے منظر ہی کچھ اور تھا

عالمی ہوٹل فریکو شہر کا پُرتعیش ہوٹل تھا جہاں ملک کے اہم اور مشہور افراد ٹھہرنا پسند کرتے تھے۔تو اس وقت بھی وہاں اہم شخصیات قیام پذیر تھیں۔سابق سفیر اور سینیٹر گومز، مشہور اداکارہ مادام آندریا اپنے پالتو کتے سمیت، ممتاز مورخ سومار ینو جو اس وقت چار صوبوں میں تحقیقی کام کر کے یہاں وارد ہوئے تھے، ملک کا سب سے بڑا تاجر جو حال ہی میں سوئیزر لینڈ سے تپ دق کا علاج کروا کے آیا تھا، ملک کے سب سے بڑے ڈیم کا خالق انجینیر پریرا اپنی بیوی، سات بچوں اور دو ملازماؤں کے ساتھ موجود تھا، مشہور مغنیہ کارلا جو پورے ملک کا دورہ کر کے یہاں پہنچی تھی، آدھے شہر کا مالک ریمنڈ ڈی سوزا اور دو

امیر بیوائیں وہاں موجود تھیں۔ نائب وزیرِ صحت ڈاکٹر رابرٹو اپنے خاندان کیہمراہ ایک دن پہلے ہی پہنچا تھا۔ ہوٹل میں مختلف دنیاؤں کے افراد موجود تھے اوران سب میں ایک چیز مشترک تھی؛

"امارت۔"۔

ہوٹل بھی نہایت شان دار تھا۔ ہر کمرے میں بجلی، غسل خانوں میں جدید لوازمات اورانتہائی عمدہ ملازمین۔ باورچی کھانے میں امریکی، برطانوی، اطالوی اور یہاں تک کہ چینی باورچی بھی موجود تھے

ظہرانے پر سب افراد پہلی منزل پر واقع طعام خانے میں اکٹھے ہوئے۔ ہوٹل واقعی شان دار تھا۔ طعام خانے کی چھت نیچی مگراس میں سے ہلکی ہلکی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ موٹے شیشے سے بنا فرش جس کے نیچے پانی بھرا تھا اوراس میں مختلف رنگوں کی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ دیواریں آرٹ کے نمونوں سے بھری ہوئی تھیں۔ پورا طعام خانہ ایک شیشے کے حوض کا منظر پیش کرر ہا تھا۔ ساگوان کی لکڑی کے میز اور قرینے سے سجے دھاتی برتن۔ بیروں نے قیمتی ریشمی کپڑے کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ ماحول بہت خواب آگیں اور پُرسکون تھا۔ مادام آندریا ذرا حیرانی اور دل چسپی سے مچھلیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ہال میں دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ماحول میں ذراسی ہلچل تب برپا ہوتی جب کوئی مہمان داخل ہوتا۔

جناب نائب گورنر تشریف لا رہے ہیں، محترم مئیران کے ہم راہ ہیں۔

اس ہوٹل میں ہر وقت مشہوراور طاقت ور شخصیات کا جم گھٹا لگا رہتا۔ اشرافیہ جن میں سرکاری اہل کار، مسلح افواج کے اعلیٰ عہدے دار، سیاست دان، اداکاراور گلوکار؛ کوئی نہ کوئی اہم چہرہ نظر آ ہی جاتا تھا۔ رات کے وقت توان اہم ہستیوں کی گویا کہکشاں اُتر آتی۔ اس سہ پہر دواور مہمانوں کی آمد ہوئی۔ ایک سپریم کورٹ کے سابق جج محترم رابرٹو اوران کا بھتیجا ڈاکٹر راول۔ ڈاکٹر راول ہمہ جہت شخصیت کا مالک تھا جس کے وجود سے ایک توانائی پھوٹتی تھی۔ وہ اونچی سوسائٹی کا ایک اہم نام تھا اوراعلیٰ حلقوں تک اس کی رسائی تھی۔

ڈاکٹر ہشام اپنے دوستوں کے ساتھ تھا ان دونوں کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

وہ ان کے قریب آ گئی تھیں

وہ اپنے دوستوں کو کوئی کہانی یا کوئی قصہ سنا رہا تھا۔

"خدا کی نشانی"

وہ مسکرایا

"میری ماں نے مجھے سنایا۔ اب تم سنو۔

"ایک بوڑھا انپڑھ عرب اتنی سچائی اور لگن سے روز آنہ عبادت کرتا تھا کہ ایک دن یہ دیکھ کر قافلے کے مالدار سردار نے اسے بات کرنے کے لیے بلایا

"ہم اتنی عقیدت سے کیسے عبادت کرتے ہو؟ تمہیں کیسے پتہ کے خدا کا وجود ہے؟ تمہیں تو پڑھنا بھی نہیں آتا؟"

"میں جانتا ہوں جناب۔"۔ بوڑھا بولا

میں وہ سب کچھ پڑھ سکتا ہوں جو ہماری کائنات کا مالک لکھتا ہے۔"

"لیکن کیسے؟"۔

سردار حیران ہو کر بولا

بوڑھا تحمل سے بتانے لگا۔"

"جب آپکو دور دراز سے کسی کا خط ملتا ہے تو آپ اسکو کیسے پہچانتے ہیں؟"

"اُسکی لکھائی سے، دستخط سے،" سردار نے کہا

"جب آپکو کوئی سونے کا زیور ملتا ہے، آپ جیسے جانتے ہیں کے کس نے بنایا ہے۔"؟

"سنار کے نشان سے"۔ سردار نے کہا

جب آپکے خیمے باہر سے کوئی جانور گزرتا ہے تو آپ کو کیسے پتہ چلتا ہے کہ وہ گھوڑا ہے، کوئی بیل ہے یا بھیڑ ہے؟"

"اسکے پیروں کے نشان سے،" سردار ان سب سوالوں سے حیران تھا

بوڑھا اُسے خیمے سے باہر لے گیا اور آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا

"وہاں موجود تمام چیزیں اور جو وہاں لکھا ہوا ہے، وہاں سے لے کر نیچے یہاں اس صحرا تک کچھ بھی ایسا نہیں جو انسان کے ہاتھ کا بنا ہو یا لکھا ہو۔"

اور سردار انگشت بدناں تھا

مغرب میں بیٹھ کر خدا کی باتیں کرنے والا یہ کون سی دنیا کا باسی تھا جب ارد گرد شراب چل رہی تھی وہ چند دوستوں سے اللہ کی گفتگو کر رہا تھا۔

❁ ❁

قسط نمبر 10

سلی اپنی دادی کے ساتھ کافی دن بعد بیکری میں آئی تھی اور ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی_
دادی پنیر کے ٹرے ریک میں ترتیب سے جوڑتے ہوئے اچانک آبدیدہ ہو گئی تھی
"سلی! دنیا میں کوئی بھی قوم معاشرہ یا خاندان اس وقت برباد ہو جاتا ہے جب ان نے ایمان داری ختم ہو جاتی ہے"_
وہ اپنی رقم گن نہیں رہی تھی یہ نہیں تھا کہ دادی کو کبھی گھاٹا پڑا تھا مگر ایسا منافع بخش کاروبار نہیں تھا پھر بھی سلی کی دادی بے ایمان نہیں تھی_
"دادی! انسان کو ثابت قدم کون سی چیز رکھتی ہے؟_"
"یہ اچھا سوال ہے_" دادی نے جواب دیا تھا_
"انسان کو اس کا ضمیر ثابت قدم رکھتا ہے"_
انسان کی بھوک کبھی نہیں مٹی اور طمع اس کی فطرت میں نہیں تھا، خواہشات کے انبار نے اسے جمع کرنے کی فکر میں مبتلا کر دیا تھا"_ دادی کہہ رہی تھیں
سلی سن رہی تھی_
دادی نے مزید بتایا
"دن میں تین مرتبہ کھانا بہت بعد کا دستور ہے۔ وحشی اپنا معدہ اوپر تک ٹھونس لیتے یا پھر فاقہ کرتے۔" امریکی انڈین قبائل کے ہاں زیادہ جنگلی قبائل اگلے دن کے لیے کھانا سنبھال کر رکھنا بزدلی اور بدتمیزی سمجھتے تھے۔ آسٹریلیا کے دیسی باشندے کسی ایسی محنت کی استعداد نہیں رکھتے تھے جس کا صلہ

فوری نہ ملے؛ ہر ایک Hottentot راحت پسند ہے؛ اور افریقہ کے بُش مین کے ہاں ہمیشہ " ضیافت یا قحط" ہی ہوتا ہے۔ مستقبل کے لیے اس خوراک کو سنبھال کر نہ رکھنے میں ایک خاموش دانائی پائی جاتی ہے، جیسا کہ متعدد 'وحشیانہ' طور طریقوں میں بھی ہے۔ جونہی کوئی شخص کل کا سوچنا شروع کرتا ہے، وہ باغِ عدن سے نکل کر فکر مندی کی وادی میں چلا جاتا ہے؛ اندیشوں کا سایہ اس پر ٹھہر جاتا ہے، لالچ کو مہمیز ملتی ہے، ملکیت کا آغاز ہوتا ہے اور 'بے فکر' دیسی باشندے کی خوشی غائب ہو جاتی ہے۔ امریکی نیگرو آج اسی عبوری مرحلے سے گزر رہا ہے۔ ایک مرتبہ Peary نے اپنے اسکیمو گائیڈ سے پوچھا، "تم کیا سوچ رہے ہو؟" اُس نے جواب دیا، " مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس وافر گوشت موجود ہے۔ اس وقت نہ جب تک ضروری نہ ہو جائے۔ دانائی کے حاصل جمع کے طور پر اس بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔"_

سلی کو دادی کی گفتگو بہت پسند تھی_ وہ بہت عملی اور مدلل بات کرتی تھی_

اس دن بیکری میں بیٹھے بیٹھے سلی کو ڈاکٹر ہشام کا لیکچر یاد آیا تھا_

وہ سوچنے پر مجبور تھی کہ منفرد ذہن وافکار کے لوگوں کو ان کا معاشرہ قبول نہیں کرتا_

وہ دادی کو یونانی فلسفی کا قصہ سنانے لگی تھی جو اس نے لیکچر کے دوران ذہن نشین کر لیا تھا_

"فلسفہ کی تاریخ کی تاریخ میں سقراط کا ایک بڑا نام رہا ہے_

"سقراط (Socrates)

دراصل سوفسطائیوں کی نقطہ نظر کا سخت مخالف تھا، وہ یہ سمجھتا تھا کہ جو سچی چیز ہے وہ سچی ہے اور جو جھوٹی چیز ہے وہ جھوٹی ہے۔_"

سچ سلی کے اندر بھی ایک تحریک پیدا کرتا تھا

"سقراط کے مطابق سچ کو جھوٹ ثابت کرنا اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنا صرف الفاظ کا ہیر پھیر ہے۔

اگرچہ سقراط کی تنقید بڑی اہم تھی مگر سوفسطائیوں کو کچھ کریڈٹ (credit) بھی دینا چاہیے۔

کریڈٹ اس حوالے سے دینا چاہیے کہ سوفیسٹس بہرحال روایتی یونانی سوچ نہیں رکھتے تھے، ان کا شاید

سب سے جو اہم کردار تھا وہ یہ تھا کہ سقراط سے پہلے جتنی بھی نیچرل فلاسفی تھی، سوفیسٹس نے اس کو عام بنایا، انہوں نے اس کو اشرافیہ طبقے میں پھیلایا اور جو تھیلیس، انگزمینڈر، انیگزمینیز، پائتاگرس، اور پرمینڈیز وغیرہ کی سوچ تھی، وہ سوچ سوفسٹس بحث ومباحثے میں لے کر آئے۔ اس کے علاوہ سبجیکٹوزم اور ریلٹوزم کا اپروچ سقراط کی تنقید سے بلکل ختم نہیں ہوا بلکہ آج تک اس پر بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے۔

لیکن سوفسطائیوں کی اپروچ سے ایک بڑا اخلاقی المیہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ درست اور غلط کے درمیان کوئی بھی واضح تفریق بچتی ہی نہیں اور جب کوئی تفریق بچتی ہی نہیں تو انسان جو ہے وہ بنیادی فیصلے کرنے کہ صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ سقراط وہ فرد تھا کہ جس نے سوفسطائیوں (Sophists) کے اس نقط ؟ نظر کو چیلنج کیا۔

سقراط کی پیدائش دراصل 469BCE میں ہوتی ہے۔

سقراط کو فلسفے کا بانی اور فلسفے کا بنیادی استاد بھی مانا جاتا ہے۔

سقراط سے پہلے فلاسفرز کو ہم قبل از سقراط کے فلاسفرز یعنی (Pre Socratic) فلاسفرز کہتے ہیں اور سقراط کے بعد سے جو پورا دور شروع ہوجاتا ہے اس کو ہم سقراطی فلسفے (Socratic Philosophy) کا دور کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ سقراط کا اتنا بڑا اثر تھا کہ سقراط سے پہلے جو فلسفی آئے یا جو سقراط کے زمانے میں بھی تھے ان تمام کو کم قبل از سقراطی فلسفہ میں شامل کر دیتے ہیں اور جو سقراط کے بعد آئے ان کو ہم سقراط کے بعد والا فلسفہ کہتے ہیں۔

یعنی سقراط کا لوگوں کے اذہان پر اتنا بنیادی گہرا اثر تھا کہ اس کے فلسفے اور اس کے نقط ؟ نظر کے ساتھ فلسفے اور انسانی سوچ کا دور شروع ہوجاتا ہے اور حیرانی کی بات ہے کہ سقراط نے اپنی زندگی میں ایک بھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔

اب وہ کون لوگ تھے کہ جنہوں نے سقراط کو متاثر کیا؟

سب سے پہلے تو اناگزگورس (Anaxagoras) کا نام شامل کیا جانا چاہیئے کیونکہ اناگزگورس وہ فرد ہے جس نے قدرتی فلسفہ (Natural Philosophy) کو ایتھنز میں متعارف

کروایا، اگر اناگزگورس نہ ہوتے تو ایتھنز کے لوگ اِن بنیادی خیالات سے متعارف نہ ہوتے۔

اس کے ساتھ ہی سقراط تین خواتین سے انتہائی متاثر تھے۔ سب سے اول نمبر پر وہ اپنی ماں سے متاثر تھے، اس کی ماں دراصل بچوں کی پیدائش میں خواتین کی مدد کرتی تھی۔

دوسری خاتون جن سے سقراط متاثر تھے وہ ڈایوٹما آف مینٹیا (Diotima of Mantinea) تھی جس سے سقراط نے پیار و محبت کے حوالے سیکھا ہے۔

اور تیسری خاتون اسپاسیا (Aspasia) ہے جس سے سقراط نے گفتگو اور تقریر کرنے کا انداز سیکھ لیا۔

چونکہ سقراط نے اپنی زندگی میں کوئی بھی کتاب نہیں لکھی لہٰذا جو کچھ ہم سقراط کے بارے میں جانتے ہیں وہ اس کے طالب علموں اور شاگردوں سے جانتے ہیں۔

سقراط کے سب سے اہم شاگرد کا نام افلاطون (Plato) ہے، اس کے علاوہ زینوفون (Xenophon) جس نے سقراط کے بارے میں لکھا۔

افلاطون اور زینوفون نے سقراط کے بارے میں کو لکھا اسی کے نتیجے میں ہی آج ہم سقراط کے بارے جانتے ہیں۔

دونوں افلاطون اور زینوفون اس بات پر متفق ہیں کہ سقراط ایک انتہائی بدصورت انسان تھا۔

سقراط جب ایک نوجوان تھے تو وہ دراصل سنگ تراش یعنی (Stone cutter) تھا۔

سقراط نے کبھی پیسے لے کر نہیں پڑھایا، وہ دراصل سوفسطائیوں کی اس عادت سے بڑی نفرت کرتا تھا کہ پیسے لے کر پڑھایا جائے۔

سقراط بہت سادہ زندگی گزارتا تھا، یعنی عام آدمی کی طرح زندگی گزارتا تھا۔

اپنی نوجوانی میں سقراط انتہائی بہادر فرد بھی سمجھا جاتا ہے اور انہوں نے بڑی جنگوں میں حصہ لیا۔

فلسفے کے اعتبار سے سقراط کا سب سے اہم اثر یہ ہوا کہ اس نے فلسفے کو آسمان سے کھینچ کر نیچے زمین پر لے لایا اور انہوں نے لوگوں کی زندگی میں فلسفہ شامل کیا۔

یعنی کہ جو بنیادی سوالات سقراط پوچھ رہے تھے وہ یہ نہیں تھے کہ ستارے اور سیارے کیا ہیں، کس طرح چلتے ہیں یا ریاضی میں کیا ہوتا ہے، ایٹم کیا ہوتا ہے کیا نہیں ہوتا، بلکہ ان سوالات کے بجائے یہ سوال اٹھایا کہ اچھائی کیا ہے، برائی کیا ہے، زندگی کا مقصد کیا ہے۔ یعنی کے سقراط نے اخلاقیات (Ethics) کے سوال پوچھے اور ظاہر ہے اخلاقیات کے جو سوال تھے وہ ذاتی سوال بھی تھے، وہ انفرادی، سیاسی و اجتماعی سوال بھی تھے۔

یعنی اس بارے میں سوال کہ سماج کو کس طرح سے چلنا اور منظم رہنا چاہیئے، انسان کو کس خاص چیز کے لئے جدو جہد کر لینے چاہیئے، غرض زندگی کا کیا مقصد ہے۔

سقراط یہ کہتا تھا کہ:

am the gadfly trying tőAthens is a sluggish horse. I sting it back to life.

یعنی ایتھنز ایک گھوڑے کی مانند ہے کہ جس کو نیند آئی ہوئی ہے اور میرا کام یہ ہے کہ میں اس مکھی کا کردار ادا کروں کہ جس کے نتیجے میں گھوڑا بیدار اور جاگ جاتا ہے۔ یعنی میرا کام ہی یہ ہے کہ میں نے سماج زندہ رکھنا ہے، ان کو بیدار رکھنا ہے، ایسے سوال پوچھ کہ جن کا سماج جواب نہ دینا چاہ ہے۔

جب سقراط نے اس قسم کے مشکل سوالات پوچھنے شروع کیں تو ایتھنز کا جو سماج تھا وہ سقراط سے بہت ناخوش تھا بلکہ اس قدر ناخوش کہ سقراط کو سزائے موت سنائی گئی اور اس نے زہر کا پیالا پی لیا اور اس طرح سے 399BCE میں سقراط کی وفات ہو جاتی ہے_

وہ سقراط کی وفات کا حال پڑھ کر دادی کو سنا رہی تھی تو اسے رونا آنے لگا تھا_

نجانے ہر خاص آدمی کا اتنا تکلیف دہ انجام کیوں ہوتا ہے؟

دادی سلی کی حساسیت سے واقف تھیں_

ان کو نجانے کیا کچھ نہیں یاد آ رہا تھا_

وہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں

" سلی! تمہارا کورس مکمل ہوتے ہی تمہاری شادی ہو جائے گی_ میں اپنی بہو سے تمہارے حوالے سے مطمئن نہیں ہوں_ میں چاہتی ہوں ہماری زندگی میں تم محفوظ جگہ پے چلی جاؤ"_

دادی نے اچانک گفتگو کا رخ موڑ دیا تھا_

سلی قدرے ہراساں ہوئی تھی یہ اچانک دادی کو اس کی شادی کی کیا سوجھی تھی؟۔ جبکہ اسے اپنی زندگی میں بہت کچھ کرنا تھا_ بہت زیادہ زبانیں سیکھ کر کسی اچھی حکومتی پوسٹ پر جانا تھا_

سرکار کا کوئی اچھا عہدہ حاصل کر کے گاؤں کی اس بیکار زندگی سے دور جانا تھا،

کچھ بننا تھا کچھ پانا تھا۔ کچھ حاصل کرنا تھا، کام یاب ہونا تھا_

مگر دادی! مجھے ابھی شادی نہیں کرنی"_

اس نے کہہ دیا، وہ دل میں یہ بات نہیں رکھ سکتی تھی

اور اگلے دن اس نے ڈی سوزا کو بھی بتایا، اجکل ڈی سوزا بڑا کھوئی کھوئی رہتی تھی اور سلی سے کم کم گفتگو کرتی تھی

سلی کو خبر تو تھی کہ کیا معاملہ ہے مگر وہ اس کی ٹوہ میں نہیں تھی

جو بھی تھا_ ڈی سوزا خداداد میں دلچسپی لینے لگی تھی_

کچھ دن بعد انسٹیٹیوٹ کے گرم کیفے ہال میں بیٹھ کر ڈی سوزا نے اس پر انکشاف کر دیا تھا

" مجھے محبت ہو گئی ہے"

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی_ یورپ میں محبت ہونا نہ کوئی واقعہ تھا اور نہ کوئی حادثہ تھا_ یہ ایک نارمل سا روٹین ورک تھا_

سلی اسے نارمل انداز میں دیکھ رہی تھی_

اس میں کچھ انہونا ہرگز نہیں تھا_

اسے ڈی سوزا پے پیار سا آیا_ آج وہ ضرورت سے زیادہ خوب صورت نظر آ رہی تھی_

"اچھا تو تم ہمارے پے انگ گیسٹ کو پرپوز کر چکی ہو"_؟

سلی نے شرارتی انداز میں پوچھا

"مجھے لگتا ہے وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے کیونکہ کل اس نے میری بھیڑ کو گھاٹی سے نکالا تھا اور مجھے ایک سرخ گلاب بھی دیا، اس کی آنکھوں میں محبت مثبت تھی"_

ڈی سوزا نے شرما کر بتایا

"کیا تم نے سر کو کہتے نہیں سنا تھا؟ کہ

میرا ایک نظریہ ہے کہ جس لمحے کوئی شخص کسی بھی چیز پر پوری توجہ دیتا ہے، یہاں تک کہ گھاس کے پتے کو بھی تو وہ اپنے آپ میں ایک پراسرار، خوفناک، ناقابل بیان حد تک شاندار دنیا بن جاتی ہے۔ میں نے یہ تجربہ ایک نہیں ہزار بار آزمایا ہے اور میں کبھی مایوس نہیں ہوا۔ میں جتنا زیادہ کسی چیز کو دیکھتا ہوں، اتنا ہی زیادہ میں اس کے باطن میں دیکھتا ہوں، اور جتنا زیادہ میں اس میں دیکھتا ہوں، اتنا ہی زیادہ اور دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ بالکل پیاز کو چھیلنے کی طرح ہے۔ آپ کو ہمیشہ ایک اور پرت محسوس ہوتی ہے اور ہر پرت پہلی سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔

میں دنیا کو اسی طرح دیکھتا ہوں۔ میں اسے اشیاء کے مجموعے کے طور پر نہیں دیکھتا، بلکہ ایک وسیع اور پراسرار جاندار کے طور پر دیکھتا ہوں۔ میں چھوٹی چھوٹی چیزوں میں خوبصورتی دیکھتا ہوں، اور مجھے سب سے عام واقعات میں حیرت نظر آتی ہے۔ میں ہمیشہ پوشیدہ معنی، خفیہ پیغام کی تلاش میں رہتا ہوں۔ میں ہمیشہ زندگی کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں جانتا ہوں کہ میں ہر چیز کو کبھی نہیں سمجھوں گا، لیکن یہ مجھے کوشش کرنے سے نہیں روکتا۔ میں اسرار میں رہنے، نامعلوم میں گھرا رہنے میں مطمئن ہوں۔ میں ایک متلاشی، متجسس، کہیں نہ جانے والے راستے کا مسافر بن کر مطمئن ہوں۔" ڈی سوزا مسکرائی_

"میں سر کے اس نظریے کی قائل ہوں_ محبت اکثر متجسس بھی ہوتی ہے"_

ڈی سوزا کے خوب صورت رخسار تازہ سیب کی مانند چمک رہے تھے_

سلی کو ایک خوب صورت نظم یاد آ رہی تھی_ جیسے وہ محبت کرنے والوں کے لیے ہی لکھی گئی تھی_

"~وہ اک نظر جاودانی سی

تیری خوش رو پیشانی پر

شفق سا اضطراب ہے

جس پر ابرو شام کی اس

ٹھنڈی ہوا کی طرح لہراتے ہیں

جسے چھو کر مسافر آسمان کی طرف

دیکھتے ہیں...

تیری آنکھیں سیاہ رات کے نقاب میں

دو ستارے بن کر جگمگا رہی ہیں

اور

لبوں پر شہاب ثاقب کی لہریں

میرے دل کے کاروان

کو زندگی کے صحرا میں

منزل کے ستارے سے بھٹکا دیتی ہیں

حسینہء خیال!! تم سراپا شام ہو

مجھے اپنے سینے کے کہساروں

کی سرائے میں ٹھہرا لو

اور اپنی انگلیوں کے پھولوں سے

مجھے شب بخیر کہو!!

صبح میں کاروان سے واپس لوٹ آؤں گا!!

تیرے رہ گزر پر منزل تلاش کرنے

تمہاری محبت کہیں میرے سامان سے

گم نہ ہو جائے

چاند کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ رہو

مجھے جاتے ہوئے

اپنی ایک چیز دے دینا:

وہ اک نظر جاودانی سی!!۔"

اسے اپنی یہ دوست بہت پیاری اور خوب صورت نظر آ رہی تھی_

اسے ڈی سوزا پے پیار آنے لگا تھا_

"تمہارے لیے خداداد کے جذبات کیسے ہیں"_

سلی کے پوچھنے پر وہ جس طرح بلش ہو رہی تھی سلی کو یہ معاملہ آگے تک چلتا محسوس ہو رہا تھا_

وہ مسکرائی اور اس نے مسکرا کر کہا

"تم کسی ایسے شخص کی مستحق ہو جو تمہیں اپنی دل کی ہر ہر دھڑکن سے محبت کرے۔ ایک ایسا شخص جو مسلسل اور مستقل تمہارے بارے میں سوچتا رہے۔ کوئی ایسا کہ جو ہر دن کا ہر منٹ اسی بات کو حیرت میں سوچتے گزار دے کہ تم کیا کر رہی ہو، کہاں ہو، کس کے ساتھ ہو، اور کیا تم ٹھیک ہو۔

کوئی ایسا جو تمہیں تمہارے خوابوں تک لے جائے اور تمہارے ہر خوف سے تمہیں محفوظ رکھے۔

تمہیں ایک ایسا شخص چاہئے جو تمہاری عزت کرے، تمہارے ہر پہلو سے محبت کرے خاص طور پر تمہاری خامیوں سے۔

تمہیں ایسے شخص کے ساتھ ہونا چاہیے جو تمہیں خوش کر سکے، خوش رکھ سکے، بہت زیادہ خوش رکھ سکے۔"

سلی نے کسی قدیم کتب خانے کے کسی صحفے سے اٹھا کر پیار بھری سرگوشی کی تھی_

یہی کیفیات سلی نے ناشتے کی ٹرے خداداد کو پکڑاتے ہوئے محسوس کی تھیں_

اس کا روشن چہرہ ایک کھلی کہانی سنا رہا تھا

''دل بہ تو بستم گل یاس دلپذیر . . .

چون کودکی کہ از مدرسہ می گریزد

و گنجشک ہا و شعر ہایش را

در جیب شلوارش پنہان می کند

مجھے جب سے تم سے محبت ہوئی ہے

میری چمبیلی

میں بالکل ایسا ہو گیا ہوں جیسے اسکول سے بھاگا ہوا بچہ

اور وہ چھپاتا ہے چڑیوں کو اور ان کی نظموں کو

اپنی پتلون کی جیبوں میں ۔۔۔"

اس نے بواریا میں اچانک کھلتے گلاب دیکھے تھے

وہ سب کے سب گیت گا رہے تھے

خداداد ہشام کا دوست تھا اور سلی ڈی سوزا کی دوست

ان کا فیوچر کس قدر جاوداں ہو سکتا تھا

اسے سوچ کر ہی لطف محسوس ہونے لگا تھا_

خلیل جبران ٹھیک ہی کہتا ہے_

''زندگی محبت کے بغیر ایک درخت ہے جس میں کوئی پھول یا پھل نہ ہو۔۔

محبت حسن کے بغیر ایک پھول ہے جس میں خوشبو نہ ہو۔۔

اور وہ پھل ہے جس میں کوئی بیج نہ ہو۔۔

زندگی، محبت اور حسن ایک عنصر کی تین ماہتیں ہیں۔۔

آزاد اور لامحدود۔۔

جو نہ کبھی بدلتی ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہے۔۔"

سارا ابوار یا مسکرا رہا تھا

"زندگی میں معجزے نہیں ہوتے کیا؟"

رسول حمزا توف کہتے ہیں_

"_میں معجزوں کو نہیں مانتا

موت اگر خود کو منواتی ہے

تو

اسے آنے دو!

محبت مگر ایک برس میں؛ مجھے

تمہارے پاس واپس لوٹائے گی۔۔۔۔۔

ایک دور بستی کا مسافر بن کر

میں تمہارے در پر دستک دوں گا

میرے سنگ کچھ اگر

تم نے راحت پائی تو میں؛ بھی

ٹھہر جاؤں گا؛ ورنہ

اے دوست!

اک بار پھر سے میں مر جاؤں گا"_

جتنی حسین سویر تھی ویسی ہی بدترین سہ پہر ثابت ہوئی تھی

کسی نے بتایا کہ

ڈاکٹر ہشام کی والدہ وفات پا گئی ہیں

یہ خبر جیسے بجلی بن کر گری تھی_

وہ سب لوگ باجماعت ڈاکٹر ہشام کے پاس جانے کی تیاری میں تھے_

ان کی والدہ بیمار تھیں اتنی تو خبر تھی مگر ایسی بیمار بھی نہیں تھیں کہ چل ہی پڑتیں_

ان سب کو مشترکہ افسوس تھا کیونکہ ڈاکٹر ہشام سب کا پسندیدہ اتالیق اور بہت ساری زبانوں پر عبور رکھنے والا پہلا پاکستانی تھا_

جب وہ لوگ پہنچے تو ہشام کی والدہ کی آخری رسومات چل رہی تھیں_ ان کو کرسچن عقائد کے مطابق دفن کیا گیا اور رسومات کی گئی تھیں

سلی نے ہشام کو بہت غم زدہ دیکھا تھا اس کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے انار کے خون آلود دانے ہوں

وہ نڈھال تھا

اور شاید بہت اکیلا بھی

اس لیے جب سب لوگ چلے گے تو البانوی لڑکی رک گئی

اس نے جانے سے انکار کیا جب ڈی سوزا اسے بار بار واپسی کا کہہ رہی تھی

"تم جاؤ_ میں بعد میں آتی ہوں_ اس کو میری ضرورت ہوگی"_

ڈی سوزا نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور چلی گئی

ہشام کے پاس اس کا دوست خداداد بھی موجود تھا اور سلسبیل کے علاوہ باقی لوگ جا چکے تھے

مکتب عشق میں پہلا امتحان جاری تھا_

سلی کو لگا آج شہر کی ساری سوگ وار فضا ہشام کے جذبات کا پیراہن بن کر باجماعت سلی سے کہہ رہی ہے_

"تمہاری محبت نے سکھایا

غم کیسے سہا جاتا ہے

صدیوں سے اک ایسی عورت کی تلاش تھی مجھے
جولذت غم سے
آشنا کرتی
اک ایسی عورت،
جس کے کندھوں پر سر رکھ کر
کسی پرندے کی طرح رو پاتا
اک ایسی عورت،
جو ٹوٹے ہوئے شیشے کی طرح
میرے وجود کے ذروں کو سمیٹ پاتی
اے راحت جاں
تمہاری محبت نے
مجھ میں بدترین عادات کو ابھارا
تمہاری محبت نے سکھایا
کس طرح ہر رات
ہزار بار قہوہ پیا جائے،
طبیبوں کے ہاں جایا جائے
اور جوتشیوں سے قسمت کا حال معلوم کیا جائے
تمہاری محبت کی عنایت ہے
بے مقصد باہر پھرنا
گلیوں کی خاک چھاننا
تمہارے خدوخال

بارش کی بوندوں،
اور روشنیوں کی جھلملاہٹ میں تلاش کرنا،
تمہارے عکس کو
اجنبیوں کے چہروں میں ڈھونڈنا
حتیٰ کہ تمہاراا احساس مہک
اخباروں میں بھی محسوس کرنا
یہ تمہاری محبت ہی ہے
جس نے مجھے افسردگی کے شہر سے آشنائی بخشی
قبل ازیں اس سے
کبھی گزر نہیں ہوا تھا
مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا
کہ انسان کا آنسو اس قدر ملائم و شفیق ہوتا ہے
اور انسان
آنسوؤں کے بغیر
محض اک یاد ہے.
تمہاری محبت نے سکھایا
بچوں کی طرح دیواروں پہ چاک سے تمہارا نقش بنانا.
تمہاری محبت نے سکھایا،
کس طرح محبت،
وقت کی پیمائشوں کو بدل کے رکھ دیتی ہے
میں جب تمہیں پیار کرنے لگتا ہوں

زمین تب بھی
اپنے محور پہ رکی رہتی ہے
تمہاری محبت نے سکھایا
فریب نظر کسے کہتے ہیں
تمہاری محبت نے سکھایا
کس طرح غیر اہم چیزوں میں
تم سے محبت کا احساس تلاشہ جائے
جیسے مۓ،
خزاں رسیدہ درخت،
گرتے زرد پتے،
برستی بارش،
اور ہر اس کیفے ٹیریا میں،
جہاں ہم نے سیاہ قہوہ پیا
متاع جاں
تمہاری محبت نے سکھایا
غیر معروف ہوٹلوں میں قیام کرنا
گمنام ساحلوں پے
سستانہ،
اور بن آنسوؤں کے رونا.
تمہاری محبت نے سکھایا
غم کیسے سہا جاتا ہے

صدیوں سے اک ایسی عورت کی تلاش تھی مجھے،
جو لذت غم سے آشنا کرتی
اک ایسی عورت
جس کے کندھوں پہ سر رکھ کر
کسی پرندے کی طرح
رو پاتا
اک ایسی عورت
جو ٹوٹے ہوئے شیشے کی طرح
میرے وجود کے ذروں کو سمیٹ پاتی۔

School of love

Your love taught me how to grieve,
And for centuries i needed a woman to make me grieve,
needed a woman to make me cry on her shoulders like a bird,
needed a woman to collect my pieces like broken glass,
Oh my lady, your love taught me the worst of my habits,
It taught me how to drink coffee a thousand times every night,
It taught me how to visit doctors and ask soothsayers,
It taught me to go out to scan the streets,
To seek your face in the rain and in the lights,
To chase your shadow in the faces of strangers,

To hunt your aura even in the newspapers,
Your love showed me the sadness city,
have never entered ere you,Which I
have never known that the tear is humanbe,
And the human without tears is just a memory
Your love taught me how to draw your face on the walls
with chalk like kids
It taught me how love can change the map of times,
It taught me that when i love, the earth stands still,
Your love showed me what hallucination is,
It taught me how to love you in every little thing,
In the beer, autumn trees,
In the falling yellow leafs,
In the rain,
In every cafeteria in which we drank our black coffee,
My lady your love taught me to sleep in nameless hotels,
And sit by nameless shores,
It taught me to weep without tears,
Your love taught me how to grieve,
And for centuries i needed a woman to make me grieve,
needed a woman
To make me cry on her shoulders like a bird,
needed a woman to collect my pieces like broken glass.

:یہ جرمن کا شہر اور شہر محبت میں وارد ہوتی ایک چھوٹی سی جزباتی لڑکی سلسبیل تھی_

ہشام نے اسے دیکھا اور اس کی سرخ آنکھیں شیشہ ہوگئیں_

"تم گئی نہیں"_؟

اور فضا نے کہا

"کیا تم کو اکیلا چھوڑ کر؟_"

"میں اکیلا کب ہوں؟ میرے ساتھ میری تنہائی ہے"_

"اب تنہائی کو جانے دو_ میں تمہارے پاس آچکی ہوں"_

ہر طرف ہیبت ناک خاموشی تھی اور اس کو چٹخاتی کبھی کبھی لہر بن کر اٹھتی ہشام کی آواز تھی

"میری ماں نے ایک شریف آدمی کو بہت زیادہ استعمال کیا، اس کا پیسہ اس کا وقت اور اس کی اولاد بھی"_

وہ بے حد رنجیدہ تھا

"میں یہاں قایم تھا اس وقت تک کہ میری ماں کی آخری رسومات ہو جاتیں_ شاید میں یہ شہر چھوڑ دیتا"_

وہ کہہ رہا تھا اور سلی برف بن کر سن رہی تھی

"مگر"_

وہ رکا تو سلی کی سانس الجھ گئی

"مگر یہ کہ شہر باندھ بھی لیتے ہیں"_

اور سلی نے اپنی الجھی سانس کو رواں کیا

وہ محبت نگر کے ایک جیسے مسافر بن گے تھے_ وہ الگ الگ تھے مگر ایک ہو گے تھے_ وہ خداداد تھا ہشام تھا ڈی سوزا تھی یا سلسبیل_

وہ الگ الگ تہذیبوں والے ایک جگہ پے یکجان کھڑے تھے

جیسے کبھی بچھڑیں گے ہی نہیں_
جیسے کبھی الگ ہی نہیں ہوں گے
جیسے کبھی جدا ہی نہیں ہوں گے
اس رات بواریا کے جنگلوں میں رقص رہا
اور کہیں سوگواریت بھی چلتی رہی
اس رات کچھ اجنبی ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لیے جان گئے تھے_اس رات محبت ایک خوب صورت ناتا بن گئی تھی
اور بواریاں میں مختلف شاعرات مل کر اپنی نظمیں گنگنا رہی تھیں
وہ نہیں سمجھتی
"مجرم" ہونے کا مطلب کیا ہے
وہ قید خانے کے دروازے پر
اُس وقت تک انتظار کرتی ہے
جب تک کہ وہ اُسے دیکھ نہیں لیتی
تا کہ وہ اُس سے کہہ سکے
"اپنا خیال رکھنا۔"
جیسے کہ وہ اُس سے کہا کرتی تھی
جب وہ اسکول کے لیے نکلتا تھا
جب وہ دفتر کے لیے نکلتا تھا
جب وہ چھٹیاں منانے کے لیے نکلتا تھا
وہ نہیں سمجھتی

اب اُن کی زبان پر کیا الفاظ ہیں

وہ جو سلاخوں کے پیچھے ہیں

اپنی یونیفارم پہنے

جنہوں نے اُس بات کا فیصلہ کیا

کہ اُسے وہاں تاریک دنوں کے اجنبیوں کے ساتھ رکھا جائے۔

اُن دور دراز راتوں کے دوران

اُس کے بستر پر

اُسے لوریاں سناتے ہوئے

کبھی یہ خیال اُس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

کہ اُسے چاند اور کھڑکیوں سے محروم

ایسی سرد جگہ پر رکھا جائے گا

وہ نہیں سمجھتی

قیدی کی ماں نہیں سمجھتی

کہ وہ کیوں اُس سے جدا ہو جائے

صرف اس لیے کہ "ملاقات کا وقت" ختم ہو گیا ہے"_

وہ سچ میں نہیں سمجھتی تھی کہ "محبت" میں قید ہونے کا مطلب کیا ہے؟

اور محبت کیا کسی کو راس آتی ہے؟؟

تب ہی خداداد گرم بھاپ اڑاتی کافی کے مگ لے آیا_ یہ سرد اور برفیلی رات تھی_ جہاں وہ ایک اجنبی زبان میں اپنے دوست کو محبت کی تشریحات بتا رہا تھا_

قدیم سنسکرت ادب میں عشقیہ شاعری کی ایک مضبوط روایت رہی ہے۔ 'امارو' بھی عشقیہ شاعری کا ایک بڑا نام رہا ہے۔ Erotic love کے حوالے سے اس کی ایک الگ شناخت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں Andrew Schelling نے 'امارو شتک' کا ترجمہ Erotic love poems from india کے نام سے کیا ہے۔امارو کی پوری شاعری شرنگار رس سے بھری ہوئی ہے اس میں برہ اور ملن کی بڑی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔آنند وردھن نے بھی اس کی بڑی تعریف کی ہے۔میرا جی لکھتے ہیں:

''امارو شتک، امارو کی سو نظموں کو ہندوستان بلکہ دنیا کی عشقیہ شاعری میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔امارو کی شاعری نے سنسکرت ادب میں پہلی بار اس حقیقت کو منوایا کہ صرف محبت ہی کو شاعری کا بنیادی موضوع بنا کر گوناگوں نغمے چھیڑے جاسکتے ہیں_ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیائے ادب کی تمام شاعری کا محور بوا ریا کی سلسبیل ہوناتھا" وہ لحظہ بھر کو مسکرایا تھا تا کہ فضا کی کثافت کم ہو سکے_

کہنے والے نجانے کس کس کے لیے لکھ گے ہیں_ میرا جی نے کہا "اگر مجھے والمیکی کی قابلیت حاصل ہو جاتی تو میں اپنی پریتم کے متعلق ایک نظم لکھتا۔پہلے دس شعر اس کے ہاتھوں کی دس انگلیوں کے بارے میں ہوتے، کیوں کہ انہیں انگلیوں نے ایک ایسا نقاب گوندھا جس میں؛ میں نے اپنے پہلے تمام افسانہ محبت لپیٹ دیے ہیں۔اور دوسرے دس شعر اُن دس راتوں سے منسوب کرتا جو ہم نے ما بھ باٹ میں گزاریں

''اے دریا میں نے تجھے منبع پر بھی دیکھا ہے:
ایک بچہ بھی تجھے پھلانگ سکتا ہے،
پھولوں کی ٹہنی سے بھی
تیرا راستہ بدلا جاسکتا ہے
لیکن اب تو ایک پھیلا ہوا طوفان ہے
اور اچھی سے اچھی کشتی کو بھنور میں گھیر سکتا ہے افسوس دیا متی!
دیا متی کی محبت!

وہ مجھے پوری طرح پرنام کرتی ہے اور پھر جھالر کے نیچے اپنے پاؤں کھینچ لیتی ہے
وہ اپنی پنکھیا پر بنے ہوئے پھولوں کو غور سے دیکھتی ہے
اگر میں اُس کی ہرنی کو پچکاروں تو وہ اپنی مینا کے پروں کو سہلانے لگتی ہے اگر میں اُس سے کچھ کہوں
تو وہ اپنی سکھیوں سے بات کرنے لگتی ہے
اُس کی ان شرمیلی اداؤں میں مجھے بے شمار مسرتیں حاصل ہوتی ہیں
اگر میں ندی سے اپنا دکھ کہوں
تو ندی میرے لیے ٹھہر جائے
اگر میں کھجور سے کچھ کہوں
تو کھجور کا پیڑ میرے لیے جھک جائے
لیکن تم گاتی ہوئی چلی جاتی ہو
اور میری طرف دیکھتی بھی نہیں
اگر ندی میرے لیے نہ رکی
تو کم سے کم میں اس میں اپنی آنکھیں ہی دھو کر ٹھنڈی کرلوں گا
اگر پیڑ میرے لیے نہ جھکا
تو کم سے کم اس کا سایہ ہی مجھ پر رہے گا
آج پھر میں نے شرم اور جھجک کو بھلا کر
تم سے اپنا حال کہا
لیکن تم اپنے ہونٹوں کا امرت،
اپنے سائے کی چھاؤں مجھے نہیں دیتیں
چپ رہو!

تمھاری پیار کی باتیں میری خوشی کو نہیں بڑھاتیں

بولنا بند کر دو!

سورج کی اس کرن کے اُجالے میں بیٹھی رہو!

وہ مر چکی ہے!!

لیکن پھول اب بھی مُسکراتے ہیں

اے موت! اس لڑکی کو حاصل کرنے کے بعد تجھے مارنے کی فرصت کیسے ملتی ہے؟

اے صبح! جنگل نے تجھے قیدی بنا رکھا تھا

اور پیڑوں کے تنے

تیرے بندی خانے کی سلاخیں تھیں

ندی کا گیت تیرے لیے خوشیوں سے بھرپور تھا

اور جنگل کی گھاس تیرے لیے نرم تھی

لیکن تو نے،

روشنی سے، اپنا پنجرہ توڑ ڈالا

اور اے صبح! تو چلی گئی۔۔۔۔

مجھے مادھوی کا دھیان آتا ہے

جو مجھ سے

ایک رات صبح تک پیار کرتی رہی

طوفان کے باوجود وہ آ ہی گئی

کاش تم نے پیڑوں کے پھولوں سے

اس کے بالوں پر پڑتی ہوئی پھوار دیکھی ہوتی؟

کاش اس کی موتیوں کی مالا ٹوٹ کر اس کی چھاتیوں پر چمکنے لگتی

اے رات! تو کئی بار میرے پاس دبے پاؤں آئی ہے

اور تو نے میرے روتے ہوئے چہرے کو چھپالیا

آج کی شام میرے پیالے میں امرت دمک رہا ہے اور میرے پریتم

میرے سینے پر سر رکھے سو رہے ہیں

اے رات! آج کی رات

جب تک تیرا جی چاہے میرے ہی پاس رہ!

اگر تمھیں میرے پیار یاد ہیں تو جب تم اپنی پیاری کو زور سے بھینچو تو ایک بار چپکے سے میرا نام بھی لے لینا

دیکھنا! یہ بسنت کی ہوائیں

جو صبح سویرے کنول کی خوشبو سے بوجھل ہیں،

اس لڑکی کے ماتھے سے چمکتے ہوئے پسینے کو کس طرح صاف کر دیتی ہیں

اور کسی پردیسی کی طرح اس کے گھونگھٹ کو چھیڑتی ہیں اور

اس کی شکتی اسے واپس دے دیتی ہیں۔

میں اس جوشیلی اور رس بھری آواز کو زیادہ اچھی طرح سننے کے لیے گھر سے باہر نکل آیا ہوں

یہ آواز جو کھیتوں کو چوم رہی ہے،

یہ آواز تو گویا کسی عورت کی آواز ہے

حرارت سے لبریز اور سنجیدہ،

محبت میں ڈوبی ہوئی! لیکن یہ تو بند ہوگئی

بلبلیں آج رات چپ ہی رہی ہیں۔

اور وہ عورتیں جنھوں نے اپنی بنسریاں توڑ دی ہیں

پایاب پانی کے کنارے سپنے دیکھنے کو جاتی ہیں

آرزو، احساس اور بے صبری سے لرزتے ہوئے وہ لمبے سفر کے بعد اپنی محبوبہ کے مکان میں داخل ہوا اور اس نے دیکھا کہ اُس کی سکھیاں اُسے گھیرے ہوئے ہیں۔ اس کی سکھیوں کو اپنی ملاقات بڑھانے میں ایک تیکھا مزہ آتا تھا، لیکن اس کی محبوبہ اس سے بھی زیادہ مشتاق تھی،

اور یہ چلاتے ہوئے اوئی! یہ کیا کاٹ گیا؟

اس نے اپنا گھونگھٹ اٹھایا اور اس گھونگھٹ سے اس اکیلے دیے کی لو کو بجھا دیا جو وہاں جل رہا تھا،

اور اندھیرے کی وجہ سے اس کی سکھیاں رخصت ہو کر چل دیں۔۔۔

اس نے پھولوں کو اپنی ڈاب میں رکھ لیا اور ان کی پتیاں سمٹ کر بند ہو گئیں

وہ بولی: لو دیکھو، یہ کیا ہوا!

اور میں نے جواب دیا:

تم نے اپنی کالی آنکھوں کی سیاہی سے انہیں دیکھا اور وہ سمجھے کہ رات ہو گئی!!

تمہیں مجھ پر رحم کیوں نہیں آتا؟ دیکھو، ستارے سمندر سے نفرت نہیں کرتے

وہ اُن میں اپنے عکس کو سراہتے ہیں

سامنے وہ سفری بادل چاند کے قدموں میں آکر ٹھہر گیا

اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا

اے تو!! کہ جو کسی دن ان شعروں کو پڑھے،

ذرا سوچنا تو سہی

کہ انھیں لکھتے ہوئے میں نے آہ کیوں بھری؟

تمھارے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے ہیں

اور

وشم آویت کا تاریک جنگل

مصرا کیشی کے رنگین مندر کو

اپنی گود کے گھیرے میں لیے ہوئے ہے!!

جب سے تم چلی گئی ہو
کسی نے مجھ سے تمہاری بات نہیں کی
لیکن ہوا جب گزر رہی تھی تو میں نے تمہارا نام کیا
اور ایک شخص مر رہا تھا تو
اس کے سامنے بھی میں نے تمہارا نام لیا
میری پیاری! اگر تم زندہ ہو تو
کسی دن ہوا کا گزر تمہارے پاس سے ہو گا
اور اگر تم مر چکی ہو تو
اس شخص کی روح تمہیں بتا دے گی
کہ مجھے تم اب بھی یاد ہو!!
گیا تری! تیری محبت تو بجروں والی جھیل میں کسی شاخ کی پرچھائیں سے بھی زیادہ ناپائدار ہے
جب بجرے جا چکیں تو
جھیل آئینے کی طرح ہموار ہو جاتی ہے
لیکن تیرے دل میں مجھے معاف کر دینے پر بھی
میرے متعلق بدگمانیاں ہیں
میرے باغ کے پیڑوں پر بیٹھے ہوئے پرندو!
کیا تم اپنے موسیقانہ جال میں
میری آرزوؤں کو گرفتار کر سکتے ہو؟
میری آرزوئیں میری پریتم کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہیں
جسے میں نے تیس دن سے نہیں دیکھا ہے
میری آرزوئیں جلدی میں ہیں
کہ اس کے معطر سینے کو جا چھوئیں

اور اس کی بھینی آواز میں گھل مل جائیں

اچھے پرندو! انھیں نہ روکو!"_

وہ بول رہا تھا جیسے رس گھول رہا تھا

''مجھے لگتا ہے یہ دور دیس کی کوئی امرتا ہے

اور ڈاکٹر ہشام! تم اس کے پریتم ہو"_

اور وقت جیسے رک گیا تھا

:رات بہت گھنیر تھی جب سلی نے اپنی روش پہ قدم دھرا_

اس کا دل دھڑک رہا تھا،

ڈاکٹر ہشام کی والدہ کی رسومات کو ختم ہوئے بھی کئی گھنٹے گزر چکے تھے_ سلی خوف زدہ تھی۔ نجانے ممی اب اس کا کیا حشر کرے گی؟

اس نے خوف سے کانپتے دل کے ساتھ دروازے پہ ہاتھ رکھا تھا_

خداداد اس کے ساتھ آیا تھا، اور وہ بیرونی سیڑھی سے اپنے روم میں جا چکا تھا_ خطیب نے اس کے لیے لاک کھول دیا تھا، اب وہ حیران سا سلی کو دیکھ رہا تھا،

"یہ اس وقت کیا کر رہی ہے؟_"

سلی نے نظر چرا لی اور یوں ظاہر کیا جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا_

کچھ دیر بعد دادی نے دروازہ کھولا_ کیونکہ وہ دادی کے کمرے والی کھڑکی ناک کر رہی تھی

جیسے ہی وہ دروازے تک آئی دہاڑ کے ساتھ کوئی گرم اور سخت چیز اس کے گال پر لگی تھی_ سلی کی چیخ نکل گئی تھی یہ گرم سخت اور بھاری ہاتھ ممی کا تھا_ وہ اسے خون خوار نظروں سے گھور رہی تھی۔

❁ ❁

ناول سلسبیل کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 12 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 11

سلسبیل پر حملہ بہت اچانک تھا اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا گیا اور تھپڑ مارے گے یہ تھپڑ مارنے والا کوئی اور نہیں بلکہ بروزو تھا_

سلسبیل ششدر رہ گئی تھی_ بروزو اسے بالوں سے پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف لے گیا_ ممی اب چپ کونے میں کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی_

سلسبیل چیخنے لگی تو بروزو نے اس کے منہ پر سخت ہاتھ رکھا_ سلسبیل نے حسرت سے ممی کو دیکھا

"ممی! مجھے بچالو"_

وہ شدت سے رونے لگی تھی_

مگر ممی ایسے ہی بے حس کھڑی رہی

جیسے کوئی مجسمہ ہو_ اور کچھ بھی اسے نظر نہ آرہا ہو_

"ممی"

وہ چلائی_

"دادی"

اس نے درد سے پکارا مگر کسی نے اس کی پکار نہیں سنی وہ روتے روتے بروزو کے بازو میں جھولنے لگی۔۔۔

بروزو کے ہاتھ پر کیسی دوا لگی تھی جس نے سلسبیل کو کچھ ہی دیر میں ہوش سے بیگانہ کر دیا تھا_

اس کے بعد جیسے منظر خالی سا ہو گیا_ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے بننے لگے تھے_ اور نیلی

نیلی روشنی پھیل کر ختم ہونے لگی اس نے اپنے شانوں پر کسی سخت مرد کے ہاتھ محسوس کیے_ اس کے گداز بازو سنگلاخ انگلیوں سے سن ہورہے تھے_ ابھی اس کا ذہن سو نہیں رہا تھا مگر سن ہو رہا تھا بلکل ایسے ہی اس کا جسم بھی سن ہورہا تھا_ مگر وہ بول نہیں پا رہی تھی

یہ اس کے گھر کا تہہ خانہ تھا_ جہاں ایک پرانا بستر پڑا تھا جس پر وہ خود تھی اور اس کے جسم پر کوئی جانور قبضہ کر کے بیٹھا تھا

وہ کوئی جن تھا دیو تھا یا کوئی شیطان تھا

"بدکار لڑکی! ڈاکٹر کو تم نے بوائے فرینڈ بنالیا اور ہم للچاتے ہی رہ گے"_

بروز وہ اس کو کسی گدھ کی طرح نوچ رہا تھا_

اور اس کی کوئی چیخ اگر تھی بھی تو گھٹ گھٹ کر ختم ہو رہی تھی_

یہ سب کیا تھا؟

کیا ہورہا تھا؟

وہ ایک پاکیزہ لڑکی تھی

اس کے بہت خواب تھے

اس نے بہت ساری زبانیں سیکھ کر ہائی کمیشن میں شاندار نوکری کرنی تھی_ اس نے ابھی محبت کا ذائقہ چکھا تھا_ ابھی محبت میں ہشام کے ساتھ لمبا سفر کرنا تھا اس نے ہشام کے ملک جانا تھا

مگر یہ کون جو اسے نوچ رہے تھے پہلے وہ ایک تھا پھر وہ دو سے تین ہو گئے_ یہ سب جیسے پلاننگ سے چل رہا تھا_ کسی نے کیمرہ کھول کر وڈیو بھی بنائی تھی_ سلی بند آنکھوں سے کچھ دیکھ نہیں پا رہی تھی_ وہ سارے گدھ اسے نوچ کر کسی کوڑے دان کی طرح پھینک کر نکل گئے تھے_ اور سلی کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ زندہ تھی؟

شاید وہ زندہ تھی؟

یا زندگی کی جنگ ہار گئی تھی؟

اس کا ذہن تاریکی میں چلا گیا تھا اور بہت ساری گہری خاموشی نے سلسبیل کے اردگرد حصار بنا لیا، سورج چڑھتا اور ڈوبتا رہا

ایک دن دو دن اور شاید وہ تیسرا دن تھا

جب تہہ خانے سے سلی کی بساند نما لاش کو اٹھایا گیا، اس کی دادی کہاں تھی؟

اس کے دادا

اس کا بھائی ڈینی؟

ڈی سوزا کہاں تھی؟

کسی نے سلی کو تلاش نہیں کیا؟

وہ سوچنا چاہتی تھی مگر اس کا ذہن پھر سے تاریکی میں چلا گیا

جب وہ زندگی کی رمق کو خود میں محسوس کر رہی تھی_ اس کے گرد صرف اس کی دادی تھی

اس کے اردگرد صرف خاموشی تھی_

گھر میں لگتا تھا جیسے کسی کی موت ہو گئی ہو؟

اس کے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا

ہاں بہت دیر بعد اس کی تھکی ہاری دادی دکھائی دی تھی

سلی کا دل کیا وہ دادی سے لپٹ کر چلا چلا کر روتی رہے_

مگر ایسا کچھ نہ ہوا

اس کے لب سل گئے تھے اور وہ بے انتہا صدمے کی شکار دادی کی طرف دیکھ بھی نہیں پائی تھی

دادی نے اس کے زخمی وجود کو اپنی آغوش میں بھر لیا تھا وہ اسے چوم رہی تھی

دادی کے لباس سے بکریوں کے دودھ کی بساند تھی جو سلی کو اس وقت مشک عنبر نما لگ رہی تھی

"دادی"_ سلی نے چلا چلا کر حلق زخمی کر لیا تھا

"دادی! بروز دونے"_

اور دادی کا ضبط ٹوٹ گیا تھا

وہ بے انتہا رونے لگی تھی، اس کا بوڑھا وجود تھرا رہا تھا

اس کے آنسو گرگرم ہو رہے تھے

"سلی! تم چپ کر جاؤ"_

مگر چپ ہونا کچھ آسان نہ تھا_ وہ ایک گہرے صدمے کا شکار تھی

شاید وہ اس صدمے سے کسی طور نکل آتی کہ اس پر کچھ خبریں بجلی بن کر گری تھیں_

"دادی! میرے پاپا؟ میرے دادا کدھر ہیں؟ دادی! ممی نے میرے ساتھ"_ اور سلی دادی کی بانہوں میں جھول کر بے ہوش ہو گئی تھی، اس پر صدمات کا ایک طوفان ٹوٹ پڑا تھا_

دادی بس رو رہی تھی مگر اس کے کسی سوال کا دادی کے پاس جواب نہیں تھا_

"دادی؟ اتنی خاموشی کیوں ہے؟ سب لوگ کہاں ہیں؟_"

اس کا جسم لرز رہا تھا_ بخار نے اسے تندور بنا رکھا تھا، اس کے ہونٹ نیلے تھے اور ان پر لرزہ طاری تھا_

"سلی! جب تم نہیں ملی_ ہم نے بہت تلاش کیا_ تمہارے دادا لاٹھی لے کر نکل گے_ رات تھی اور وہ صدمے سے بے حال تم کو گھاٹیوں میں تلاش کرنے گے_ جنگل کی طرف وہاں ان کو زہریلے سانپ نے کاٹ لیا_ تمہارا باپ بھی تم کو مارا مارا ڈھونڈھ رہا تھا_ جب اسے اپنا باپ نہیں ملا وہ اسے تلاش کرنے نکلا اور گھاٹی میں گر گیا_ اس کے پیچھے ڈینی گیا_ مگر تمہاری ماں نے اسے روک لیا_ کچھ دیر بعد وہ ڈینی کو لے کر ان کو تلاش کرنے نکل گئی_ مجھے تب پتہ نہیں چلا_ وہ عورت پھر واپس نہیں آئی، خطیب نے اس کو دیکھا تھا، وہ ٹرین میں سوار ہو کر گئی اور پھر واپس نہیں آئی_ تمہارے دادا اور باپ نہیں رہے

اور میں تم پر فاتحہ پڑھ چکی تھی_ میں بروزو کے خلاف رپورٹ کروا دی تھی تو اس نے تم کو تہ خانے سے نکال دیا، اس کے پیچھے تمہاری سوتیلی ماں کا ہاتھ تھا_ وہ ڈائن میرا گھر کھا گئی_ اس نے

بروز و سے پیسہ وصول کیا اور نجانے کس ملک چلی گئی_ اس کا کچھ پتہ نہیں"_

یہ کہتے ہوئے دادی اس قدر روئی کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں

"جب سے میرا گھر حادثے کا شکار ہے بکریاں بھوکی رہنے لگیں_ کچھ مر گئی ہیں_ بیکری بند پڑی ہے اور میں تمہاری بے ہوشی ٹوٹنے کا انتظار کر رہی ہوں،"

دادی نے سلی کو سینے میں سمولیا

"دادی"_ سلی چلا چلا کر اپنے اوپر گزرنے والی قیامت کا بتا رہی تھی_

"دادی! ممی نے ایسا کیوں کیا؟_"

"دولت نے اس کو اندھا کر دیا تھا_ وہ لالچ میں آ گئی_ اس نے ہم سب کو مار دیا،"

دادی کا وجود لرز رہا تھا

دادی! لوگ اتنے سنگ دل اور ظالم کیسے ہو سکتے ہیں؟_"

سلی کی آنکھیں صدمے سے سفید پڑ گئی تھیں،

"ہم ایسے لوگوں سے توقعات لگا لیتے ہیں جو اس قابل نہیں ہوتے"_

"اس کی مثال ایک ایسے حرامی مالک جیسی ہے جو اپنے وفادار کتے کو لاتیں مار کے ہلاک کر دیتا ہے"_

دادی نے گہری سانس بھری_ شاید وہ اس حقیقت کو کسی حد تک تسلیم کر چکی تھیں ان کو یقین ہو چلا تھا کہ سلی کے بغیر اب ان کا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا_

وہ سلی کو کھونا نہیں چاہتی تھیں_

سلی کی حالت غیر تھی اسے خطیب کی مدد سے دوائی وغیرہ دی جا رہی تھی_ اس مشکل وقت میں خطیب نے ان کی بہت مدد کی تھی_ خطیب نے بتایا تھا کہ ہشام کی والدہ انتقال کر گئی ہیں اور خدا داد اپنے دوست کے پاس اس کی دلجوئی کے لیے ہے_

ڈی سوزا ان دنوں ان کے گھر نہیں آ رہی تھی

اس کے ڈیڈی نے سلی کے اغوا کے بعد ڈی سوزا کو گھر میں روک دیا تھا_
سلی کی صحت کچھ بہتر تھی
دادی اسے بہت وقت دے رہی تھیں اس کا سر گود میں لے کر اسے چومتی رہتی تھیں اس کی دل جوئی کرتی تھیں اسے صبر اور حوصلہ دیتی تھیں
مگر سلی کے اندر زندگی دھیرے دھیرے ختم ہو رہی تھی
اس دن دھوپ نے اپنے پر پھیلائے تو دادی نے پردے کھینچ دیے تھے
وہ سلی کو صحت بخش غذا کھلا رہی تھیں تا کہ اس کے جسم میں طاقت بھر سکے
"دادی لوگ کیسے بدل جاتے ہیں؟_"
سلی کا دل ڈی سوزا کے گھر کو دیکھتے ہوئے ڈوب رہا تھا،
"ایسے بدلتے ہیں کہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے_ جیسا کہ تمہاری سوتیلی ماں جس کی مثال کتے کے اس مالک جیسی ہے"_
دادی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا تھا
"سلی! کسی سے امید کی توقع مت کرنا_ زندگی بہت تلخ پیام دے چکی ہے_ میں تم کو ایک واقعہ سناتی ہوں

ایک رات کا ذکر ہے، دکاندار دکان بند کرنے ہی والا تھا کہ ایک کتا دکان میں گھس آیا۔ اس کے منہ میں ایک تھیلا دبا ہوا تھا۔ اس نے وہ تھیلا دکاندار کی جانب بڑھایا۔ دکاندار سمجھ گیا کہ وہ اسے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ دکاندار نے تھیلا کھولا تو تھیلے میں خریدی جانی والی اشیاء کی فہرست اور رقم موجود تھی۔ دکاندار نے پیسے لیے اور مطلوبہ سامان تھیلے میں رکھ دیا۔ کتے نے فوراً سامان کا تھیلا اٹھایا اور چلا گیا۔ دکاندار کتے کے افعال سے بہت حیران ہوا اور یہ جاننے کے لیے کہ اس کا مالک کون ہے اس نے کتے کا پیچھا کرنے کی ٹھانی۔ کتا بس اسٹاپ پر پہنچا اور بس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک بس آئی اور کتا بس میں چڑھ گیا۔ جیسے ہی کنڈکٹر نزدیک آیا، وہ اپنی گردن کا پٹہ دکھانے کے لیے آگے بڑھا جس میں کرایہ اور پتا دونوں ہی موجود تھے۔ کنڈکٹر نے پیسے لیے اور ٹکٹ دوبارہ گلے

میں بند ھے پٹے میں ڈال دیا۔

جب وہ منزل پر پہنچا تو کتا سامنے کے دروازے کی طرف گیا اور اپنی دم ہلا کر اشارہ کیا کہ وہ نیچے اترنا چاہتا ہے۔ بس جیسے ہی رکی، وہ نیچے اتر گیا۔ دکاندار ابھی تک اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

کتے نے ٹانگوں سے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کا مالک باہر نکلا اور اسے لاٹھی سے بری طرح مارنے لگا۔

حیران و پریشاں ہو کر دکاندار نے اس سے پوچھا کہ "تم کتے کو کیوں مار رہے ہو؟"

جس پر مالک نے جواب دیا، "اس نے میری نیند میں خلل ڈالا، یہ چابیاں اپنے ساتھ بھی تو لے جا سکتا تھا!"

یہی زندگی کی سچائی ہے۔ لوگوں کی آپ سے توقعات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ جس لمحے آپ غلط ہوتے ہیں، وہ آپ کی غلطیاں گنوانے لگتے ہیں۔ ماضی میں کیے گئے تمام اچھے کام بھول جاتے ہیں۔ اک ذرا سی غلطی پھر بڑھ کر رائی سے پہاڑ بن جاتی ہے۔ یہ اس مادی دنیا کی فطرت ہے_ لوگ بہت ظالم ہیں۔ یہ تمہاری اچھائی کو یاد نہیں رکھیں گے۔ یہ بھول جائیں گے تم کتنی اچھی ہو یہ بس یاد رکھیں گے تم اغوا ہوئی اور زیادتی کا شکار بنی_

میں چاہوں تو پولیس کیس میں تم کو انصاف دلا دوں۔ مگر میں تمہاری روح کو زخمی نہیں کر سکتی جبکہ تمہارا جسم پہلے سے زخمی ہے۔ میں چاہتی ہوں تم بھول جاؤ کہ کیا ہوا؟ سلی! میں تمہاری خاطر یہ جگہ تک چھوڑ دوں گی مگر تم کو کسی کے بارے میں کچھ نہیں سوچنا ہو گا میں تم کو کھونا نہیں چاہتی"

دنیا میں وبایں بار بار پھوٹتی ہیں مگر بیٹھے بٹھائے ایسا کچھ آپ پر نازل ہو جائے تو اول اول بے یقینی ہی ہوتی ہے اور سلی کے ساتھ بھی یوں ہی ہوا_ یہ ایسا ہے جیسے جنگ چھڑ جانے پر لوگوں کو یقین نہیں آتا اور پھر وہ کہنے لگتے ہیں یہ حماقت ہے اور بہت جلد جنگ بندی ہو جائے گی کہ اس ہی میں سب کا بھلا ہے مگر حماقت اپنی وقت پر ہی تمام ہوتی ہے_

زندگی میں بعض اوقات لمحوں میں سب کچھ بدل جاتا ہے

سلی کو یقین نہیں آتا تھا اپنے دوست ہشام کی والدہ کے انتقال پر اس کے دکھ میں شریک ہونا

زندگی کا پورا نظام بدل دے گا؟

سلی کو کئی مہینے گزرنے کے بعد بھی یقین نہیں آ رہا تھا

ایک چوہے نے کہا:

"یہ دنیا روز گھٹتی جا رہی ہے۔ ابتدا میں تو اتنی بڑی تھی کہ میں مسلسل دوڑتا رہتا تھا لیکن یہ ختم نہیں ہو رہی تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے میں خوف زدہ ہو گیا تھا۔ جب میں نے اپنے دائیں اور بائیں دیواروں کو دیکھا تو مجھے ایک انجانی خوشی محسوس ہوئی۔ یہ دیواریں میرے ساتھ چلتی چلتی تنگ ہوتی گئیں اور میں آخری حد تک پہنچ گیا۔ اس کو پار کرتے ہی میں اپنے لیے تیار شکنجے میں پھنس گیا۔ بلی نے یہ کہتے ہوئے اُسے نگل لیا کہ

"تمھیں صرف اپنا راستہ بدلنا چاہیے تھا۔"

اور سلی کی مثال کچھ یوں تھی وہ رستہ نہیں بدل سکی اور نا لوگوں کی چال سمجھ سکی تھی ممی نے اس دن ہشام کی دھمکی کو نظر انداز نہیں کیا تھا

اس نے ہشام کی آنکھوں میں سلی کے لیے محبت بھی پڑھ لی تھی۔ جو بات سلی سمجھ نہیں سکی تھی وہ بات اس کی ممی نے بہت آسانی سے سمجھ لی تھی_

اور اس نے تب سے ہی منصوبہ سازی کر لی،

وہ بے عزتی نہیں بھولی تھی

اور نہ ہی وہ سلی جیسی لڑکی کو ہشام جیسے اعلیٰ لڑکے کی زندگی میں دیکھ سکتی تھی

اس کا ایک ہی حل تھا کہ سلی کو تباہ کر دیا جائے

اور اس نے سلی کو بروزو کے ہاتھوں تباہ کروا دیا تھا

یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ ممی جان چکی تھی کہ سلی اور ہشام میں کچھ محبت کا سلسلہ بن چکا ہے وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں یہ ملاقاتیں محبت اور شادی تک ضرور جائیں گی اس نے سلی کے سارے رستے کاٹ دیے اس کے پر کاٹ کر اسے پنجرے میں ڈال کر خود مفرور ہو گی تھی

کچھ لوگ کس قدر ظالم اور خبیث ہوتے ہیں

اس ظالم وقت لوگ حالات اور درد میں صرف ایک ہشام کا احساس تھا جو اس کو زندگی عطاء کرتا تھا۔اس کی سانس سانس ہشام کی محبت میں بھیگتی تھی ہر وہ لمحہ قیمتی تھا جس میں ہشام کی محبت تھی

ہشام نے کہا تھا

"میری محبت مجھ سے پوچھتی ہے"

"مجھ میں اور آسمان میں کیا فرق ہے؟"

میں نے کہا

"فرق یہ ہے، میری محبت،

جب تم ہنستی ہو،

میں آسمان کو بھول جاتا ہوں۔"_

:My lover asks me

"What is the difference between me and the sky?"

The difference, my love,

Is that when you laugh,

forget about the sky.

اور سلی کو یقین تھا ہشام اس سے کبھی نفرت نہیں کرے گا بے شک اب وہ آبی نرگس کا لتھڑا ہوا پھول بن چکی تھی

اس کی یقین تھا وہ ہشام کے دل میں ہے ہشام اس کے دل میں ہے وہ ضرور پلٹ کر دیکھے گا کہ سلی ان راستوں پے کیوں نہیں موجود اب؟

وہ نظر کیوں نہیں آتی؟

کہیں بوار یا اسے نگل تو نہیں گیا؟

اس دن سلی جب گملوں سے تازہ پھول توڑ رہی تھی تب اس کے کانوں میں خطیب کی آواز اتری تھی وہ بہت سوز و گداز میں عربی میں گا رہا تھا

'بھلا دیے جاؤ گے تم!!

جیسے
کبھی گزرے ہوئے زمانے میں

تم تھے ہی نہیں

بھلا دیے جاؤ گے تم!!

جیسے کوئی پرندہ
کہیں مر کر گر جاتا ہے

جیسے: کوئی ویران عبادت گاہ ہو

جیسے: بھولی بسری اجنبی محبت ہو

یا

جیسے: رات کے اندھیرے میں

گلاب کا کوئی پھول.....

تم بھی ایسے ہی بھلا دیے جاؤ گے!!

میں راستے میں ہوں... جہاں

میرے بعد آنے والا اپنا قدم

میرے قدم پر رکھے گا

جہاں میرے بعد آنے والا شخص

اپنا عقیدہ میرے عقیدے سے لکھے گا

یا پھر میرے بعد آنے والا
وہ شخص ہوگا جو

اپنی فطرت کے جملے ترتیب دے کر

زندگی کی کہانی میں داخل ہوگا

یا پھر وہ:

بعد میں آنے والوں کے لیے

شاعری کا اثر چھوڑ جائے گا

اور ایک وہم بھی!!

بھلا دیے جاؤ گے تم!!

جیسے تم کبھی تھے ہی نہیں!!

جیسے تم کبھی ایک شخص نہ تھے،

جیسے: تم کبھی ایک زندہ وجود نہ تھے!!

ایسے تم بھلا دیے جاؤ گے!!

میں اپنی بصیرت سے بنے

راستے کا مسافر ہوں!

کبھی میں کہانی کو

اپنی زندگی کا رنگ دے دوں گا،

اور کبھی خیالات مجھ پر حکمرانی کریں گے

اور میں ان پر!!

میں اپنے خیالات کی شکل ہوں!!

اور

وہ، وجود سے آزاد!!

لیکن جو بھی میں کہوں گا

وہ پہلے بھی کہا جا چکا ہوگا!!

آنے والا کل

مجھے گزرنے والا کل بنا دے گا!!

میں یادوں کی بازگشت
کا بادشاہ ہوں!!
میرا کوئی تخت نہیں سوائے
حاشیوں کے!!
اور یہ راستہ ہی سچ ہے!!
شاید!! پہلے آنے والے
کسی چیز کی صفت کو بھول
گئے تھے!!
اور اب میں اپنی یادداشت اور حس سے
اس کی نمو کو
حرکت دے رہا ہوں!!
بھلا دیے جاؤ گے تم!!
جیسے تم تھے ہی نہیں کبھی!!
جیسے کہیں:
تمہارا کوئی نشان اور خبر نہ تھی
ایسے: بھلا دیے جاؤ گے تم!!
میں اس راستے پر چل رہا ہوں
جہاں میرے بعد آنے والا
میرے قدموں پر چلے گا!!
اور میرے نظریے کی پیروی کرے گا!!
وہ بھی آ کر
اجڑے گلستان کی یاد میں شعر لکھے گا

اس گھر کے سامنے!!

جو کل کے انسانوں سے آزاد اور خالی ہو گا!!

جو میرے بکھرے ہوئے

مستقبل سے خالی ہو گا!!

جو: میرے وجود اور عدم سے خالی ہو گا!!

میرے جنت جیسے وطن سے خالی ہو گا!!

جو میرے کنایات

اور میری زبان سے خالی ہو گا!!

اور میں دیکھ رہا ہوں:

کہ میں اس وقت

مکمل زندہ اور آزاد ہو جاؤں گا

جب میں

بھلا دیا جاؤں گا!!_"

اور سلی کا دل جیسے بند ہو گیا تھا

اس نے ایک بازگشت سنی تھی

"ہشام کی والدہ بیمار ہیں وہ پاکستان جانے والا ہے۔

❁ ❁

ناول **سلسبیل** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **12** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 12

کچھ دنوں سے عجیب حالات چل رہے تھے۔
بوار یا جیسے سوگ میں ڈوبا تھا۔سلی کے ساتھ ہونے والے حادثے نے ڈی سوزا کو بھی خوف زدہ کر دیا تھا اب وہ گھر سے بہت کم کم نکلتی تھی۔
ہشام سے کوئی رابطہ نہیں تھا اور خطیب کا دوست خداداد سرائے میں بہت دیر سے لوٹتا تھا۔
انہی دنوں جب سلی ایک طویل صبر آزما آزمائش سے گزر رہی تھی جب اسے ایک بری خبر نے بے انتہا حواس باختہ کیا۔اس کے گھر کا پے انگ گیسٹ خطیب جس کا پورا خاندان فلسطین میں تھا جنگ کی وجہ سے شہید ہو گیا۔اس دن ایک جوان دیواروں سے ٹکریں مار مار کر رو رہا تھا۔اس نے اپنا گریبان پھاڑ دیا اور اس کا سر لہولہان ہو گیا تھا کہیں سے خداداد بھاگتا ہوا پہنچا اور اگر وہ بروقت نہ پہنچ پاتا تو شاید وہ نوجوان خطیب اپنی زندگی کی جنگ ہار دیتا
اس دن سلی نے پہلی بار ڈی سوزا کو اپنی کھڑکی سے لٹک لٹک کر باہر جھانکتے دیکھا تھا سلی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کچھ دکھ اور بہت آنسو تھے۔وہ دونوں خطیب کے درد کو محسوس کرنا چاہتی تھیں انہیں اس وقت پتہ چلا جب وہ زخمی آواز میں چلا چلا کر کہہ رہا تھا
"ہائے میری ماں' میری بہن' میرا دس سالہ بھائی' بوڑھی دادی اور میری منگیتر۔" شاید اس کو سمجھ نہیں آرہی تھی وہ کس کو کھونے کا زیادہ غم کر سکے۔اس کا گلا پھٹ گیا تھا اور زندگی میں پہلی مرتبہ ان دو لڑکیوں نے کسی مرد کو صدمے کے سخت اثر سے بے ہوش ہوتے دیکھا تھا
خطیب کے اعصاب جواب دے گئے تھے اور وہ روتے روتے بے دم ہو گیا تھا۔مگر پھر بھی اس

کی زبان سے نوحے نکل رہے تھے

"القدس'القدس'اے میری لہورنگ زمین'اے میرے برباد وطن'اے شہدا کی سرخ زمین"

اس دن پہلی بار سیلی کو محسوس ہوا تھا کہ زندگی امتحان کا گڑھ ہے اور یہاں ہر وجود اپنے اندر غموں کا بارود بھر کے چل رہا ہے۔وہ اپنے برباد گھر کو دیکھ کر آج بالکل نہیں روئی تھی۔اس کا گھر ختم ہو گیا تھا۔اس کے رشتے ایک حادثہ نگل گیا تھا۔مگر وہ پھر بھی کس قدر خوش نصیب تھی وہ ایک امن والی زمین پر تھی اور کم سے کم زندہ تھی۔ہاں اگر سانس لینے کا نام زندگی تھا تو وہ زندہ تھی اور خطیب کی طرح ہی اپنا خاندان کھو چکی تھی

ڈی سوزا نے اپنی سہیلی کی آنکھوں میں درد پگھلتے دیکھا اور شدت کرب سے کھڑکی بند کر لی تھی

۔اس کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ ناول تھا

جو لرز رہا تھا۔کچھ دیر پہلے وہ ایک جنگی روپوش فوجی کی راوداد پڑھ رہی تھی اور اس کے آنسو گر گر کر بکھر رہے تھے

جنگ کے ختم ہونے کے بعد جب ایک جنرل کو جنگ میں مارے گئے فوجیوں کی باقیات تلاش کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔۔تو اُس تلاش میں اُنہیں ایک بوڑھا مل جاتا جو اُسے ایک سپاہی کی کچھ دوسری باقیات اور ساتھ میں ایک ڈائری دیتا ہے۔۔وہ کہتا کہ وہ سپاہی روز اس میں کچھ نہ کچھ لکھ دیا کرتا تھا،اُس سپاہی نے جنگ کے دوران اس بوڑھے کے گھر پناہ لی تھی۔اس بوڑھے کی ایک بیٹی تھی جسے یہ سپاہی پسند کرنے لگا تھا اس حوالے سے وہ لکھتا ہے:

''جولائی؛دوپہر

کرسٹین کی آنکھیں تمام البانوی لڑکیوں کی طرح مکمل طور پر علامتی ہیں۔۔محبت؟میری طرف سے ہاں۔۔اُس کی طرف سے،کچھ نہیں۔۔

اتوار:

مجھے اتفاق سے یہ پتہ چلا ہے کہ کرسٹین ایک ہفتے میں شادی کرنے والی ہے۔۔میں نہیں جانتا،

لیکن اس کی منگنی کافی دنوں سے ہو چکی تھی، اور کل جب آنٹی فروسا نہر سے پانی بھر رہی تھی۔'' میں نے اُس سے صرف بات کرنے کی خاطر پوچھا:

''آپ لوگوں کے ہاں بہت سارے کاموں میں تیزی آگئی ہے، ایسا کیوں ہے؟۔''

''کیونکہ دن بہت قریب آگیا ہے، میرے بیٹے۔۔''

'''کیسا دن؟۔''

''کیسا دن مطلب؟ ہم اگلے ہفتے اپنی بیٹی کی شادی کر رہے ہیں۔۔ یقیناً تم کو معلوم ہوگا؟۔''

''نہیں، میں نے کہا،" مجھے نہیں معلوم۔۔''

لیکن میری آواز اتنی ٹوٹی ہوئی تھی کہ آنٹی فروسا نے ایک لمحے کے لیے مجھے گھور کر دیکھا۔ میرا پہلا خیال یہ تھا کہ میں اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کروں، لیکن پھر میں نے سوچا بھاڑ میں جائے کوشش، مجھے اپنا درد چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ جان گئی تھی یا نہیں کہ اس کے لفظوں نے مجھے کیا صدمہ پہنچایا تھا، لیکن اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا:

''کیوں نہیں بیٹا! وقت گزرتا ہے اور لڑکیاں بڑی ہوتی جاتی ہیں تو ان کی شادی کرنی پڑتی ہے۔۔ جیسے ہی یہ جنگ ختم ہوگی، اور تم اپنے گھر واپس جاؤ گے تو تمہاری ماں بھی تمہاری شادی کسی حسین لڑکی سے کر دے گی، جو مئی میں کھلتے پھولوں کی طرح خوبصورت ہوگی!!۔''

جب اُس نے یہ کہا تو میں تقریباً ٹوٹ چکا تھا، کیونکہ مجھے لگا کہ وہ مجھے تسلی دینے کی کوشش کر رہی ہے، جس نے میرے درد کو مزید بڑھا دیا۔۔

میں واپس چکی میں آکر بیٹھ گیا۔۔ اور میں نے خود سے اونچی آواز میں کہا:" کرسٹین تمہاری شادی ہو رہی ہے، بس یہی سچ ہے۔۔!!"

دو دن پہلے میں نے کرسٹین کو ایک چھوٹا سا تحفہ دینا چاہتا تھا۔۔ لیکن کیا؟ میرے پاس کچھ نہیں تھا! پھر میں اُسے اپنا تمغہ دینے کا سوچا۔۔ میں نے اُسے دو تین بار اس کی طرف متجسس نظروں سے گھورتے ہوئے دیکھا۔۔

''یہ لو تمہیں میری یاد دلانے کے لئے۔۔" وہ لیکر اُسے خوشی سے دیکھنے لگی۔۔" کیا یہ کنواری مریم ہے؟۔''

"ہاں"

''تمہیں کس نے دیا؟ تمہاری ماں نے!"

''نہیں، فوج نے۔۔''

''کیوں؟''

''تاکہ میں مرتے وقت پہچانا جاؤں۔۔''

. آج خطیب اس ناول کے ایک کردار کی طرح مردہ لشکر کا سپہ سالار لگ رہا تھا۔ڈی سوزا کو لگا وہ سب سے زیادہ اپنی ماں کو رویا ہے یا اپنی بہن کو یا دس سالہ بھائی کو یا پھر اپنی بہت خوب صورت منگیتر کو شاید خطیب اپنی محبت کو رویا تھا۔اس کا دوست خدا داد اسے حوصلہ دے رہا تھا اسے زندگی جینے کا سامان مہیا کر رہا تھا۔خطیب کے نوحے بواریا کی فضاؤں کو لہولہان کر رہے تھے۔

" چیتھڑے اڑے جسم' گردن کے بغیر جسم' فگار بدن' زخموں سے چور چور مٹی کی مورتیں' شیر خوار بے کفن' برباد ہوا وطن' خون آلو وزمین' ہائے میرے سرخ فلسطین""۔

اس کے آنسو اب رنگ بدل چکے تھے

" آسمانوں کا وسط

اک لافانی نور سے آراستہ ہو رہا ہے

جہاں فرشتوں کی سرگوشیاں

ادب لاہوتی سے مراقبے میں

ڈھل چکی ہیں

اور اس عظیم لازمان میں

میرا خدا بلند و جلیل جلوہ افروز ہے

اس کی کبریائی کی شان کیسی ہے!!
جس کے نور کے ہر اک ذرے میں
لاکھوں سورج اور چاند
گم ہو جائیں

اور

اس کی لامحیط سلطنت میں ہر لحہ
نور کے پتنگوں کی بارش برس

رہی ہے
جو کبھی نہیں رکتی!!
کبیر ایک ہی تسبیح میں مست ہے:

سب دھرموں والو

آؤ!!

میرے عظیم خدا کا دربار دیکھو!!،،

'میرے عظیم خدا کا دربار دیکھو! میرے بچو! میرے فرشتو! اپنے خدا کے پاس بہت ساری نعمتوں میں سرشار اور گم تم کو دنیا کی تکلیف یکسر بھول جائے گی اور تم آرام اور سکون میں ہو گے۔ جہاں دھماکہ بارود' خون اور زخم نہیں ہوں گے۔"

جب امتحان اوپر سے ہو تو حوصلے بھی خداوند عطاء کرتا ہے

خطیب بہادر تھا بہت با حوصلہ تھا ہر زندہ رہنے والا وہ انسان جس کی کل پونجی لٹ چکی ہو وہ زندگی کی طرف آئے تو وہ با حوصلہ ہوتا ہے

سلی اور ڈی سوزا نے خطیب کی تیمارداری کرتے خداداد کو بہت بار دیکھا۔ کبھی وہ اسے واک کرواتا تھا کبھی کھانا کھلاتا کبھی اخبار سناتا اور کبھی اسے افسانے سناتا۔ انہوں نے ٹیلی ویژن بند کر دیے

تھے۔ایک دن سنہرے سورج کی روشنی میں خداداد خطیب کو کسی ایرانی فلم کا خلاصہ سنا رہا تھا۔

"۔ایک روز میں نے خودکشی کا فیصلہ کیا،اپنی گاڑی میں رسی رکھی اور صبح منہ اندھیرے گاڑی باہر نکال کر چل دیا۔قریب ہی شہتوت کے ایک باغ کے پاس میں رک گیا۔میں نے ایک درخت پر رسی اٹکائی لیکن وہ جمی نہیں۔کئی بار کوشش کے باوجود میں اسے لٹکانے میں ناکام رہا۔

آخر میں نے غصے سے درخت پر چڑھ کر رسی گلے میں باندھ کر نیچے لٹکنے کا فیصلہ کیا۔درخت پر چڑھتے ہوئے کئی نرم وگداز شہتوت میرے ہاتھوں سے مس ہو رہے تھے۔۔۔میں نے ایک شہتوت توڑ کر کھانا شروع کر دیا!!وہ اتنا لذیذ تھا کہ میں مسلسل شہتوت کھانے لگا۔

اسی دوران ہی میرے سامنے پہاڑ پر سورج جگمگانے لگا اور درخت کے نیچے سے سکول جاتے بچوں کی ایک جماعت گزری۔مجھے دیکھ کر انہوں نے درخت کو ہلانے کا کہا تاکہ وہ نیچے گرنے والے پھل کھا سکیں۔میں نے ایسا ہی کیا!!میں بھی بہت سارے شہتوت ساتھ گھر لے آیا اور زندگی جینے کا فیصلہ کیا۔

ذرا سوچو تو سہی!!

اس دن ایک ننھے سے شہتوت نے میری زندگی بچائی۔اس زندگی میں عام اور ارزاں چیزیں ہی سب سے زیادہ انمول ہیں اور معمولات میں ہی زندگی کی قیمت اور لذت چھپی ہے۔"

زندگی کی طرف اپنے دوست کو لوٹانے کے لیے یہ حوصلہ دیتی کہانیاں آکسیجن کی طرح تھیں اور خطیب کے لیے ایک ایک سانس بھی قیمتی تھی دور کہیں پس منظر میں کسی اسکول کے میدان میں بچوں کا ایک گروہ نغمے گا رہا تھا۔جیسے بہت دور عرب کی مقبوضہ زمین پر کاٹ کاٹ کر مار دینے والے بچوں کے لیے شاعر غمزدہ تھے۔اور اپنے لفظوں سے فگار دلوں پر مرحم رکھ رہے تھے

غسان کنفانی لکھتے ہیں کہ کاش بچے نہ مریں۔وہ دنیا میں ہر اس زمین پر جہاں بچوں کو ظلم بربریت کے ساتھ مارا جاتا ہے ان کے لیے لکھتے ہیں

"کاش بچے نہ مریں۔

کاش جنگ کے اختتام تک وہ عارضی طور پر آسمانوں کی جانب چلے جائیں۔
پھر جب وہ بحفاظت گھر لوٹیں، اور ان کے والدین ان سے پوچھیں:
آپ کہاں تھے؟
تو وہ کہیں:
ہم بادلوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔"

wish children do not die!I

wish they would be temporarily elevated to the skies

until the war ends

Then they would return home safe, and when their

:parents ask them

:Where were you? They would say

We were playing with the clouds."

Ghassan Kanafani

[9:56 PM, 2/2/2023] nayyab2: خطیب کی بنجر آنکھوں سے ایک لہو کا قطرہ گرا تھا

اس کا دس سالہ بھائی اس کے کانوں میں سرگوشی کر رہا تھا۔

"بھائی! تم جلدی آ جانا۔اور مجھے سائیکل لے دینا۔اب میں اسکول پیدل نہیں جاؤں گا۔"

خطیب کا دل کرچی کرچی ہوا

"اے میرے شہید! مجھے یہ دن نہیں دیکھنا تھا کہ تمہارا جسم اسکول کے لباس میں سرخ ہو جائے۔"

وہ پتھر پر سر پٹخ پٹخ کر روتا رہا۔ایک کے بعد ایک خبر جانگسل تھی ۔خطیب کے چچا القدس کی حفاظت میں شہید ہو چکے تھے اس کے والد ماموں اور بہت سارے رشتے دار۔اب اس کے پاس بری

خبر سننے کے لیے رشتے ہی نہیں بچے تھے۔ ہر روز شہدا کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا اور ایک پوری مسلم امہ محض تماشائی تھی۔ شکیب جلالی نے کہا تھا۔۔

''ملبوس خوشنما ہیں مگر جسم کھوکھلے۔۔

چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر۔''

ٹی ایس ایلیٹ کی یہ نظم بھی اسی گہرے طنز کی غمازی کرتی ہے جس کا ذکر شکیب جلالی نے کیا ہے

آج کے انسان کس طرح زندہ لاشیں بن گئے ہیں۔۔۔

ہم ہیں کھوکھلے لوگ،

جن کے تن خالی میں ہے خس وخاشاک بھرا،

جن کے سروں میں تنکوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔۔

افسوس صد افسوس۔۔

خشک ہو کے ٹھٹھر گئی ہمارے اندر کی صدا۔۔

ہمارے لفظوں سے معنی کہیں روٹھ گئے۔۔

ہماری سرگوشیوں سے اب کوئی اواز نہیں اتی۔۔

گر آئے بھی تو بس اتنا۔۔

جیسے سرکنڈوں کو چھو کر، کوئی جھونکا ہوا کا گزرے۔۔

یا ٹوٹے ہوئے شیشوں پر گلہری کے چلنے کی آواز جتنی۔۔۔

ہماری شکل بھی بے شکل ہو گئی ہے،۔۔

ہم بے رنگ ہیں اب ہر رنگ سے خالی۔۔

منجمد ہو گئے ایسے،

کہ ہماری حرکت میں کوئی اشارہ بھی نہیں باقی۔۔

وہ روحیں جو اس جہاں سے گزر کر موت کی وادی میں جا چکی ہیں۔۔

وہ ہمیں روح کا درجہ نہیں دیتیں۔۔

کہ ان کی نظروں میں ہیں ہم وہ تن خالی۔۔۔

جنہیں حنوط رہنا ہے۔"

سب کو کچھ ہر دن کے ساتھ بکھر رہا تھا۔دادی اور سلی اپنا غم بھول کر خطیب کی تیمار داری کر رہی تھیں۔دادی کا باڑہ ختم ہو گیا تھا۔بیکری کا کام بند تھا اور پنیر صرف گھروں تک بیچا جاتا تھا۔

سنہری دھوپ کی پہلی کرن کے ساتھ ہی بواریا جاگ جاتا تھا۔ہر کوئی اپنے کام میں مشغول جیسے کسی کو کسی اور کے غم سے کوئی غرض نہیں

دنیا کے نقشے پر کیا تبدیلیاں ابھر رہی ہیں شاید بواریز کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ایک دادی اور دوسری سلی تھی جو چھپ چھپ کر خبروں پر نظر رکھتی تھیں۔شاید کوئی اس پردیسی مہاجر لڑکے کے لیے اچھی خبر مل سکے۔سلی دن گنتی اور تعداد بڑھنے کی بجائے کم ہو رہی تھی

اس کا مسیحا لوٹ نہیں رہا تھا۔اس کی دوسری ماں کا انتقال ہو گیا تھا اس کے علاوہ سلی کے پاس کوئی خبر نہیں تھی۔دادی زبردستی خطیب کو صحن میں اٹھا لائی تھیں چمکتی نم گھاس سورج کی کرنوں سے چمک رہی تھی۔خطیب کو ایسی چپ لگی تھی کہ لفظ شاید اپنا قرینہ ہی بھول گے تھے

:دادی اسے تھوڑا تھوڑا ناشتہ کرواتی تھیں کبھی وہ کھا لیتا اور کبھی اٹھ کر چلا جاتا۔

دادی پیچھے بھاگتی یا کبھی ہانپ کر رک جاتی تھی۔ایک دن ڈی سوزا بھی آ گئی تھی۔

اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔اس نے خطیب کو دیکھ کر آہ بھری۔ہر دن یہ فلسطینی ڈی سوزا کے دل میں گھر کر رہا تھا۔اس کا دل چاہتا تھا وہ اس کا دکھ کم کرے۔اور کوئی افسانہ ایسا پڑھے کہ یہ لڑکا بے اختیار ہنس پڑے۔

انسٹی ٹیوٹ کے ان کے دوست عیادت کے لیے آتے تھے مگر خطیب ان سے بہت کم ملاقات کرتا تھا۔

:ڈی سوزا ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی تھی اور اس نے ایلف شفک کی کتاب کھول لی تھی

''عشق کے چالیس چراغ۔''

وہ مسکرائی اور پڑھنے لگی

''علاؤالدین۔۔۔؟"۔کیا تمہیں قصے کہانیاں پسند ہیں؟"

"میرے پاس ان فالتو باتوں کیلئے وقت نہیں ہے"

''کوئی شخص جس کے پاس قصے کہانیوں کیلئے وقت نہ ہو وہ ایسا شخص ہے جس کے پاس خدا کیلئے وقت نہیں ہے" شمس تبریز کے ہونٹوں پر تواضع بھری مسکراہٹ ابھری۔اس نے کہا" کیا تم نہیں جانتے کہ خدا بہترین داستان گو ہے"

پھر اس نے سپاٹ چہرے والے خطیب کو دیکھا تھا

" کیا تم کہانی سنو گے؟"۔

ڈی سوزا نے زخمی لب و لہجے میں کہا تھا۔وہ جتنی باعلم اور کتاب بین تھے اس کے پاس سنانے کو بے شمار قصے تھے۔اور شاید اس کو اچھا سامع نہیں ملتا تھا۔سلی اچھی تھی سنتی بھی تھی مگر آجکل وہ ایسی کیفیت سے گزر رہی تھی کہ اس سے کچھ کہنا بیکار تھا۔خطیب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ اسے جمی ہوئی پتھر نظر سے دیکھنے لگا۔

" خود کو سنبھالتے کیوں نہیں؟ کیا تم کو خبر نہیں۔اگر تم ٹھیک نہ ہو سکے اور یہ کورس پاس نہ کیا تمہیں کورس سے خارج کر دیا جائے گا اور پھر اس ملک میں رہنے کا کوئی جواز نہیں رہے گا۔"

ڈی سوزا جیسے آج کچھ ٹھان کر آئی تھی

" کیا تمہارا غم ان لوگوں سے زیادہ ہے جو بھوک پیاس کے ساتھ اپنے مردوں کو کفن دے رہے دفن کر رہے جنازے اٹھا رہے اور جنگ بھی لڑ رہے ہیں؟ تم حوصلہ کیوں ہار رہے ہو؟"۔

ڈی سوزا نے گہری نظر سے اس ویران نوجوان کو دیکھا جو ایک ڈھلے ہوئے مجسمے سے کم نہیں لگ رہا تھا

"جنگوں میں ایسے ہی کھویا جاتا ہے جیسے محبت میں۔"

وہ دھیمی پڑی تھی

"مانا کے تم کو اپنی منگیتر سے بہت محبت ہو گی۔ مگر یہ زمین بہت خوب صورت ہے۔"

ڈی سوزا کے الفاظ خطیب پر بجلی بن کر گرے تھے اسے جیسے الیکٹرک شاک لگے تھے وہ کسی گہری نیند سے بیدار کیا گیا تھا

"غزہ جل رہا ہے۔ میرا گھر میرے ماں باپ میرے بہن بھائی میری منگیتر کا پورا خاندان۔ دنیا میں کوئی زمین خوب صورت نہیں۔ جس میں رحم نہ ہو۔"

خطیب کے اندر کوئی چلایا تھا

"تم غم کے اس گہرے نگر سے نکل کر دیکھو بواریا میں موسم بہار کی آمد ہے۔"

ڈی سوزا زبردستی کا مسکرائی تھی جیسے اسے بھی مسکرانے کی تحریک دیتی ہو۔

"ایک لڑکا روشنی کے دائروں میں رقص کرتا ہے

خود اپنی روشنی کے دائروں میں۔۔۔

دور سے آتی صداؤں پر

وہ جب بھی رقص کرتا ہے

تو اس کے پاؤں پھولوں کی طرح کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔

وہ رقص کرتا ہے۔۔

تو سورج سے بھی اُوپر جا پہنچتا ہے۔۔۔

وہ سورج کو ہتھیلی پر اٹھا کر

اپنی میلی انگلیوں سے کچھ مسلتا ہے

تو اس کی انگلیاں کھلتی دکھائی دیتی ہیں۔۔۔

سورج،

جسے وہ رقص کے دوران ہاتھوں میں پکڑ کر گھومتا ہے۔۔۔

وہ کوئی سورج نہیں، اک پھول ہے۔۔۔

وہ رقص کرتا ہے

خود اپنی روشنی کے دائروں میں۔۔۔

وہ خود سورج ہے۔۔۔

وہ خود روشنی ہے۔۔۔

اور وہ تم ہو جس کا نام خطیب ہے۔"

'اس نے لہک لہک کر گایا تھا۔

لہکنے سے اس کی فرل لگی اسکرٹ گھومنے لگی تھی

"تم کو خبر نہیں غزہ جل رہا ہے۔"

خطیب کی آنکھوں میں کرچیاں ٹوٹی تھیں

" مگر تم زندہ ہو یہ خوشی کی بات ہے۔"

"اس زندگی کو تم زندہ رہنا کہتی ہو؟ اس سے بہتر نہیں میں اولپس کے پہاڑوں سے کود کر جان دوں اور اپنے خاندان کے پاس پہنچ جاؤں یہ جدائی ہمیں مار دے گی۔" اس کے اندر کوئی چیخنے لگا تھا۔

رات کو وہ سنیہ صالحہ (شام) کی شاعرہ کو سن رہی تھی

"حبر الأعدام"

جنگ جب جاری ہو

کرب کے ان لمحوں میں

تم کیا کچھ کرو گے؟

میں بھاگوں گا!!

بہت تیز۔۔۔۔

میں کوے کی طرح

ہر سو چیخوں گا!!

میں:

زخمی ہونے سے بچوں گا!!

اور گھائل ہو کر

موت سے بچنے کی آرزو کروں گا

اور تم؟

میں:

ہر لمحہ رینگ کر

زیادہ سے زیادہ قریب ہونے

کی کوشش کروں گی...

ان سے

جن کو میں پیار کرتی ہوں۔

میں اس لڑکی کی طرح اپنے پیاروں کے قریب رہنا چاہوں گا۔

میں کبھی جنگ سے نہیں بھاگوں گا۔"

اور پھر وہ پتھر ہوا لڑکا اس لڑکی کی ذراسی محنت پر دھاڑیں مار مار کر رو دیا تھا

ڈی سوزا نے اسے رونے دیا تھا۔ رونا اس کے لیے شفا تھا اس لیے وہ روتا رہا ڈی سوزا دیکھتی رہی۔ پھر اس نے بغل سے ایک آرٹیکل نکال کر پڑھا۔ اس کا لہجہ زخمی اور زہر آلود ہو چکا تھا۔

"تمام تہذیبیں ظلم کا نتیجہ ہیں، ریاست کی بنیاد ظلم پر ہے، قانون ظلم کا میثاق ہے، اخلاقیات ظلم کی معقولیت ہے۔"

ظلم انسانی معاشرے میں ہر جگہ ہے۔ یہ وہی ہے جس طرح ہم اپنے دشمنوں، اپنے مجرموں، اور یہاں تک کہ اپنے پیاروں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔ یہ اس طرح ہے کہ ہم جنگ کرتے ہیں، قدرتی وسائل کا استحصال کرتے ہیں، اور کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں۔

ریاست ظلم پر قائم ہے۔ تشدد پر اس کی اجارہ داری ہے، اور وہ اس تشدد کو نظم و ضبط برقرار رکھنے اور اپنے قوانین کو نافذ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مجرموں کو سزا دینے کی ذمہ داری بھی ریاست پر عائد ہوتی ہے جو کہ اکثر غیر انسانی ہوتا ہے۔

قانون ظلم کا میثاق ہے۔ یہ قوانین کا ایک مجموعہ ہے جو لوگوں کو کنٹرول کرنے اور سزا دینے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ قانون اکثر طاقتور کے تحفظ اور کمزور پر ظلم کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اخلاقیات ظلم کی معقولیت ہے۔ یہ عقائد کا ایک نظام ہے جو اعلیٰ اقدار کے نام پر ظلم کو جائز قرار دیتا ہے۔ اخلاقیات کا استعمال اکثر جنگ، جبر، اور تشدد کی دوسری شکلوں کے جواز کے لیے کیا جاتا ہے۔

ظلم انسانی فطرت کا ایک تاریک پہلو ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کا ہمیں سامنا کرنا چاہیے۔ ہمیں یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ ظلم موجود نہیں ہے، یا ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے ظلم کو تسلیم کرنا چاہیے اور اس پر قابو پانے کے لیے کام کرنا چاہیے۔''

"غزہ میں کوئی قانون نہیں کوئی ریاست نہیں کوئی انسانیت کا اصول نہیں۔ غزہ کے بچے نصیب سے بڑے ہوتے ہیں ورنہ کسی بھی وقت مار دیے جاتے ہیں۔"

کوئی اس کے قریب رویا تھا۔

جیسے انسانیت اس کے درد میں شریک ہو کر رو پڑی ہو۔

"ڈی سوزا! میں صرف چھ ماہ کے لیے آیا تھا۔ مجھے واپس جانا تھا۔ اپنی زمین پر اپنے لوگوں میں۔ اور مجھ سے میرے اپنے میری زمین سب کچھ چھین لیا گیا۔"

وہ سسک رہا تھا

ڈی سوزا اس کا کرب سمجھ سکتی تھی

"میری زمین پر کوئی محفوظ نہیں۔ ہماری مائیں بہنیں بیٹیاں ہماری عزتیں محفوظ نہیں۔ غزہ میں کوئی محفوظ نہیں۔"

وہ کرب و درد سے رونے لگا تھا

اس لمحے ڈی سوزا کو وہ کسی شاعر کے تخیل اور لفظوں کی طرح لگا تھا اپنے اندر کے درد کو کسی فاختہ کی طرح دبا دبا کر خود کو تمام حقیقتوں سے الگ کر کے وہ کچھ حاصل کرنے آیا تھا اور اس کا سب کچھ پیچھے سے برباد ہو گیا۔

ڈی سوزا نے نم آنکھ سے پہلا صفحہ کھولا۔ اس سے کچھ پڑھا نہیں گیا تھا۔

''میرے دل کے اندر ایک فاختہ رہتی ہے
اُسے باہر نکل کر اُڑنے کا بہت شوق ہے
مگر میں نے اُسے سختی سے منع کر رکھا ہے
نہیں چاہتا یہ میں کہ اُسے کوئی اور بھی دیکھے

میرے دل کے اندر ایک فاختہ رہتی ہے
مگر میں اُس پہ بے تحاشہ شراب اُنڈیلتا ہوں
بے حساب سگریٹوں کا دھواں پھونکتا ہوں
تا کہ طوائفوں، ساقی و سوداگروں کو اُس کے
مرے دل میں زندہ و موجود ہونے کا پتا نہ چلے

میرے دل کے اندر ایک فاختہ رہتی ہے
اُسے باہر نکل کر اُڑنے کا بہت شوق ہے
مگر میں نے اُسے سختی سے منع کر رکھا ہے
اُسے کہتا ہوں، خاموشی سے وہیں بیٹھے رہو
مجھے تباہ اور میرے فن کو خراب کرو گے،
یورپ میں میرے کتابوں کا بکنا رکوا دو گے؟

میرے دل کے اندر ایک فاختہ رہتی ہے
اُسے باہر نکل کر اُڑنے کا بہت شوق ہے
مگر میں بھی چالاک ہوں، صرف رات ہی کو
جب تمام آدمی نیند کی وادی میں کھو جاتے ہیں
اُسے چپکے سے کہتا ہوں آ باہر، دیکھ اور سُن
اُداس نہ ہونا، مجھے پتا ہے کہ تم یہیں موجود ہو
یہ کہتے ہوئے اُسے واپس میں دل میں دبا لیتا ہوں

اُسکے گنگنانے سے مجھے اُسکی زندگی کا پتا لگتا رہتا ہے
اپنے خفیہ معاہدے کے ساتھ ہم اکھٹے سو جاتے ہیں
کسی آدمی کو رُلانے کا احساس بہت پُرکیف ہوتا ہے
میں تو اب تک کبھی نہ رو پایا، کیا تم کبھی روئے ہو؟۔"

"تم کو لگتا ہے کہ تم بہت زیادہ دکھی ہو؟ ہاں تم بہت زیادہ دکھی ضرور ہو مگر تم اس دنیا میں تنہا دکھی انسان نہیں ہو؟ دیکھو! تم اردگرد ضرور دیکھو تم کو بہت کچھ بہت قریب سے نظر آئے گا تم دیکھو ایک چھوٹی سی لڑکی ہے جس نے ابھی اپنی زندگی کی کوئی بھی شروعات نہیں کی مگر اسے ایک ناپاک گدھ نے نوچ دیا اور وہ خود کو کچرا سمجھ کر ضائع نہیں کر رہی اس کے اندر امید ہے۔ بتاؤ ہے نا امید؟"
اس نے خطیب کی کرچی ہوتی لہو رنگ آنکھوں میں جھانکا
"ہاں اس کے پاس امید ہے ہشام کی دی ہوئی امید جب تک وہ امید باقی ہے وہ زندہ رہے گی مگر میرے پاس کیا ہے؟"
اس کے لفظ جیسے احتجاج بن کر چلا اٹھے تھے
"تمہارے پاس بھی امید ہے یہ جگنو' یہ صبح' یہ آگے بڑھتا دن اور یہ آرام دیتی رات۔ یہ امید

نہیں تو کیا ہے؟"

وہ اسے زندگی کی رعنائیوں کا احساس دلا رہی تھی

"مجھے دن کے جانے اور رات کے آنے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

وہ اپنے زخمی دل کو کیسے دکھا پاتا۔کوئی انسان اس کا دکھ سمجھ سکتا تھا؟

"اچھا سنو میں تم کو کچھ سناتی ہوں۔چارلی چیلپن 68 برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوا۔اس نے دنیا کے لئے چار اہم بیانات چھوڑے۔

ا۔اس دنیا میں کچھ بھی ابدی نہیں ہے یہاں تک کہ ہمارے مسائل بھی نہیں۔

۲۔میں بارش میں چلنا پسند کرتا ہوں کیوں کہ میرے آنسوؤں کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔

۳۔زندگی کا سب سے ضائع ہونے والا دن وہ ہوتا ہے جب ہم ہنس نہیں پاتے۔

۴۔دنیا کے چھ بہترین ڈاکٹرز

سورج

آرام

ورزش

غذا

خوداعتمادی

دوست

انہیں اپنی زندگی کے تمام مراحل پر رکھو اور تم صحت مند زندگی سے لطف اندوز ہو گے۔

اگر تم چاند دیکھو گے تو تم خدا کا حسن دیکھ سکو گے۔

اگر تم آئینہ دیکھو گے تو یقین کرو تم خدا کی بہترین تخلیق دیکھ سکو گے۔ہم سب سیاح ہیں۔خدا ہمارا ٹریول ایجنٹ ہے جس نے پہلے ہی ہمارے سفرنامے،تحفظات اور منزلیں طے کر دی ہیں۔اس پر بھروسہ رکھو اور زندگی کا لطف اٹھاؤ۔زندگی صرف سفر ہے۔

میں تاکیداً کہہ رہی ہوں ہم سب حالت سفر میں ہیں۔تم اس دنیا کی بھیڑ میں کھلے دل کے ساتھ

نکل جاؤ اور ایک ایک دل کھنگال آؤ تم کو کوئی ایسا دل نہیں ملے گا جو درد سے خالی ہو۔"

دور کہیں موسیقی بج رہی تھی:

شاید یہ بے حس لوگوں کی جنت تھی جن کو موسیقی کے پیچھے غزہ کے معصوم بچوں کی چیخیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ اور اس کے قریب بیٹھی جدید صدی کی قدیم لڑکی اوراق الٹ الٹ کر اپنے سیکھے فلسفے اسے سنا رہی تھی وہ جو بارود گولی اور دھماکوں کی آوازوں کو لاکھوں میل دور سے بھی سن سکتا تھا

"اے موسیقی!
بیشک تُو تابعِ طلسم ہے..
میں نے تیری عمیق گہرائیوں میں اپنے
قلب ونظر ڈبو دیے ہیں..
تُو نے مجھے کانوں کے ذریعے بصارت اور دل کے ذریعے سماعت کا معجزاتی دوام بخشا"..

کاش کہ وہ ان لمحات سے سکھ حاصل کر سکتا مگر غزہ میں کٹی پھٹی لاشوں والے اس کے پیارے اسے پکار رہے تھے۔ وہ بری طرح رونے لگا

"اے تنہا لوگو!
جنگ میں جب ہر فاتح نے
اپنے حصے کا مالِ غنیمت لوٹ لیا
تو تمھاری برہنگی اور اکلاپے کی
پرواہ کسی کو نہ رہی
سوگواروں نے جو کچھ کھو دیا ہے
درویش کی کوئی بھی نظم
ان دُکھوں کا مداوا نہیں کر سکتی
اے تنہا لوگو!
ہمیں اک اور زمانہ جاہلیت کا سامنا ہے

لعنت ہو ان سب پر
جنہوں نے ہمیں دربدر کرنے کی خاطر
جنگ برپا کی
اور کندھے سے کندھا ملانے کے لیے
تمہارے جنازے رکھے
اے تنہا لوگو!
یہ دھرتی سامراج کی آزاد منڈی ہے
تمہارے کرتا دھرتا، ملک وملت کو
نیلام کرنے پر متفق ہو چکے ہیں
اے تنہا لوگو!
یہ دورِ جاہلیت ہے، تمہاری نصرت کو
کوئی بھی نہیں آنے والا
اے تنہا لوگو!
تمام قدیم شاعری
اور جدید قصیدوں کو
حذف کر دو، آنسوؤں کو پی جاؤ
اے وطن راکھ میں دبے
عزم وہمت کے شرر سلگنے دو"۔
اب وہ اونچی آواز میں رو رہا تھا۔

❁ ❁

ناول سلسبیل کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 12 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 13

ہشام جب اجنبی ملک کی اجنبی زمین پر اترا تو اس کے لیے کوئی مانوس خوشبو نہیں تھی۔ یہ ملک اس کے لیے اتنا اجنبی تھا کہ وہ یہاں کی فضا میں پہلا سانس لیتے ہی گھبرا گیا تھا۔

یہ اس کے ایسے باپ کا ملک تھا جو اسے پیدا کرنے کا سبب بنا۔ یہاں کی روایات رسم و رواج لوگ زبان سب کچھ تو بہت اجنبی تھا۔

اگر اس ملک میں کوئی تھا تو ایک عورت کا بوڑھا وجود جو صدیوں سے ہشام کی دید کی آس پے ایک ایک لمحہ گزار رہی تھی۔

اس ملک میں ہشام کے لیے کوئی کشش نہیں تھی سوا اس کے نرجس خیام اس کا سالوں سے راہ دیکھ رہی تھیں

ہشام کو پتہ تھا وہ بیمار تھیں۔ مگر وہ اتنی بیمار تھیں اسے یہ خبر نہیں تھیں۔

جب اس نے اپنے باپ کی قدیم سنسان کوٹھی میں قدم رکھا تو ایک زندگی اپنی آخری اکھڑی سانسوں کے ساتھ اختتام کے قریب تھی

یہ عورت اس کی ماں نہیں تھی پھر بھی اس کی ماں تھی

وہ ایک مضبوط انسان تھا وہ ایک مضبوط مرد تھا مگر ماں کی آغوش میں چھپ کر بے دردی سے رو پڑا تھا۔

اس کی وہ محرومیاں جو ڈیزی کی مرہون منت تھیں اس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھیں

اس نے ماں کی ممتا کو زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس کیا تھا۔

ہ اجنبی لکشمی چوک اور میکڈولڈ روڈ، پرانی کوٹھی اور ایک بوسیدہ کہانی جیسی ماں
آخر انتظار ختم ہوا
اور یہ صدیوں پر محیط جدائی اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ وہ ماں کے سینے سے لپٹا تو کئی دن اور راتیں گزر گیں۔
یہ ایسا سکون تھا جو کسی نگر کسی بستی میں نہیں تھا۔ نرجس خیام کو دیکھ کر پہلی مرتبہ ہشام کو احساس ہوا تھا کہ اس کے باپ نے اس عورت سے وفا کیوں نبھائی تھی۔ وہ ایسی عورت تھی جس کے ساتھ انسان کئی قرن جی سکتا تھا۔

وہ ماں کی خدمت پر معمور ہوا تو اسے اس پاس کی دنیا کی خبر بھی نہیں ہو سکی۔
گو کہ اس کے ارد گرد ایک مانوس خوشبو تھی۔ وہ خوشبو انجانی نہیں تھی
وہ ایک البیلی لڑکی شافیہ کی خوشبو تھی جس سے ہشام صدیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔
جب وہ اس کی ماں کو شعر پڑھ کر سنا رہی تھی۔ تب وہ سن کھڑا سن رہا تھا
''فَلَیْتَکَ لَو بَقِیتَ لِضُعفِ حالی
وَکانَ النّاسُ کُلُّہم فِدا کا
آرزوئے من تو جو میرے خستہ حال پر قرار لیتا
میں دنیا کی سبھی جانیں تجھ پر وار دیتا۔''
اس کی دھیمی آواز میں سوز تھا
ہشام بار بار چونکتا ٹھہر جاتا اور رک کر کئی پل سوچنے لگتا تھا
شافیہ غیر محسوس انداز میں اس کے اعصاب پر سوار تھی۔
ایک دن وہ اس کی ماں کو کچھ پڑھ کر سنا رہی تھی۔ وہ اس کی ماں کے پیروں میں مالش کرتی کسی اور ہی جہاں میں تھی۔
وہ لڑکی جو سراپا علم تھی اپنی ذات میں کئی داستانوں کا جہاں تھی۔ آپ کو پتہ ہے جی جی! میکسم

گورکی کی کتاب "ماں" میں جب پاول ولاسوف کیماں نے اُس سے اور اسکے دوستوں سے پوچھا،
”میں نے سنا ھے تم خدا کو نہیں مانتے"

پاول ولاسوف نے جواب دیا، ”ماں ہم اُس خدا کی بات نہیں کر رہے جو تیرے دل میں ہے، جو رحیم و کریم ہے، شفیق ہے اور اپنے بندوں سے محبت کرتا ھے“.

ہم تو اُس خدا کی بات کر رہے ہیں جو پادریوں اور مُلاؤں نے ھم پر مسلط کر رکھا ھے جو ھر وقت ڈنڈا لے کر بندوں کو ھانکتا ہے اور ھر وقت ان کو سزا دیتا ہے۔.

ماں!! ایک دن ھم اپنا خدا ان پادریوں اور مُلاؤں کے قبضے سے چھڑا لیں گے۔ پھر اُسکو اپنے دل میں بسائیں گے اور اُسکی حمد گائیں گے۔۔"

وہ دونوں پہروں ایک دوسرے کے ساتھ محوِ گفتگو رہتی تھیں۔

اور ہشام اس لڑکی کا دن بدن زیر بار تھا۔اس نے ایسی خدمت گزار لڑکی کہیں نہیں دیکھی تھی جو بے لوث محبت کے جذبات سے لبریز تھی

اس کی ماں کے اور بھی رشتے دار تھے جیسا کہ فرح سمیرا ان کے بچے خاص طور پر عرشیہ جس سے ہشام سخت بیزار تھا

پاکستان میں سوائے خداداد کی فیملی کے وہ کسی سے بھی ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔اس کے پاس وقت بھی کم تھا۔اسے پیچھے کی فکر تھی

ایک دن وہ زرد موسم میں گلابی لڑکی دسمبر پڑھ رہی تھی اداس آنکھوں والی پیاری لڑکی جو اس کی ماں کے لیے آکسیجن تھی وہ اس لڑکی کا قدردان اور احسان مند ہوتا جا رہا تھا

ہماری آنکھوں میں

سب موسم برابر ہیں

برسات ہو کہ خشک سالی

ہمارے دیس میں

وقت ٹھہرا ہوا ہے
عمریں گزرتی ہیں
جوانی بیت جاتی ہیں
ہم خوابوں کے سہارے
اپنی دنیا کو
آگے بڑھاتے ہیں
مگر ہم حقیقت میں
ٹھہرے ہوئے ہیں
ہمارے لئے سال بھر دسمبر ہے
ہماری آنکھوں میں
موسم رت بدلنے کا نام نہیں لیتا
مگر ہم خود کو بدلنے کی
جھوٹی ناٹک کر کے
مصنوعی مسکراہٹ پینٹ کرتے ہیں
کہ ہم اندر سے خوش ہیں
مگر دسمبر میں
پیڑوں پر پتے نہیں اگتے
دسمبر کی فطرت میں عریانی ہے
دسمبر میں بھوک ہے
افلاس ہے
جدائی ہے

دسمبر میں پھول کھلانے والی

دھوپ کی تمازت کے پیاسے ہیں

ہمارے لیئے تو

سال بھر دسمبر ہے۔''

ہشام کو خبر نہیں تھی یہ دسمبر اس کی زندگی میں شافیہ کی اداس آواز کی طرح ٹھہر جائے گا۔ یک دن جی جی نے اپنی اکھڑی سانسوں میں اسے ایک عہد یاد دلایا۔ جسے سن کر وہ کچھ پل کے لیے سن ہو گیا تھا۔

ماں کہنے لگی

''جب کوئی اپنا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو جائے تو بھلائے نہیں بھولتا۔۔

ستم ہائے روزگار میں اگر یاد تھوڑی دیر کے لیے محو ہو بھی جائے۔ تو راتوں کی تنہائی میں یا کسی کمزور لمحوں میں ان کی یاد پھر سے رلا دیتی ہے ایسے ہی تمہارا باپ مجھے کبھی نہیں بھولتا وہ ایک وفادار انسان تھا۔"

ماں کی تمہید کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی

"اب وہ وقت ہے کہ تم اپنے باوفا باپ کی طرح اپنا وعدہ نبھا دو بیٹا! میری زندگی کا چراغ گل ہو رہا ہے میں تم کو شافیہ کے ساتھ آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔"

اور کہیں دور بواریا میں ایک مجسمہ ٹوٹ گیا تھا

ہشام کے دل میں ٹیس سی اٹھی تھی

بواریا میں اس کی محبت انگڑائی لے کر جا گی تھی۔

اس کی ماں وعدے لے رح رہ تھی قسم لے رہی تھی

ہشام کی آنکھوں میں دھند پھیل رہی تھی کچھ تھا جو چبھ رہا تھا کچھ تھا جو بڑا ہی اذیت ناک احساس بن رہا تھا

''کر دیں گے دفن اپنی یہ خستہ محبت۔

کسی پیڑ کے نیچے کسی تاریک جنگل میں..

نظروں سے پرے دور، ہر ایک انکھ سے اوجھل..

رکھیں گے نہ کوئی پھول ہم اس کے سرہانے،

نہ قبر کے پیروں میں کوئی سنگ دھریں گے۔

اس کے لب و دہن سے ہمیں کتنی تھی محبت،

جو تلخ بہت تھے تو شیریں بھی بہت تھے۔

اب لوٹ کے نہ جائیں گے کبھی اس کی قبر پہ،

کہ یہ سرد جنگل جذبوں کی حرارت سے ہیں عاری،

مقدور بھر رکھیں گے خوشیاں یہ اپنے پاس۔۔

کہ ہاتھوں بچپن کو اپنے تھام سکیں ہم

گزاریں گے سبھی دن سورج کے تلے ہم

ایسی جگہ جہاں پر ہواؤں کا گزر ہو

راتوں کو اٹھ کے لیکن روئیں گے اس طور،

کوئی نہ جان پائے، کسی کو بھی نہ خبر ہو۔"

وہ ایسی چپ میں مبتلا ہوا جس کے اندر ہزار چیخیں تھیں اسے ڈی سوزا کا دیا ایک ناول یاد آ رہا تھا جسے بے شمار مصروفیت کے باوجود اس نے تھوڑا تھوڑا کر کے ختم کر لیا تھا۔

"خدا کا چاند سا چہرہ چوم لو۔۔"

اس کا عنوان ہشام کی نظر میں گردش کر رہا تھا ہشام کو اس کا ایک اقتباس یاد آ رہا تھا

"امی کہتی ہیں کہ مرد چاہے جتنے بھی بڑے ہو جائیں، پڑھے لکھے ہو جائیں اور امیر ہو جائیں ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں۔ جلدی روٹھ جاتے ہیں، جلدی پشیمان ہو جاتے ہیں اور فوراً صلح بھی کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے خواتین کے سامنے کچھ نہ کہیں لیکن تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں۔ امی کہتی ہیں

کہ یہی وجہ ہے کہ کسی نے مردوں کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔امی کہتی ہیں کہ خواتین لاکھ چھوٹی کیوں نہ ہوں، پھر بھی مائیں ہوتی ہیں اور مردوں کی پناہ گاہیں۔۔ یہاں تک کہ چھوٹی بچیاں بھی اپنے باپ کی پناہ گاہ ہوتی ہیں۔"

یہ اقتباس شاید ہشام کے لیے ہی لکھا گیا تھا

آج اسے اندازہ ہوا کہ لکھنے والے کچھ غلط نہیں لکھ گے تھے اپنی زندگی کا نچوڑ لکھ گے تھے۔کیوں کہ وہ اس بات سے پوری طرح متفق ہو چکا تھا کہ مرد ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں۔۔خاص کر محبت میں بچے بن جاتے ہیں۔۔

اور عورت چھوٹی بھی ہو پھر بھی محبت میں ماں بن جاتی ہے۔۔جیسا کہ شافیہ یا سلسبیل

اور اس وقت وہ یہ ناول سوچتا اس کے کرداروں کے اندر کھو کر وقتی طور پے اس سارے منظر نامے کو بھلا دینا چاہتا تھا جو کسی فلم کے ایک سین کی طرح کچھ دیر پہلے چلا تھا

ماں کا اصرار

ہشام کا اقرار

اور کچھ دیر پہلے نکاح کی تقریب۔کچھ لوگ۔گہما گہمی اور پھر گہرا سکوت۔جیسے اس وقت کچھ ہوا ہی نہیں تھا

وہ وقتی طور پے سب کچھ بھلا دینے کے لیے

خدا کا چاند سا چہرہ چوم لو" کو سوچنے لگا

یونیورسٹی میں سوشیالوجی پڑھنے والے یونس فردوس نامی ایک طالبعلم کی کہانی ہے جو خدا، عالم ہستی اور عقل و احساس کے مابین تضاد اور جنگ سے متعلق شکوک اور ابہامات کا شکار ہے۔

اس کے پاس ایک سوال یہ ہی ہے کہ خدا ہے یا نہیں۔۔

پھر اس کو حالات سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کہاں کہاں ہے۔۔

اس ناول سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ سب کا ہے۔اللہ اگر ہشام کا ہے تو شافیہ کا بھی ہے ہاں نا یہ

ہی کہ اللہ سب کا ہے۔۔

انسان کو ہر حالت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سب سے بہترین قدم کیا ہے سارا مسئلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان بہترین قدم کا انتخاب نہیں کرتا اس صورت میں اس نے کسی حد تک راستہ کھو دیا ہے اگر اگلے مرحلے میں وہ اچھا ہے کہ آگے سر تسلیم خم نہ کرے تو راستہ اور غمگھیر اور تاریک ہو جاتا ہے جب ہم ایک ہزار اچھے آپشنز کی جگہ ایک ہزار برے آپشنز چن لیتے ہیں تو ایک وقت آتا ہے حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ انسان ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔۔خوش قسمتی سے کائنات کا مالک اتنا سخی ہے کہ ہمیں ہر بار ایک نیا موقع فراہم کرتا ہے تا کہ ہم نئے سرے سے سب شروع کر سکیں۔۔یہ بار بار انتخاب بھول بھلیوں کی طرح ہوتے ہیں ہر اچھا انتخاب راستہ روشن کرتا ہے ہر برا انتخاب راستہ تاریک کرتا ہے انسان اچھا انتخاب کرتا جائے تو روشنی بڑھتی جاتی ہے اور برا انتخاب کرے تو اندھیرے میں دلدل میں دھنس جاتا ہے لیکن پھر بھی اس کو کائنات کا رب نیا موقع فراہم کرتا رہتا ہے ہے لیکن پھر اس کے لیے واپس آنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔۔یہ ایک انسان کے انتخاب پر ہوتا ہے اس کو زندگی کس طرح گزارنی ہے۔۔ہر انسان کے لیے خدا اس قدر وجود رکھتا ہے جتنا وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے بعض لوگوں کا خدا ان کے لیے ایک معمولی نوکری کا بھی بندوبست نہیں کر سکتا اور معمولی نزلہ زکام بھی ٹھیک نہیں کر سکتا چونکہ ایسے خدا پر ایمان رکھنے والا مومن اس سے صرف اس قدر ہی توقع رکھتا ہے۔۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑنے والے چورا ہے کا خدا یقیناً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خدا سے مختلف تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خدا جو اس پر شدید ایمان رکھنے کی وجہ سے آگ میں جاتا ہے اور بیٹے کی گردن پہ چھری پھیرتا ہے یقیناً اس چراوہے کے خدا سے زیادہ بڑا اور مضبوط ہیا نسان اپنی زندگی سے خدا کو نکال دے تو وہ زندہ ہو کے بھی مرا ہوا انسان ہے خدا زندگی کا سر چشمہ ہے اور جو کوئی اس سر چشمے سے نکل جائے تو اس میں ذرا برابر بھی زندگی نہیں۔۔"۔۔

خدا ہی انسان کو ہدایت عطاء کرتا ہے اور ایسی سوچ ایسا ذہن عطاء کرتا ہے جو اس کی درست رہنمائی میں مدد کر سکے۔فیصلہ تو ہو چکا تھا

اس نے بس اسے تسلیم کرلیا

اور مسکرا کر اس ماں کو گلے لگایا جس کی وجہ سے وہ آج یورپ کی ورکنگ کلاس کا نمائندہ نہیں بلکہ ایک معزز مسیحا تھا

وہ ماں جس کی دولت نے اسے غنی کیا اور اسے سسک سسک کر جینا نہیں پڑا۔وہ ماں جس کی مدد کے بغیر وہ کبھی اپنی تعلیم پوری نہیں کرسکتا تھا

اور نہ اپنے خواب پورے کرسکتا تھا۔اس نے محبت کو ہار کے ماں کی آس کو بچالیا ماں کے مان کو بچا کر اس نے محبت آرام سے ہار دی تھی۔

یہ فیصلہ مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔فیصلہ ہو گیا مگر شہر دل کی گلیوں میں ایسا کہرام برپا ہوا جسے سنبھالنا اسکے بس سے باہر تھا

وہ ان چیخوں میں اپنی آواز شامل نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ بے آواز رو رہا تھا۔

محبت کوئی لباس تو نہیں تھا جو بدل لیا جاتا۔ایک وجود جس کے گرد توقعات کا ایک جہاں بندھا تھا وہ اس سے کھو رہا تھا

زخم زیادہ گہرا تھا اس لیے درد کی شدت بھی زیادہ تھی۔اسے مولانا رومی کی ایک غزل یاد آرہی تھی

”بنمای رخ کہ باغ وگلستانم آرزوست

بگشای لب کہ قند فراوانم آرزوست

اے محبوب! تو اپنا چہرہ دکھا کہ مجھے باغ اور گلستان کو دیکھنے کی خواہش ہے۔

تو اپنے ہونٹ کھول کہ مجھے بہت زیادہ مٹھاس کی خواہش ہے۔

ای آفتاب حُسن برون آ دمی ز ابر

کآن چہرہ مُشعشَعِ تابانم آرزوست

اے حسن کے سورج! تو ایک لمحے کے لیے بادلوں سے باہر آجا
کہ میں اس روشن اور چمکدار چہرے کو دیکھنے کا آرزومند ہوں

بشنیدم از ہوای تو آواز طبل باز
باز آمدم کہ ساعدِ سلطانم آرزوست
میں نے سنا ہے کہ تیرے ہاں باز چھوڑنے کا طبل بجادیا گیا ہے
میں بھی لوٹ آیا ہوں کہ میں اپنے سلطان کی کلائی پر بیٹھنے کا آرزومند ہوں

گفتی ز ناز بیش مرنجان مرا برو
آن گفتنت کہ بیش مرنجانم آرزوست
تو نے بڑے ناز و ادا کہا کہ مجھے مزید نہ ستاؤ اور چلے جاؤ
مگر مجھے تو تمہارا یہ کہنا "مجھے مزید نہ ستاؤ" سننے کی آرزو ہے۔

وآن دفع گفتنت کہ بروشہ بہ خانہ نیست
وآن ناز و باز و تندی دربانم آرزوست
اور اس بار تم نے کہا تھا "چلے جاؤ بادشاہ گھر میں نہیں ہے"
اور مجھے وہ ناز و ادا اور دربان کی سختی دیکھنے کی خواہش ہے۔

در دست ہر کہ ہست زخوبی قُراضہ ؟ ہاست
آن معدن ملاحت وآن کانم آرزوست
ہر وہ شخص جس کے ہاتھ میں اس کی خوبی کا ایک ذرہ بھی ہے

وہ اس ملاحت بھری معدن اور کان کی آرزو کر رہا ہے

این نان وآب چرخ چو سیل است بی ؟ وفا
من ماہی ؟ ام نہنگم و عُمانم آرزوست
قسمت کی روزی روٹی سیلاب کی طرح بے وفا ہے
میں وہ مچھلی ہوں جسے مگرمچھ اور گہرے سمندر کی آرزو ہے

یعقوب ؟ وار وااسفاہا ہمی ؟ زنم
دیدار خوب یوسف کنعانم آرزوست
میں بھی حضرت یعقوب علیہ السّلام کی طرح "وااسفا" پکار رہا ہوں۔
میری خواہش ہے کہ میں اس کنعان کے یوسف (محبوب) کو اپنے خواب میں ہی دیکھ لوں

واللہ کہ شہر بی ؟ تو مرا حبس می ؟ شود
آوارگی و کوہ و بیابانم آرزوست
خدا کی قسم، تیرے بغیر مجھے یہ شہر قید خانہ لگتا ہے
مجھے آوارہ پھرنے، پہاڑوں اور ویرانوں کی آرزو ہے۔

زین ہمرہان سست ؟ عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
میرے ساتھ چلنے والے سست ہیں اور مجھے ان کا افسوس ہے
مجھے تو اپنا ساتھ دینے کے لیے حضرت علی اور رستم جیسے بہادر لوگوں کی ضرورت ہے۔

جانم ملول گشت زفرعون وظلم او
آن نور روی موسیٰ عمرانم آرزوست
میری جان، فرعون اور اس کے ظلم کی وجہ سے دکھی ہو رہی ہے۔
مجھے موسیٰ بن عمران علیہ السلام کے چہرے کے نور کی خواہش ہے۔

زین خلق پر شکایت گریان شدم ملول
آن ہای ہوی ونعرہ؟ مستانم آرزوست
یہ مخلوقِ خدا میرے رونے کی شکایت کرتی ہے تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔
مجھے تو ہاؤ ہو کرنے اور مستی کے عالم میں نعرے لگانے کی آرزو ہے۔

گویا ترم زبلبل امّا زرشک عام
مُہر است بردہانم وافغانم آرزوست
میں بلبل سے زیادہ بولنے والا ہوں لیکن دوسرے لوگوں کے حسد کی وجہ سے
میرے ہونٹوں پر مہر لگی ہوئی ہے اور میں آہ وفغاں کرنے کا خواہش مند ہوں

دی شیخ با چراغ ہمی؟ گشت گرد شہر
کز دیوودد ملولم وانسانم آرزوست
کل ایک بزرگ ہاتھ میں چراغ لیے پورے شہر میں گھومتا رہا
وہ کہتا تھا میں دیوؤں اور درندوں سے دکھی ہو کر انسان تلاش کر رہا ہوں۔

گفتند یافت می ؟ نشود جستہ ؟ ایم ما
گفت آن کہ یافت می ؟ نشود، آنم آرزوست
انہوں نے کہا، جو ہم ڈھونڈ رہے ہیں وہ ہمیں نہیں ملتا
اس نے کہا جو ملتا نہیں مجھے اسی کی آرزو ہے

ہر چند مفلسم نپذیرم عقیق خرد
کان عقیق نادر ارزانم آرزوست
اگر چہ میں نادار ہوں عقیق خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا
لیکن پھر بھی وہ نایاب عقیق سستے داموں لینے کی خواہش رکھتا ہوں

پنہان ز دیدہ ؟ ہا و ہمہ دیدہ ؟ ہا از اوست
آن آشکار صنعت پنہانم آرزوست
وہ نظروں سے پوشیدہ ہے اور ساری نظریں اسی سے ہیں
اور میری خواہش ہے کہ اس کی چھپی ہوئی صنعت آشکار ہو جائے۔

خود کار من گذشت ز ہر آرزو و آز
از کان و از مکان پی ارکانم آرزوست
میرا کام میری ہر آرزو سے آگے نکل گیا ہے
میں چاہتا ہوں کہ کون و مکان کے سہاروں کے بغیر ہو کے رہوں۔

گوشم شنید قصہ ایمان و مست شد
کو قسم چشم ؟ صورت ایمانم آرزوست
میرے کان نے ایمان کا قصہ سنا اور مست ہو گیا۔
کون آنکھوں کی قسم کھاتا ہے، ایمان کی صورت دیکھنا چاہتا ہوں۔

یک دست جام بادہ و یک دست جعد یار
رقصی چنین میانہ ؟ میدانم آرزوست
ایک ہاتھ میں شراب کا جام ہو اور ایک میں محبوب کی زلفیں
میری خواہش ہے کہ اس حالت میں میدان میں رقص کروں۔

می گوید آن رباب کہ مردم ز انتظار
دست و کنار و زخمہ ؟ عثمانم آرزوست
جس رباب کا لوگ انتظار کر رہے ہیں، وہ کہتا ہے کہ
مجھے عثمان کے ہاتھ، گود اور مضراب کی آرزو ہے۔

من ہم رباب عشقم و عشقم ربابی است
و آن لطف ؟ ہای زخمہ ؟ رحمانم آرزوست
میں عشق کا رباب ہوں اور عشق میرا رباب ہے
اور میں چاہتا ہوں کہ رحمان کے مضراب سے لطف اٹھاؤں

باقی این غزل را ای مطرب ظریف

زین سان ہمی؟ شمار کہ زین سانم آرزوست

اے خوش مزاج مطرب باقی غزل کو ویسا ہی سمجھ جیسا کہ وہ (محبوب) سمجھتا ہے۔

بنمای شمس مفخر تبریز روز شرق

من ہدہدم حضور سلیمانم آرزوست

اے شمس فخرِ تبریز مشرق سے اپنا چہرہ دکھا

میں بھی ہدہد کی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کا قرب چاہتا ہوں

چارلس بکاؤسکی نے کیا خوب لکھا

''اگر تم کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینا چاہتے ہو، تو دل و جان سے اس میں مصروف ہونا۔ اگر نہیں کر سکتے، تو بہتر ہے کہ شروع ہی نہ کرو۔ اور قربانی کے لئیھر وقت تیار رہو۔ خاندان، بیوی، دوستی، نوکریاں، اور حتی زندگی بھی داء پر لگ سکتے ہیں۔ کئی دنوں تک بھوکے رہنا اگر ممکن ہو، کبھی کبھی سفر میں سرد راتیں تمہارے جوش کو ٹھنڈا کر سکتی ہیں، قدرت کے ساتھ جڑ جاؤ، اکیلے لڑو، اور اندر کی آگ کو بجھنے مت دو۔ فکر نہ کرو، یہ صبر کا امتحان ہے۔ اگر تم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ مشکل حالات کا مقابلہ کیا، ثابت قدم رہے تو پھر جانو کہ جیت تمہارا مقدر ہوگی، اور تم وہ حاصل کرو گے جو تم نے خوابوں میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔

let it be deep. If you don't, ydfi you are going to try you mat loose family, wifebetter not even start. friendship, jobs and even your head. You may not eat days, you may freeze on a bank in the street. Never m

Itss test of resilience to know you can do it. And you
Despite the rejection uncertainty, it will be better th
anything you have imagined. You will be alone with go
and the nights will burn in flames. You will ride to
perfect laugh. It's the only battle that coun۔

امام ابن حزم نے فرمایا ہے "محبت؛ ایسا جذبہ ہے جس کا آغاز ہنسی مذاق ہے اور انتہا درد و کرب۔اس کی شانِ عظمت کے سبب اس کا صحیح معنی بیان کرنا مشکل ہے،اس کی حقیقت کو صرف اس میں گرفتار ہو کر ہی پایا جاسکتا ہے۔محبت سا پاک جذبہ دین میں عیب نہیں اور نہ ہی شریعت میں ممنوع ہے، کہ تمام دل اللہ عزوجل کے ہاتھ میں ہیں .ہدایت یافتہ خلفاء اور خدا کی راہ پر گامزن بہت سے ائمہ اور صالحین نے بھی محبت کی ہے۔

ہم نے یہ جانا ہے کہ محبت کئی طرح کی ہوتی ہے،سب سے افضل محبت ان دو محبت کرنے والوں کی ہے جو صرف اللہ عزوجل کے لیے محبت رکھتے ہیں؛ چاہے یکجا اعمال کی بدولت، یا ایک مذہب اور عقیدے کے اتفاق میں، یا پھر علم و فضل کی بدولت جس کی انسان قدر کرتا ہے۔

اس کے علاوہ رشتے داری کی محبت ہے، کاروبار اور مقاصد میں اشتراک اور مانوسیت کے باعث بھی محبت ہوتی ہے، جان پہچان رکھنے والوں کی محبت ہے، کسی آدمی کے احسان نیکی کی وجہ سے اس سے محبت ہوتی ہے، کسی کے شان و شوکت کی طمع میں اس سے محبت ہو سکتی ہے، یا دو ہمراز کسی اہم راز کو چھپانے کی خاطر محبت کرسکتے ہیں، راحت کے حصول اور حاجت کے پورا ہونے کی محبت بھی ہوتی ہے۔(محبت کی ان تمام اقسام میں وقوعِ محبت کا کوئی علت اور سبب ہوتا ہے) مگر عشق والی محبت میں ان اسباب میں سے کوئی علت نہیں ہوتی

جو اتصال نفوس کے بیان میں ہم نے ذکر کیے ہیں۔محبت کی یہ تمام اجناس اپنی علت کے ختم ہونے سے ختم ہو جاتی ہیں، اس سبب کے اضافے سے بڑھتی ہیں، کم ہونے سے اس محبت میں بھی کمی آتی

ہے، اس سبب کی قربت میں گہری ہوتی ہیں اور اس کے دور جانے سے وہ محبتیں بھی گم ہو جاتی ہیں؛ ماسوائے محبتِ عشق کے جو انسان سچے دل سے کرے۔ اس محبت کو موت کے سوا کوئی چیز فنا نہیں کر سکتی۔
آپ ہمیشہ عاشق کو اپنے محبوب کے غم کے ساتھ پائیں گے، اور ختم ہوتی عمر کے بوڑھے کو دیکھیں گے جب اس کی محبت کے زمانے کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس کی یادداشت میں نشاط آتی ہے اور وہ محبت کی لذت میں جھومنے لگتا، خوشیاں اس کی طرف لوٹ آتی ہیں اور یادیں اس کے لیے آراستہ ہونے لگتی ہیں۔"

راتیں اس پر بھاری ہوگئی تھیں اور دن بیزار
ایک شب خداداد نے اسے ایک نظم بھیجی تھی جسے پڑھ کر ہشام کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔
اور اس کا سانس بند ہو گیا

"گاؤں میں وہ دن تھا اتوار
میں ننھی پیڑھی کا ہاتھ تھام کر
نکل گئی بازار

سوکھے درختوں کے بیچ دیکھی
ایک پتلی پگڈنڈی
میں نے ننھی پیڑھی سے کہا
دیکھو یہی تھی کبھی گاؤں کی ندی
آگے دیکھی زمین پر بڑی سی دراڑ
میں نے کہا، اسی میں سما گئے سارے پہاڑ

اچانک وہ سہم کر لپٹ گئی مجھ سے
سامنے دور تک پھیلا ہوا تھا ڈراؤنا قبرستان

میں نے کہا دیکھ رہی ہو اُسے
یہی تھے کبھی تمہارے اجداد کے کھلیان
ننھی پیڑھی دوڑی اور ہم پہنچ گئے بازار

کیا کیا لینا ہے
پوچھنے لگا دُکاندار
بھیا تھوڑی سی بارش،
تھوڑی گیلی مٹی
ایک بوتل ندی
دو ڈبہ پہاڑ
اور ہاں
اِدھر دیوار پر ٹنگی ایک وادی بھی دے دو
اور یہ بارش اتنی مہنگی کیوں؟
دُکاندار بولا: یہ نمی یہاں کی نہیں
دوسرے علاقے سے آئی ہے
بہت مندی ہے
اس لیئے چھٹانک بھر منگوائی ہے

پیسے نکالنے ساڑھی کا پلو جب ٹٹولا

تو میں چونکی اور دیکھا

آنچل کی گانٹھ میں روپوں کی جگہ

میرا پورا وجود مڑا پڑا تھا"""

وہ خداداد سے پوچھنا چاہتا تھا کہ بواریا میں اس کے بعد کیا ہوا؟ مگر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ خداداد سے کچھ بھی نہیں پوچھ سکا یہاں تک کہ اس کی بیمار ماں نے اس کے لیے شب زفاف سجائی تھی وہ جن دو لوگوں سے زندگی بھر محبت کرتی رہیں ان دو لوگوں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتی تھیں

انہوں نے سرخ پیراہن میں شافیہ کو ہشام کے لیے سجایا تھا

وہ اندلس کی خواتین کی طرح

خوش لباس لگ رہی تھی

اندلس کی خواتین کی خوش لباسی اور زینت کی مثال نہیں ملتی۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے ایک قطعہ اس بارے لکھا ہے۔

إذا مارأت عيناي لابس حمرةٍ

تقطع قلبي حسرةً وتفطرا

غدا الدماء الناس باللحظ سافكاً

وضرج منها ثوبه فتعطرا

"میری نگاہوں نے جب اس سرخ پیرہن میں ملبوس محبوبہ کو دیکھا تو میرا دل اس سے ملاقات کی حسرت میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر گیا، جو لوگ اس پر فدا ہوئے، اس نے ان کے خونِ بسمل سے اپنے

لباس کو رنگ کر معطر کر لیا".

دیوان ابن حزم اندلسی میں لکھے لفظ اس کے سامنے تھے

آج نجانے خون کس کا ہوا تھا؟۔

آج کسی کا خون ہوا تھا

شاید سلسبیل کا

یا شاید ہشام کا؟

مگر لگتا تھا خون شافیہ کا بھی ہوا تھا جو شیشے کی طرح شفاف تھی اور اس کی روح جیسے نتھرا کانچ سا پانی۔اس پہ محبت وحی کی طرح اتری۔

محبت کائنات کا محور مگر روحِ انسانی کا اِک جزء ہے محبت روح جسم زندگی اور سانس ہے

امام ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ کا فلسفہ محبت و روح، اور ایک لازوال شاعرانہ تخیل ہے۔

کسی نے بہت خوب لکھا تھا۔

"فلسفے کی ابتداء سے ہی انسان "روح" کی ماہیت اور حقیقت جاننے کا متلاشی رہا ہے . اس نے روح کا حال جاننے کی خاطر گونا گوں عجائب اور موشگافیاں بیان کیں ہیں۔مسلمان فلاسفہ اور متکلمین بھی روح کے اسرار پانے کے متمنی رہے ہیں اور اس کی خاطر انہوں نے "علم العجائب" یعنی Paranormal کا اثبات بھی کیا ہے اور اس علم پر باقاعدہ تحقیقات اور کتب بھی تصنیف کی ہیں۔اسلامی تاریخ میں امام ابن حزم رحمہ اللہ اس لحاظ سے بھی منفرد ہیں کہ انہوں نے انسانی جذبات جیسے۔محبت، نفرت اور حنین (ناسٹلجیا) کا تعلق بھی روح کے ساتھ جوڑا ہے"۔یہ تحریر اس کی نظر سے بہت بار گزری تھی کسی نے نجانے کس جھونک میں لکھ دیا تھا مگر پڑھنے والے کے اندر یہ لفظ جم گے تھے۔کبھی کبھی راہ چلتے کہیں سے گزرتے کوئی تحریر کوئی لفظ کوئی اقتباس دل میں گھر کر جاتا ہے

ہشام کے ساتھ اکثر ہی ایسا ہوتا تھا خاص طور پر فلسفہ محبت پے جس نے بھی لکھا ہشام کو لگتا تھا خاص اسی کے جذبات سوچ کر ہی لکھا گیا تھا

"محبت کی اصل عالم ارواح میں ہے؛ دو محبت کرنے والوں کی روحیں عالم ارواح میں متصل تھیں جو اس دنیا میں جدا ہو کر دوبارہ مل گئیں تو ان میں الفت کا رشتہ بندھ گیا۔ جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تمام انسانوں کی روحیں اللہ کے ہاں ایک منتشر ہجوم کی صورت میں موجود تھیں جو وہاں ایک دوسرے سے مانوس ہوئیں دنیا میں آ کر بھی وہ ایک دوسرے سے محبت کرتی ہیں اور جو عالم ارواح میں اجنبی رہیں وہ دنیا میں بھی کبھی محبت نہیں کرتیں اور آپس میں نہیں ملتیں۔ دو محبت کرنے والوں کی روحیں عالم ارواح میں یکجا یعنی ایک دوسرے کا جزء تھیں، جب وہ تقسیم ہو کر دنیا میں آئیں تو یہ دونوں جزء جو تقسیم تھے پھر محبت سے متصل ہو گئے۔ اور محبت تو اصل میں روح کا رشتہ ہے؛ سفلی عناصر میں یہ لطیف جوہر کیسے سما سکتا ہے۔ اور یہی حقیقت میں محبت ہے۔ محبت اس عالم رفیع سے اس عالم سفلی میں وجود میں آتی ہے۔ محبت اگر انسانی جسد تک محدود ہوتو پھر انسان ہمیشہ اپنے سے خوبرو اور حسین ترین وجود سے ہی محبت کرتا لیکن اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ محبت اپنے سے کمتر اور عامی صورت سے بھی ہو جاتی ہے۔ صورت کے میلان سے کہیں زیادہ دو محبت کرنے والوں میں طبعی اخلاق وخصائل کا امتزاج دیکھنے میں آیا ہے اور اکثر دو محبت کرنے والوں کے لیے آپس میں سب سے بڑا سبب یہ نفسی اتصال ہی ہے جو روح کا بندھن ہے۔ دو روحیں ایک دوسرے کے لیے سفلی عناصر میں وہ عادات اور اخلاق ودیعت کرتی ہیں جو ان کو باہم متصل کرتا ہے۔ آپس میں غم خواری کرنا؛ محبوب سے جدائی پر خوف اور وحشت آنا، یہ رشتہ نہ آسانی سے قائم ہوتا ہے نہ آسانی سے ٹوٹتا ہے اور محبت کے بارے میں بھی یہی مذہب ہے کہ محبوب بڑے عرصے کی مانوسیت کے بعد محبوب بنتا ہے اور پھر اس سے محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ جو مشقتوں اور راتوں کی بیداری سے دل میں آتا ہے وہ پھر آسانی سے جدا نہیں ہوتا۔ اور یہی حال روح کا ہے، ایک اثر (روایت) جو کہ عام پڑھی یا سنی جاتی رہی کہ "جب آدم علیہ السلام جسد خاکی کی صورت موجود تھے تو اللہ نے روح کو حکم دیا کہ اس گارے کے پتلے میں داخل ہو جا۔ تو روح مشقت اور تنگی سے ہی اس میں داخل ہوگی اور مشقت وتکلیف کے ساتھ ہی اس سے نکلے گی!!"

ابن حزم رحمہ اللہ کے نزدیک محبت کا جذبہ انسانی عمل ہے، ایک مخلوق ہے۔ کیونکہ اس پر نص

وارد ہے کہ انسان کا عمل مخلوق ہے۔ اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے۔ ابن حزم اس جذبے کی اساس دنیاوی عوامل و اسباب، جسمانی رابطوں، اخلاق و عادات میں اتصال نفسی وغیرہ سے بڑھ کر کہیں روح کے تعلق کو قرار دیتے ہیں جس کا ظہور انسان کے جسم کے وجود سے بھی لاکھوں برس پہلے ہوا تھا۔ اس فلسفے کو بیان کرنے کی خاطر ان کی محقق اور اہم ترین دلیل نبی اکرم ﷺ کی یہ حدیث ہے

”روحیں پیدائش سے قبل ایک منتشر ہجوم کی صورت تھیں، جو وہاں ایک دوسرے سے مانوس اور متعارف ہوئیں وہ دنیا میں آکر بھی محبت کرتی ہیں اور، جو وہاں الگ رہیں دنیا میں بھی جدا رہتی ہیں (محبت نہیں کرتیں)"

یہ حدیث تین اسناد کے ساتھ مروی ہے۔ بخاری و مسلم کے علاوہ اسے امام ابو یعلی رحمہ اللہ نے بھی "مسند" میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

ابن حزم رحمہ اللہ مانتے ہیں کہ جو روحیں عالم ارواح میں ایک دوسرے سے مانوس نہیں ہوتیں اور محبت نہیں کرتیں وہ دنیا میں بھی کبھی محبت نہیں کرسکتیں چاہے پوری زندگی ایک لحظہ جدا نہ ہوں لیکن جو روحیں عالم ارواح میں متعارف اور مانوس ہوتی ہیں وہ دنیا میں آکر بھی ایک دوسرے سے محبت کرتی ہیں چاہے مشرق و مغرب کا بعد ان میں حائل ہو۔

الغرض یہ خاص عظیم فلسفہ اور فکر اتنی اہم ہے کہ اگر تفصیل و اجزاء اس کا احاطہ کریں تو ابن حزم کا فلسفہ محبت و عشق، فن و شعر، ادب و بلاغت اور تذکیر اخلاقی تو ایک طرف رہے یہ مہتم بالشان نظریہ ان کے منفرد فقہی مذہب پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اخلاق و خصائل کے باب میں بھی وہ وفاداری اور دوستی کو روح کا سنگم ہی مانتے ہیں۔ اپنے "الرسالۃ الساحرۃ فی مداوۃ النفوس علی الأخلاق" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”اصلی تعلق اور مانوسیت تو روح کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے (بدن کے ساتھ نہیں). کیا تم نے دیکھا نہیں کہ مرنے کے بعد انسان اپنے محبوب کے مردہ جسم سے بھی دور بھاگتا اور خوف کھاتا ہے لیکن اس کی روح کے جدا ہونے پر روتا ہے چاہے جسم اس کی گود میں پڑا ہو"

یہ الفاظ ہشام کے لیے برق کی طرح تھے اور آج تمام پڑھی کتابوں کے اقتباس اسے یاد آرہے تھے

ابن حزم فرماتے ہیں

~"میری دلربا! آپ اتنی نازک ہیں کہ باخدا!
میں آپ کو چھونے سے ڈرتا ہوں
میرا دل تو اس اندیشے سے سہما جاتا ہے
کہ کہیں آپ میرے ہاتھ کے لمس سے پگھل نہ جائیں
اسی واسطے میں نے ملاقات وصل ترک کر رکھی ہے
میں اب آپ کی اس ملاقات پر انحصار کرتا ہوں
جو نیند کی وادیوں میں ہوتی ہے
جب ساری کائنات سو جاتی ہے تو
میری روح کو آپ کے ساتھ کامل تنہائی نصیب ہوتی ہے
اب یہی ملاقاتیں میرا وصل ہیں
سارے عالم سے اوجھل ہو کر میری روح آپ کی روح سے
وہ حظ اٹھاتی ہے
جو بدن کی ملاقات سے ہزار ہا گنا زیادہ لذیذ اور بالطف ہے
~میرے تلامذہ نے اک روز
عمر میری پوچھی!
میں نے نگاہ اٹھا کر رات کے آخری ستارے کو دیکھا
تہجد کا نور ہمارے حلقے کو گھیر رہا تھا
خالق ارض وسماء، آسمان دنیا سے ہمیں دیکھ رہا تھا
پھر وہی ستارہ میری پلک پر چمکا

میں نے پلکیں جھپکائے بغیر اپنے تلامذہ کو کہا۔

''میری عمر بس ایک ساعت ہے!!"

میری داڑھی کی سفیدی اور بالوں کا ضعف دیکھتے ہوئے ان کے قلم رک گئے۔ وہ کہنے لگے۔

''استاد! آپ نے آج ہمیں یہ کیا حیرت زدہ و عجیب خبر سنائی"

" قرطبہ کی گلیوں کی قسم!!! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں انہیں کہنے لگا۔

وہ لڑکی جو میرے دل کے بالاخانے میں رہتی ہے

کسی بیتے زمانے میں، زینہ چڑھتے

کچھ ڈرتے، کچھ شرماتے

میں نے اسے چوما تھا: اک گھڑی

میں نے اس پل سے پہلے اور بعد میں

گزری دہائیوں کو اپنی عمر میں شمار نہیں کیا کبھی!!

بس وہی اک ساعت ہی

میری عمر تھی

وہ کیلاشی قبیلے کا کُرتا پہنے

نیم مسکراہٹ سے نل پر رکی تھی

مہندی سے بنا اک پھول اس کے ہاتھ پر کھِل رہا تھا

گیلن کا ڈھکن کھلتے ہی میں نے

چلتے نل کے نیچے اس کا ہاتھ جکڑ

کر چلو بنا دیا

ہمارے دونوں ہاتھوں کا کوزہ جب پانی سے بھرا
میں نے اس کی ہتھیلی کے کنارے لب لگا کر
محبت کے سبھی روزے توڑ دیے!!

پانی اس کے چلو سے میرے لبوں تک آتے بھولے ہوئے اساطیر کی آبشار بن گیا....
میں نے "لوحِ محفوظ" کے فرشتوں سے گزارش کی
میرا تذکرہ یہاں کیسے ہے؟
انہوں نے کہا تمہارا نام بس ایک جگہ رقم ہے،
'غرناطہ کی پن چکی کے عقب میں
ایک روح اپنے بدن کو پانی پلائے گی...
ربّ العالمین "کُن" فرما چکا!!"۔
چودھویں کی ہر شب
میں سنتا نہیں مگر
مجھے لگتا ہے اس نے ضرور
چاند کو دیکھ کر کہا ہے:
"میں تمہاری ہوں!!"
مغرب کی نماز کے بعد
اک فرشتہ میرے کان میں
سرگوشی سناتا ہے۔
"اپنی روح کے ماتھے پر بوسہ دو"
اس کی روٹھی آنکھیں جب بھی

میرے خواب میں آتی ہیں
سورج سے پہلے، پوری سحر
میں اس کے لیے
جیب میں چھپا لیتا ہوں!!
شفق دیکھ کر پنچھی جب
گھروں کو لوٹتے ہیں
مسکراتے ہوئے!!
ایک فاختہ اسے میرے خط کا
جواب لکھتے دیکھتی ہے
• ایک اجلا پیرہن دھوپ میں سوکھتا ہوا
میری آنکھوں پر چھینٹیں مار کر
کہہ رہا ہے۔
"شام کو کھڑکی میں ملنا!!"
• چٹیا جب بھی دائیں کندھے سے لٹکائے
میں جان جاتا ہوں وہ کیا کہہ رہی ہے
ایسی زبان میں؛ جو پوری دنیا میں بس
ہم دونوں کو ہی آتی ہے
اگلی صبح مجھے
اس کی گلی سے "ناریل کی چاکلیٹ"
کی خوشبو آتی ہے۔"

اور دو روحیں جو آسمانوں پہ ایک دوسرے سے ملاقات کر چکی تھیں آج زمین پر ان کے بدن بھی ملا دیے گے تھے

ابن حزم اندلسی صحیح فرما گے تھے۔انسان کی محبت جسم سے نہیں روح سے ہوتی ہے۔جب انسان مرجاتا ہے تو بدن پاس ہونے کے باوجود اس انسان کی روح کے لیے کیوں رویا جاتا ہے؟

اور آج دو روحیں زمین پر ایک دوسرے سے مل کر رو رہی تھیں۔

قسط نمبر 14

سوا اس ایک کوٹھی کے باقی سب کچھ جی جی کی بھتیجیوں میں تقسیم ہو گیا تھا بس یہی وجہ تھی کہ شافیہ کے نکاح پر زیادہ واویلا نہیں کیا گیا تھا

اسود اور اس کی ماں سمیت سب نے کروڑوں روپے سمیٹے اور شافیہ پے فاتحہ پڑھ دی_ سمیرا کی بیٹھے بیٹھائے شافیہ سے جان چھوٹ گئی تھی

اب وہ سکون کے ساتھ عرشیہ اور اسود کی شادی کر سکتی تھی_ سب کچھ حسب منشا ہو گیا تھا اور ہشام کو ہاتھ سے نکالنے کا دکھ بھی نہیں رہا تھا_

ہشام واپسی کی تیاریاں کر رہا تھا_

ظاہر ہے وہ جس کے لیے آیا تھا وہ وجود ہی نہیں رہا تھا اسے اس دیس میں کون سی کشش کھینچ سکتی تھی؟

جب وہ آخری بار خداداد کے گھر آیا اور اس کے بھائی شایان سے بات چیت کر رہا تھا تب وہ پریشان تھا

شان نے فکرمندی سے پوچھا

"ہشام بھائی! آپ کیوں پریشان نظر آ رہے ہیں؟"_

"ہاں میں پریشان ہوں کیونکہ میں شافیہ کو فی الحال ساتھ نہیں لے جا سکتا"_

اس نے اپنی فکرمندی کی وجہ بتائی تھی

"اور یہ بھی کہ اسے کن لوگوں میں چھوڑوں؟ ایسے لوگ جو گدھ سے بھی بدتر ہیں لالچی اور مطلبی"_

شان اس کی بات سمجھ رہا تھا

" مگر میری ماں کی وصیت ہے میں شافیہ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا؟_"

شان سمجھ سکتا تھا اس لیے تسلی دیتا بولا

"ہمارے ہوتے ہوئے آپ فکر مند نہ ہوں بھائی! شافیہ آپ کے حوالے سے اور بھی محترم ہے، بہن تو تھی ہی اب بھابھی بھی ہے۔"

ہشام کے لیے یہ نئی رشتے داری اجنبی تو تھی مگر وہ رشتے سنبھال کر چلنے والا انسان تھا۔ کتنے ہی دن سے اس کا موبائل بند تھا آج اس نے موبائل کھولا تو بہت سارے پیام موجود تھے۔ رات کو جب اسے خطیب کی طرف سے بہت دنوں بعد نیوائیر کا میسج آیا تو اس کے اندر سلسبیل ایک حقیقت بن کر جا گی تھی۔ وہ اس کا نیوائیر میسج پڑھ رہا تھا

شاعرہ ایلا ویلر ول کاکس کی نظم تھی ہشام سن سا اسکرین کو دیکھ رہا تھا

"نئے سال کی نظموں میں کیا بیاں ہو سکتا ہے؟

جو ہزاروں بار نہ کہا گیا ہو؟

سال نو آتا ہے، پرانا سال جاتا ہے،

ہمیں معلوم ہے ہم خواب دیکھتے ہیں، ہم خواب دیکھتے ہیں ہمیں معلوم ہے یہ۔

ہم روشنی کے ہمراہ ہنستے ہوئے اٹھتے ہیں،

شب کے ہمراہ روتے ہوئے لیٹ جاتے ہیں۔

ہم دنیا کو گلے لگاتے ہیں جب تک یہ ہمیں ڈس نہ لے،

تب ہم ملامت کرتے ہیں اور قوتِ پرواز کے لیے آہیں بھرتے ہیں۔

ہم جیتے ہیں، ہم پیار جتاتے، وعدے کرتے اور شادی رچاتے ہیں،

ہم اپنی دلہنوں کو ہار پہناتے اور مردوں کو کفناتے ہیں۔

ہم ہنستے ہیں، روتے ہیں، امید لگاتے اور ڈرتے ہیں،

اور یہی سال بھر کے بوجھ ہیں۔

اس نے زیر لب شاعرہ کا نام دوہرایا

"The Year

By Ella Wheeler Wilcox "

اب وہ انگریزی میں پڑھ رہا تھا اور اس کی آنکھ نم ہو رہی تھی

What can be said in New Year rhymes,
That's not been said a thousand times?

The new years come, the old years go,
We know we dream, we dream we know.

We rise up laughing with the light,
We lie down weeping with the night.

We hug the world until it stings,
We curse it then and sigh for wings.

We live, we love, we woo, we wed,
We wreathe our brides, we sheet our dead.

We laugh, we weep, we hope, we fear,
And that's the burden of the year.

ہشام کا دل کہر زدہ تھا جیسے کسی سفید دھند میں جکڑ ا گیا ہو_

''فلسطین کے تمام طالب علم شہید ہو چکے ہیں اس لیے تعلیمی سال کا اختتام کیا جا تا ہے"_

یہ لکھتے ہوئے خطیب کتنا رویا ہوگا؟

کتنے اس کے دل کے ٹکڑے ہوئے ہوں گے؟

کیسی قیامت اس پر گزری ہوگی؟

اس کو اپنے بہن بھائی ماں باپ چچا دادا سب کس قدر یاد آئے ہوں گے؟

وہ کتنا اکیلا ہوگا؟

ہشام کو لگا وہ اس کے سینے سے لگ کے بہت زیادہ رونا چاہتا ہے۔اس نے اپنی نم آنکھ پونچھ کر دوسرا پیغام پڑھا تھا یہ پیغام ایک انجان نمبر سے تھا۔عربی کی ایک حکایت تھی_ جیسے ہزاروں لوگ نیو ائیر پے مختلف پیام بھیجتے ہیں یہ ایسا بالکل پیام نہیں تھا۔اس میں کچھ الگ تھا جس نے ہشام کا دل دبوچ لیا تھا۔یہ عربی کی حکایت ڈچ میں تھی

''ایک آدمی کئی راتیں سخت سردی میں آرام سے سوتا رہا۔ایک دن کسی راہگیر نے گزرتے ہوئے اسے کہا:"میں تمہیں ایک گرم رضائی لا کر دوں گا"!!

وہ راہگیر اپنی منزل کو چلا گیا اور رضائی لانے کا وعدہ بھول گیا، بوڑھا آدمی اس کا انتظار کرتے ہوئے سردی سے مر گیا۔لوگوں کو اس کی لاش کے پاس ایک مخطوط رقعہ ملا۔اس پر یہ الفاظ لکھے تھے:

"میں نے تمہارے آنے سے پہلے کئی راتیں سردی برداشت کی کیونکہ میرے پاس کوئی اور آسرا نہیں تھا مگر تمہاری بات نے مجھے ایک امید دلا کر اسے میرا آسرا بنا دیا اور میں نے تم پر امید لگا کر اپنی قوت کھو دی۔ چنانچہ... سردی نے مجھے مار ڈالا"۔

ہشام سن ہو گیا تھا۔یہ پیام کس نے بھیجا تھا؟اس کا دل کسی انجان وحشت کی آہٹ محسوس کر رہا تھا۔

اس نے اگلا میسج کھولا۔وہ بھی اسی نمبر سے آیا تھا

اوقات الگ الگ تھے

ہشام پڑھتا رہا

اس کی پلکیں جھپکتی رہیں

اور کوئی اس کے بہت قریب دوزانو بیٹھ گیا تھا_

اس سے نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہ گیا وہ اسکرین کو نہیں گویا لکھنے والے کے تاثرات کو دیکھ رہا تھا_

کسی نے بھی چلتی ہوا کو نہ دیکھا

نہ تو نے، نہ میں نے

مگر سرسراتے ہوئے پیڑ پر

لڑھکتی ہوئی ڈالیوں سے گزرتی

گھنی ٹہنیوں کو جھکاتے ہوئے

محبت بھرے گیت گاتے ہوئے

گنگناتے ہوئے یوں گزر جاتی ہے

کسی نے بھی چلتی ہوا کو نہ دیکھا

نہ تو نے، نہ میں نے

اس کے قریب بیٹھے وجود نے اسی نظم کو بہت ترنم میں انگریزی میں جب پڑھا تھا وہ نظر اٹھا کر دیکھنے پہ مجبور ہو گیا تھا_ وہ شافیہ تھی۔

؟Who has seen the wind

:nor youNeither I

But when the leaves hang trembling,

The wind is passing through.

Who has seen the wind?

Neither you nor I:

But when the trees bow down their heads,

The wind is passing by

اس نے اتنی میٹھی آواز بس ایک ہی سنی تھی ۔وہ جو جنت کے چشموں جیسی تھی یعنی سلسبیل_ اور اس کا دل جیسے بہہ گیا تھا۔ وہ ایک نرم دل نرم خوانسان تھا وہ کسی کو بھی روتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔اس کی نظر اسکرین سے ہٹ کر شافیہ کی طرف مائل تھی_ گو کہ ابو العلا العمری کے لفظ اس کو باندھ رہے تھے

أَغَلَّ نَوائِبَ الأَيامِ وحدي

إِذا اجْتَمَعَت كَتائِبُها احْتِشادا

كَأَنّي في لِسانِ الدَهرِ لَفظٌ

تَضَمَّنَ مِنهُ أَغراضاً بِعادا

"میں نے حوادثِ زمانہ کو تنہا گزار لیا۔جب مصیبتوں کے لشکر جمع ہوتے تو میری تنہائی ان کے سامنے ڈٹ جاتی"۔

میں تو اس ہستی کی زباں پر ایک لفظ تھا جس سے لوگ بعید غرضیں اور مطالب نکالتے رہے۔"

اسے لگا کہ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں سن سکتا تھا۔اس نے اپنی زندگی میں بوار یا میں دو فلاسفر چھوٹی لڑکیاں دیکھی تھیں اسے اندازہ نہیں تھا حسن اور زہانت کا کوئی ملک کوئی شہر نہیں ہوتا

'میں صرف یہ بتانے آئی ہوں اگر آپ کا ارادہ ہے میں یہاں تنہا رہ لوں تو آپ اپنا ارادہ بدل لیجیے_ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا_ اس کائنات میں جی جی کے سوا میرا کوئی نہیں تھا_ کچھ لوگ لاوارثوں کے وارث ہوتے ہیں_ جی جی ایسے لوگوں میں سے تھیں انہوں نے مجھے سرپرست دیا اور میں ان کی محبتوں کا یوم آخرت بھی احسان نہیں چکا سکتی۔

مجھ پر ایک احسان کر سکتے ہیں_ مجھے تنہا نہیں چھوڑیں_ اس زمین پر میرا کوئی بھی نہیں"_

اور یہ فیصلہ نیلے آسمان پر لکھا جا چکا تھا

"سلسبیل"

گہرے قبرستان سے ایک آواز آئی تھی۔ یہ آواز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی_ اس نے سر اٹھا کر سبزے سے بھرے میدان کو دیکھا اسے لگا ساری ہریالی جل گئی ہے۔

"تم کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ میں نے ایک جگہ بات کی ہے۔ امید نظر آتی ہے کہ کچھ ہو سکے۔

سلسبیل کا کلیجہ شق ہوا تھا اور وہ اس کا دل ڈوب گیا۔ اگر یہ امتحان تھا تو کس قدر بڑا تھا؟ اور اگر آزمائش تھی تو طویل تر تھی_ اس نے سوجھی آنکھوں کے پار دیکھا۔ اتنا دکھ تو اس گھر کے بالکل اچانک اجڑ جانے سے بھی نہیں ہوا تھا جتنا دکھ اس بربادی کا تھا جس نے زندگی کو زندگی سے دور کر دیا تھا_

"خطیب ہماری مدد کرے گا_ گو کہ وہ خود بھی ٹھیک نہیں ہے مگر وہ ہمارا ساتھ دے گا"_

ڈی سوزا اسے حوصلہ دے رہی تھی_ وہ حوصلہ جو کھو چکا تھا_ ابوالعلاء المعری فرماتے تھے

"گلاب کے خاموش پھول کی گہرائی میں

اک بے فکر بھنورے نے انگڑائی لی؛

اور اپنے ساتھ لیٹے ساتھی سے کہا:

یار! یہ دنیا کتنی حسین ہے!

دوسرا بھنورا بولا:

یہ نفرتوں سے بھرا زندان ہے؛

اور ہم سبھی اس میں محض درد سہتے قیدی

اگر تمہارے خیال میں یہ قید خانہ ہے پیارے!

تو مجھے بہت بھایا ہے

پہلا بھنورا انگڑائی لے کر بولنے لگا___ ؛

میں اب اس دنیا کی محبت میں

اک گیت سناتا ہوں

کہ اتنی دلربا دنیا اور اس کی خوشیاں مجھے ملیں
کسی سعی کے بنا؛
میرے دل کو
لطف اندوز کرنے والی دنیا!،
تیرا شکریہ!،
دوست!
تم میرے گیت سن کر
دنیا سے نفرت پر شرمسار ہو جاؤ گے
دوسرا بھنورا بولا:
میں بھی اس دنیا کے درد
لبوں میں اتار کر
اپنے گیتوں سے اہلِ دل کو رلاتا رہوں گا
(اور شاید تم بھی کبھی بدل جاؤ!)

☆......☆......☆

اور یوں/ وہ دونوں گاتے رہے ان کے گیت سن کر نہ ہوا رکی؛ نہ پھول بکھرے۔ان کا گلاب کا گھر پہلے سے زیادہ حسین ہو گیا۔اور ان کے گیت سن کر ہنستا رہا؛ جب وہ دونوں بھنورے بوڑھے اور دانا ہوئے تو خاموش ہو کر گلاب کی گہرائیوں میں گوشہ نشین ہو گئے ۔اور؛ گلاب کا پھول اس دوران خوبصورتی سے کھِلا رہا!

:"اور تم وہ ہی گلاب کا پھول ہو جو کھلا رہے گا"_ ڈی سوزا امید کے ساتھ مسکرائی تھی_
اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں_
اس کا دھیان کہیں اور تھا شاید بہت دور

"اور وہ نہیں آیا؟_"

وہ کھوکھلے لہجے میں بولی تھی

ہاں مگر اس کا پیام ضرور آیا تھا"_

اس نے اسکرین روشن کی تھی_

(اے میری بصارت سے محروم دو آنکھو!)؛

میرا عذر قبول کرنا کہ میں تمہاری چاہتیں پوری نہیں کر سکتا!!!

کہ تمہاری حسرتوں کے اجالے تو فنا ہو گئے ہیں مگر یہ اندھیرے فنا ہونے والے نہیں۔ اگر تم؛ لوگوں کی محبتیں بھول گئیں ہو تو مجھے اپنی یادِ رفتگاں میں ضرور شامل کرنا۔ کتنی دفعہ ہم نے زمانے کی مدح بیان کرنے کا ارادہ کیا مگر اہل زمان نے ہمیں اس کی مذمت میں ہی مشغول کیے رکھا۔ میں اس حال میں ان لفظوں کو بیان کر رہا ہوں کہ جب آسمان پر چاند اک کمسن بچے کی صورت نمودار ہے جب کہ اندھیری رات بھرپور جوبن میں ہے (پرانے دوستوں کو یاد کرتے کرتے) نیند میری پلکوں سے دور ہو گئی ہے جیسے بزدل کے دل سے عافیت دور بھاگتی ہیاس رات کے منظر کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا، کہ چاند ثریا ستارے سے عشق کر رہا ہے اور وہ دونوں وقتِ الوداع گلے لگ رہے ہیں: (حسرت کا اظہار ہے)

کتنی ہی راتیں، گرچہ وہ بہت گہری تاریک تھیں، مگر محبوب کی یاد کی ہم نشینی میں خوشنما صبح جیسی حسین بن گئیں۔ سہیل ستارے کا نور کسی محبوب کے گالوں جیسا ہے (جنہیں دیکھ کر) چاہنے والے کا دل بدحواس ہو کر ڈوب جاتا ہے

عَلّلانی فاِن بیض الأ مانی

فنیت والظلام لیس بفانی

اِن تناسیتُما ودادُ ناسٍ

فاجعلانی من بعض مَن تذ کران

کم اَردنا ذاکَ الزمان بمدحٍ
فشُغلنا بذمّ ہذا الزمان

فکأنّی ماقلتُ والبدر طفلٌ
وشباب الظّلماءِ فی عُنفوان

ہرب النوم عن جفونی فیہا
ہَرَبَ الأمن عن فؤادِ الجبانِ

وکأنّ الہلال یہوی الثریا
فہما للوداع مُعتنِقان

رُبّ لیلٍ کأنّہ الصّبحُ فی الحُسنِ
وإن کانَ أسودَ الطّیلَسانِ

وسُہیلٌ کوجنۃِ الحِبّ فی اللّونِ
وقلبِ المُحِبّ فی الخفقانِ

"اس پیام میں روشن دن جیسی تمازت ہے"_ وہ ہولے سے مسکرائی تھی کہ کجا اس کی مسکراہٹ سلسبیل کو زخمی نہ کر دے_
"میرے برباد شدہ دل کو کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی"_ وہ رونے لگی تھی۔ تمہارا دل برباد نہیں

ہے یہ آباد ہے وقتی آندھی نے اس کا سبزہ اکھاڑا ہے اس پر پھر فصل اگے گی ہریالی ہوگی تمہارے دل کی سرزمین زرخیز ہے"___ وہ اسے پیار کررہی تھی۔

"پھر بتاؤ وہ آتا کیوں نہیں؟_"

اس نے آنسو بھری آنکھوں کو جھکا کر پوچھا

"وہ ضرور آئے گا_یہ میرا یقین ہے"_

'میں خطیب سے ملتی ہوں اور ہم وقت طے کرتے ہیں"_ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر اوپر جارہی تھی وہ جو خطیب اور خداداد کا مسکن تھا وہ جگہ بھی اس گھر کی طرح بے آباد اور ویران لگ رہی تھی۔ڈی سوزا کے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے

یہ کیسا امتحان تھا؟

کہ دنیا میں جن دو لوگوں سے اسے محبت تھی وہ دونوں ہی ناقابل تلافی نقصان کی زد میں جکڑے اپنی اپنی زندگی سے ہی بیزار اور مایوس تھے

ہاؤس فراؤ کا سارا مکان اجڑی بیوہ جیسا تاثر چھوڑ رہا تھا۔نیم اندھیرا اور بس سسکیاں_ جو لوگ اپنا سب کچھ کھو دیتے ہیں وہ خطیب اور ڈی سوزا کی طرح ہی ہو جاتے ہیں۔مُردہ کُتیا کے پار رچے یہ راجستھانی ادب سے رات کو وہ پڑھ رہی تھی

جے پور" کے کوڑے کی سانسیں

"رگھو"، کی نسوں میں گھل چکی تھیں

پچھلے ستر جاڑے۔۔۔۔۔اس نے، اسی کوڑے اور کباڑ کو ٹٹولتے ہوئے گزارے تھے۔بھوک دنیا میں ہر جگہ بھیانک ہوتی ہے

لیکن ایک گمنام صحرا میں سب سے بھیانک ؛ ہو جاتی ہے، ایک سنسان گلی میں، جھٹپٹا جب چھا رہا تھا، اس کا ہر عضو تین دن کی بھوک سے تحلیل ہو رہا تھا وہ ریت نہیں کھا سکتا تھا کہ ریت تو اس کے وجود کا ماخذ ٹھیری ریت ہی تو اس کا وجود بن چکی تھی یا پھر۔۔۔

شاید وہ مٹی کھا لیتا لیکن راجھستان میں ہر جگہ مٹی بھی نہیں بھیک کی فریاد سننے کے لیے بھی نہیں،،،،،اس کے لیے بھی ریگ اور جھاڑ ہیں۔۔۔بس! دو ہاتھ کی اوٹ میں، ایک برقی تنصیب کے پاس، وہ جیسے گر گیا ہو۔۔۔

پھر اوٹ سے گزر کر اس کے سامنے ایک مردہ چوپایہ لیٹا تھا۔۔۔، اس کے جبڑے اور پچھگل کر سخت ہو چکے تھے، کریہہ سرخی،

اس کے گوشت میں رچی بسی تھی دھڑ جیسے کسی درندے نے پھاڑا ہو

وہ دو پارچے تھے،

اوپر___ تلے: دو پارچے۔۔۔،

وہ آگے بڑھ گیا، اس کے ذہن میں کوئی سوچ نہ تھی ایک پردیسی کی طرح جس کا سامان لٹا جا رہا ہو اور وہ آگے بڑھے، اسے بچانے کی خاطر اسی مانند اس کے ذہن میں کوئی سوچ نہ تھی وہ خالی تھا،،،، پورا وجود اس کا پیٹ بن گیا تھا

وہ بالکل کورا ہوتا گیا اس نے ایک جھٹکے سے دونوں پارچے الگ کیے اور خود کو اپنی پناہ گاہ کی جانب گھسیٹنے لگا

وہ گوشت لے کہ جا رہا تھا،،،، تین دن کی بھوک کے بعد ایک پلا اس کے ٹخنوں سے لٹک رہا تھا انجانے میں اسے ہوش نہ رہا،،، وہ انہیں مردہ پارچوں کے پاس کہیں ماتم زدہ براجمان تھا۔۔۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔۔۔

اس کا وجود خالی تھا۔۔۔اس کا دماغ اور سانسیں۔۔۔سب خالی پلے نے اس کی لنگی پر پنجہ اڑایا اس نے اسے ترستا دیکھ کر اٹھا لیا

اس کی آنکھوں میں عجیب درماندگی تھی۔ رگو نے کبھی اپنی آنکھیں نہ دیکھی تھیں

لیکن شاید وہ دیکھتا کہ اس کی آنکھوں میں اس پلے کی آنکھوں۔۔۔سے تشابہ۔۔۔ ایک پکار ہے۔ جسے کوئی نہیں سنتا

لیکن پلے کی آہ وہ سن سکتا تھا، اس کی کوئی کان نہ سن سکتا تھا اس نے۔۔۔ پلے کو گود میں رکھ کر ایک نگاہ دیکھا اور پھر نیچے اتار دیا

ایک بچے کے سامنے اس کی ماں کو کوئی کھانے کیے لیے جلا دیا ور پھر اسی کی ہڈیاں اس بچے کو چبانے کو دے،،،، اس سے بھی بہت کچھ بھیانک وہ کر سکتا تھا لیکن اس رات اس نے نہ کیا اپنی ہوا اور ریت سے بھری بوری جو کبھی کباڑ میں رضائی بن کر ملی تھی اسے۔۔۔ اس نے جاڑے کی ہڈیاں چیخ شدت میں پلے کو لپیٹ کر کونے میں دبا دیا۔۔۔

زندگی میں سب کچھ روٹی نہیں ہے!

لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تو تھی"۔۔۔

جاڑے میں رات کو خالی زمین پر روئی سے کہیں آ گے۔۔۔

ایک لحاف ہے،،، جتنا بھی پرانا ہو،،،، جتنا بھی گھٹیا۔۔۔ اس کا دماغ اب بھی خالی تھا۔۔۔

رات وہ "الومینیم" کے ڈبے میں کوڑا اجلا کر سینک لیتا رہا۔۔۔ وہ تین دن سے بھوکا تھا اور پلا بھی شاید۔

صبح پو پھٹنے پر اس کا چہرہ پتھرا چکا تھا وہ آج رات سویا نہیں تھا۔۔۔ لیکن پچھلی دو راتوں میں خوابیدہ رہا تھا پلا سو رہا تھا۔۔۔ جاڑے میں سب سے بھیانک بھوک نہیں،،،، آگ برساتے آسمان میں جیسے پانی ہو۔۔۔ نہیں!

سب سے بھیانک ہے خالی زمین پر رات کو رضائی نہ ہونا سورج نے موسم میں ایک گرم لہر پھیلا دی

رگو سو رہا تھا۔۔۔ اور۔۔۔ پلا اس کے تلوے چاٹ رہا تھا۔

پاکستان میں رشتوں کو اتنا ہی مفاد پرست دیکھا تھا جتنا جرمنی میں اس کی ماں سمیت بہت سارے لوگ تھے۔ ان میں مخلص بہت کم تھے بہت ہی کم_ ہر ایک مفاد سے جڑا تھا ہر ایک کی دوسرے کے ساتھ ضرورت وابستہ تھی_ وہ جلدی ہی یہاں کے ماحول سے گھبرا گیا تھا

اسے اردگرد لوگوں نے بھی بتایا تھا کہ یہ جگہ یہ ملک اس کے رہنے کے قابل نہیں ہے_ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا_ مگر اس سے پہلے شافیہ کی کچھ ضروری ڈاکمینٹیشن روانا تھی وہ شافیہ کو ساتھ لے کر جا رہا تھا_

یہ فیصلہ ہو چکا تھا_
خداداد اور خطیب کو ہشام کی طرف سے میسج وصول ہو گیا تھا
یعنی وہ واپس آ رہا تھا ڈی سوزا نے سوچا کہ یہ خوشخبری وہ سب سے پہلے سلسبیل کو دے گی مگر
سلسبیل یہ خبر سن کر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی تھی جیسے سن ہوتے ہیں
: جیسے بالکل جذبات سے خالی اور کھوکھلے_ جیسے کوئی مجسمہ جس پر کوئی چیز اثر نہ کرتی ہو۔ڈی
سوزا کا دل بھر آیا تھا
خلیل جبران کہتے ہیں

Do not love half lovers

ادھوری محبت کرنے والوں سے کبھی دل نہ لگاؤ
کچے پکے دوستوں کی خدمت نہ کرو
ایسے لوگوں کے کام میں شریک نہ ہو جو اپنے کام کے ماہر نہیں
آدھی زندگی مت جیو
اور آدھی موت بھی نہ مرو
اگر تم خاموشی چنتے ہو تو مکمل خاموشی اختیار کرو
جب تم بولنے لگو تو تب تک بولو جب تک تمہاری بات مکمل نہ ہو جائے
کوئی بات کہنے کے لیے، خود کو کبھی خاموش مت کرو
اگر تم کچھ قبول کرتے ہو تو کھل کر اس کا اظہار کرو
اس پر نقاب نہ چڑھاؤ
اگر تم انکار کرنا چاہتے ہو تو واضح طور پر کرو
کیوں کہ مبہم انکار کا مطلب، کمزور اقرار ہوتا ہے
کبھی آدھا حل قبول نہ کرو
آدھے سچ پر یقین نہ کرو

کبھی ادھورا خواب نہ دیکھو

ادھوری امیدوں کے بارے میں سنہرے خواب نہ دیکھو

ادھورا مشروب تمہاری پیاس نہیں بجھائے گا

آدھا ادھورا کھانا تمہاری بھوک مٹانے سے قاصر ہوگا

آدھا راستہ طے کرنے سے تم کہیں نہیں پہنچو گے

ادھورا خیال تمہارے لیے کوئی نتائج نہیں لا سکے گا

تم ایک مکمل انسان کی شناخت رکھتے ہو

بجائے اس کے کہ تم ادھوری زندگی جیو"_

اس نے بھیگی آواز میں کہا تھا جیسے اسے تحریک دلا رہی ہو

اسے زندہ رکھنے کے لیے لفظوں کی آکسیجن مہیا کر رہی ہو وہ ایک اچھی غم گسار تھی درد دل رکھتی تھی۔

وہ رہنے کے لیے ہمیں اپنے سے زیادہ غم زدہ لوگوں کو دیکھ کر صبر کرنا چاہیے"

ڈی سوزا کہہ رہی تھی

"صبر کرنا اور صبر سے جھیلنا بہت فرق ہے نا"_

سلی کی آواز نم تھی

"زندگی کو آگے لے کر جانا ہوگا_ کیا تم نے فلسطین میں بے گور و کفن کٹی پھٹی لاشوں والے بچے نہیں دیکھے؟ بھوک پیاس خوف اور بے گھر_ وہ اللہ کے بھروسے پر ہیں نا جو زندہ رہ گے؟ تو ہم صبر کیوں نہیں کرتے؟ ایک دوسرے کو دیکھ کر"_

میٹھے بول کبھی کبھی سہارا بن جاتے ہیں اور کبھی کبھی سکون کی علامت بھی_

رات کو کھڑکی کے اس پار وہ اپنی گزشتہ کے پل گن رہی تھی۔ وقت جیسے بھاگ رہا تھا بہت تیزی کے ساتھ

المرء یبذل العمر نفسہ

فإذا اللیل بالمساء یشع

انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنی عمر گنواتا رہتا ہے (اور اسے کوئی تعجب نہیں ہوتا) مگر جو کبھی شام ڈھلے رات چھا جائے تو حیران ہونے لگتا ہے"۔

شاید ایسا ہی تھا

احساس کتنا حسین تعلق تھا؟

اس نے اپنے دل میں ایک ہلکی سی رمق محسوس کی تھی_ جیسے زندگی کی لہر دوڑی ہو_ کچھ لوگ اسے دھرم کہتے ہیں کچھ ایمان سے مستعار لیتے ہیں کچھ احساس کا ثبوت مانگتے ہیں میں اسے دل کی تنہا دھک دھک کا نام دیتی ہوں، جو سب بتاتی ہے۔۔

"Feelings"

Some call it religion

Few tag it as faith

Other half ask for evidence

name it a silent beat of heart

Which ...

سمیع القاسم کا قصیدہ "مامن الہ سواک" روشن دن کی طرح زندہ حقیقت بن کر ہر سو ایک ردہم میں گایا جارہا تھا

یہ چراگاہیں مسموم گھاس اور سبزے سے بیزار ہیں

میری بھیڑیں یہاں، میری باہوں کے حلقے میں مردار ہیں

میرے میٹھے کنوئیں میں وہ سب مل کے پتھر گراتے رہے

میری انجیر برباد کی

اور زیتوں جلاتے رہے

میرے خرما کے باغوں پہ

یلغار کی

اور شاخوں کو توڑا
میری داکھوں میں جتنا بھی خوش رنگ شیرہ تھا
لے کر نچوڑا
میرے لیموں کے پیڑوں پہ۔ بمباری کی
اور پودینے کو دی سوکھنے کی سزا
میرے مولائے کل، سب کے حاجت روا
کیسے ظاہر کروں اپنا کرب و بلا؟
اور سناؤں کسے وحشتوں کی کتھا؟
میرا کوئی نہیں ہے تمہارے سوا
دیکھتا ہوں تجھے کس قدر دھیان سے
دیکھتا ہوں تجھے پورے جی جان سے
تو بھی میری طرف دیکھتا ہے مگر
ایک الگ طرز سے
ایک الگ شان سے
تو کہ مولائے کُل، رب ارض و سما
حبس اور قید کے جبر سے ماورا
میں گرفتار، محبوس وحشت سرا
میں اسیر قفس، بے کس و مبتلا۔

ناول سلسبیل کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 12 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر15

سوا اس ایک کوٹھی کے باقی سب کچھ جی جی کی بھتیجیوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔بس یہی وجہ تھی کہ شافیہ کے نکاح پر زیادہ واویلا نہیں کیا گیا تھا۔

اسود اور اس کی ماں سمیت سب نے کروڑوں روپے سمیٹے اور شافیہ پے فاتحہ پڑھ دی_ سمیرا کی بیٹھے بیٹھائے شافیہ سے جان چھوٹ گئی تھی

اب وہ سکون کے ساتھ عرشیہ اور اسود کی شادی کر سکتی تھی_ سب کچھ حسب منشا ہو گیا تھا اور ہشام کو ہاتھ سے نکالنے کا دکھ بھی نہیں رہا تھا_

ہشام واپسی کی تیاریاں کر رہا تھا_

ظاہر ہے وہ جس کے لیے آیا تھا وہ وجود ہی نہیں رہا تھا اسے اس دیس میں کون سی کشش کھینچ سکتی تھی؟

جب وہ آخری بار خداداد کے گھر آیا اور اس کے بھائی شایان سے بات چیت کر رہا تھا تب وہ پریشان تھا

شان نے فکرمندی سے پوچھا

"ہشام بھائی! آپ کیوں پریشان نظر آ رہے ہیں؟"_

"ہاں میں پریشان ہوں کیونکہ میں شافیہ کو فی الحال ساتھ نہیں لے جا سکتا"_

اس نے اپنی فکرمندی کی وجہ بتائی تھی

"اور یہ بھی کہ اسے کن لوگوں میں چھوڑوں؟ ایسے لوگ جو گدھ سے بھی بدتر ہیں لالچی اور مطلبی"

شان اس کی بات سمجھ رہا تھا

"مگر میری ماں کی وصیت ہے میں شافیہ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا؟_"

شان سمجھ سکتا تھا اس لیے تسلی دیتا بولا

"ہمارے ہوتے ہوئے آپ فکر مند نہ ہوں بھائی! شافیہ آپ کے حوالے سے اور بھی محترم ہے، بہن تو تھی ہی اب بھابھی بھی ہے۔"

ہشام کے لیے یہ نئی رشتے داری اجنبی تو تھی مگر وہ رشتے سنبھال کر چلنے والا انسان تھا۔ کتنے ہی دن سے اس کا موبائل بند تھا آج اس نے موبائل کھولا تو بہت سارے پیام موجود تھے۔ رات کو جب اسے خطیب کی طرف سے بہت دنوں بعد نیو ائیر کا میسج آیا تو اس کے اندر سلسبیل ایک حقیقت بن کر جاگی تھی۔ وہ اس کا نیو ائیر میسج پڑھ رہا تھا

شاعرہ ایلا ویلر ول کاکس کی نظم تھی ہشام سن سا اسکرین کو دیکھ رہا تھا

"نئے سال کی نظموں میں کیا بیاں ہو سکتا ہے؟

جو ہزاروں بار نہ کہا گیا ہو؟

سال نو آتا ہے، پرانا سال جاتا ہے،

ہمیں معلوم ہے ہم خواب دیکھتے ہیں، ہم خواب دیکھتے ہیں ہمیں معلوم ہے یہ۔

ہم روشنی کے ہمراہ ہنستے ہوئے اٹھتے ہیں،

شب کے ہمراہ روتے ہوئے لیٹ جاتے ہیں۔

ہم دنیا کو گلے لگاتے ہیں جب تک یہ ہمیں ڈس نہ لے،

تب ہم ملامت کرتے ہیں اور قوتِ پرواز کے لیے آہیں بھرتے ہیں۔

ہم جیتے ہیں، ہم پیار جتاتے، وعدے کرتے اور شادی رچاتے ہیں،

ہم اپنی دلہنوں کو ہار پہناتے اور مردوں کو کفناتے ہیں۔

ہم ہنستے ہیں، روتے ہیں، امید لگاتے اور ڈرتے ہیں،

اور یہی سال بھر کے بوجھ ہیں۔

اس نے زیرلب شاعرہ کا نام دوہرایا

"The Year

By Ella Wheeler Wilcox "

اب وہ انگریزی میں پڑھ رہا تھا اور اس کی آنکھ نم ہو رہی تھی

What can be said in New Year rhymes,
That's not been said a thousand times?

The new years come, the old years go,
We know we dream, we dream we know.

We rise up laughing with the light,
We lie down weeping with the night.

We hug the world until it stings,
We curse it then and sigh for wings.

We live, we love, we woo, we wed,
We wreathe our brides, we sheet our dead.

We laugh, we weep, we hope, we fear,
And that's the burden of the year.

ہشام کا دل کہر زدہ تھا جیسے کسی سفید دھند میں جکڑا گیا ہو_

"فلسطین کے تمام طالب علم شہید ہو چکے ہیں اس لیے تعلیمی سال کا اختتام کیا جاتا ہے"_

یہ لکھتے ہوئے خطیب کتنا رویا ہو گا؟

کتنے اس کے دل کے ٹکڑے ہوئے ہوں گے؟

کیسی قیامت اس پر گزری ہوگی؟

اس کو اپنے بہن بھائی ماں باپ چچا دادا سب کس قدر یاد آئے ہوں گے؟

وہ کتنا اکیلا ہوگا؟

ہشام کو لگا وہ اس کے سینے سے لگ کے بہت زیادہ رونا چاہتا ہے۔اس نے اپنی نم آنکھ پونچھ کر دوسرا پیغام پڑھا تھا یہ پیغام ایک انجان نمبر سے تھا۔عربی کی ایک حکایت تھی_ جیسے ہزاروں لوگ نیو ائیر پہ مختلف پیام بھیجتے ہیں یہ ایسا بالکل پیام نہیں تھا۔اس میں کچھ الگ تھا جس نے ہشام کا دل دبوچ لیا تھا۔یہ عربی کی حکایت ڈچ میں تھی

"ایک آدمی کئی راتیں سخت سردی میں آرام سے سوتا رہا۔ایک دن کسی راہگیر نے گزرتے ہوئے اسے کہا: "میں تمہیں ایک گرم رضائی لا کر دوں گا"!!

وہ راہگیر اپنی منزل کو چلا گیا اور رضائی لانے کا وعدہ بھول گیا، بوڑھا آدمی اس کا انتظار کرتے ہوئے سردی سے مر گیا۔لوگوں کو اس کی لاش کے پاس ایک مخطوط رقعہ ملا۔اس پر یہ الفاظ لکھے تھے:

"میں نے تمہارے آنے سے پہلے کئی راتیں سردی برداشت کی کیونکہ میرے پاس کوئی اور آسرا نہیں تھا مگر تمہاری بات نے مجھے ایک امید دلا کر اسے میرا آسرا بنا دیا اور میں نے تم پر امید لگا کر اپنی قوت کھو دی۔چنانچہ... سردی نے مجھے مار ڈالا"۔

ہشام سن ہو گیا تھا۔یہ پیام کس نے بھیجا تھا؟اس کا دل کسی انجان وحشت کی آہٹ محسوس کر رہا تھا۔

اس نے اگلا میسیج کھولا۔وہ بھی اسی نمبر سے آیا تھا

اوقات الگ الگ تھے

ہشام پڑھتا رہا

اس کی پلکیں جھپکتی رہیں

اور کوئی اس کے بہت قریب دوزانو بیٹھ گیا تھا_

اس سے نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہ گیا وہ اسکرین کو نہیں گویا لکھنے والے کے تاثرات کو دیکھ رہا تھا_

کسی نے بھی چلتی ہوا کو نہ دیکھا

نہ تو نے، نہ میں نے

مگر سرسراتے ہوئے پیڑ پر

لڑھکتی ہوئی ڈالیوں سے گزرتی

گھنی ٹہنیوں کو جھکاتے ہوئے

محبت بھرے گیت گاتے ہوئے

گنگناتے ہوئے یوں گزر جاتی ہے

کسی نے بھی چلتی ہوا کو نہ دیکھا

نہ تو نے، نہ میں نے

اس کے قریب بیٹھے وجود نے اسی نظم کو بہت ترنم میں انگریزی میں جب پڑھا تھا وہ نظر اٹھا کر دیکھنے پہ مجبور ہو گیا تھا_ وہ شافیہ تھی۔

؟Who has seen the wind

:nor youNeither I

But when the leaves hang trembling,

The wind is passing through.

Who has seen the wind?

:Neither you nor I

But when the trees bow down their heads,

The wind is passing by

اس نے اتنی میٹھی آواز بس ایک ہی سنی تھی۔ وہ جو جنت کے چشموں جیسی تھی یعنی سلسبیل_ اور اس کا دل جیسے بہہ گیا تھا۔ وہ ایک نرم دل نرم خو انسان تھا وہ کسی کو بھی روتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی نظر اسکرین سے ہٹ کر شافیہ کی طرف مائل تھی_ گو کہ ابو العلا العمری کے لفظ اس کو باندھ رہے تھے

أَقَلُّ نَوَائِبَ الأَيامِ وحْدی

إِذَا اجْتَمَعَتْ كَتَائِبُهَا احْتِشَادا

كَأَنِّي فِي لِسانِ الدَّهْرِ لَفْظٌ

تَضَمَّنَ منه أَغْرَاضًا بِعَادا

"میں نے حوادثِ زمانہ کو تنہا گزار لیا۔ جب مصیبتوں کے لشکر جمع ہوتے تو میری تنہائی ان کے سامنے ڈٹ جاتی"۔

میں تو اس ہستی کی زباں پر ایک لفظ تھا جس سے لوگ بعید غرضیں اور مطالب نکالتے رہے"۔ اسے لگا کہ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں سن سکتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں بوار یا میں دو فلاسفر چھوٹی لڑکیاں دیکھی تھیں اسے اندازہ نہیں تھا حسن اور ذہانت کا کوئی ملک کوئی شہر نہیں ہوتا

'میں صرف یہ بتانے آئی ہوں اگر آپ کا ارادہ ہے میں یہاں تنہا رہ لوں تو آپ اپنا ارادہ بدل لیجیے_ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا_ اس کائنات میں جی جی کے سوا میرا کوئی نہیں تھا_ کچھ لوگ لاوارثوں کے وارث ہوتے ہیں_ جی جی ایسے لوگوں میں سے تھیں انہوں نے مجھے سرپرست دیا اور میں ان کی محبتوں کا یوم آخرت بھی احسان نہیں چکا سکتی۔

مجھ پر ایک احسان کر سکتے ہیں_ مجھے تنہا نہیں چھوڑیں_ اس زمین پر میرا کوئی بھی نہیں"_

اور یہ فیصلہ نیلے آسمان پر لکھا جا چکا تھا

"سلسبیل"

گھرے قبرستان سے ایک آواز آئی تھی۔یہ آواز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی_ اس نے سر اٹھا کر سبزے سے بھرے میدان کو دیکھا اسے لگا ساری ہریالی جل گئی ہے۔

"تم کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔میں نے ایک جگہ بات کی ہے۔امید نظر آتی ہے کہ کچھ ہو سکے۔'

سلسبیل کا کلیجہ شق ہوا تھا اور وہ اس کا دل ڈوب گیا۔اگر یہ امتحان تھا تو کس قدر بڑا تھا؟ اور اگر آزمائش تھی تو طویل تر تھی_ اس نے سوجھی آنکھوں کے پار دیکھا۔اتنا دکھ تو اس گھر کے بالکل اچانک اجڑ جانے سے بھی نہیں ہوا تھا جتنا دکھ اس بربادی کا تھا جس نے زندگی کو زندگی سے دور کر دیا تھا_

"خطیب ہماری مدد کرے گا_ گو کہ وہ خود بھی ٹھیک نہیں ہے مگر وہ ہمارا ساتھ دے گا"_

ڈی سوزا اسے حوصلہ دے رہی تھی_ وہ حوصلہ جو کھو چکا تھا_ ابو العلاء المعری فرماتے تھے

"گلاب کے خاموش پھول کی گہرائی میں
اک بے فکر بھنورے نے انگڑائی لی؛
اور اپنے ساتھ لیٹے ساتھی سے کہا:
یار! یہ دنیا کتنی حسین ہے!
دوسرا بھنورا بولا:
یہ نفرتوں سے بھرا زندان ہے؛
اور ہم بھی اس میں محض درد سہتے قیدی
اگر تمہارے خیال میں یہ قید خانہ ہے پیارے!
تو مجھے بہت بھایا ہے
پہلا بھنورا انگڑائی لے کر بولنے لگا___ ؛
میں اب اس دنیا کی محبت میں
اک گیت سناتا ہوں
کہ اتنی دلربا دنیا اور اس کی خوشیاں مجھے ملیں

کسی سعی کے بنا؛

میرے دل کو

لطف اندوز کرنے والی دنیا!،

تیرا شکریہ!،

دوست!

تم میرے گیت سن کر

دنیا سے نفرت پر شرمسار ہو جاؤ گے

دوسرا بھنورا بولا:

میں بھی اس دنیا کے درد

لبوں میں اتار کر

اپنے گیتوں سے اہلِ دل کو رلاتا رہوں گا

(اور شاید تم بھی کبھی بدل جاؤ!)

☆......☆......☆

اور یوں/ وہ دونوں گاتے رہے ان کے گیت سن کر نہ ہوا رکی؛ نہ پھول بکھرے۔ان کا گلاب کا گھر پہلے سے زیادہ حسین ہو گیا۔اور ان کے گیت سن کر ہنستا رہا؛ جب وہ دونوں بھنورے بوڑھے اور دانا ہوئے تو خاموش ہو کر گلاب کی گہرائیوں میں گوشہ نشین ہو گئے۔اور؛ گلاب کا پھول اس دوران خوبصورتی سے کھلا رہا!

:"اور تم وہ ہی گلاب کا پھول ہو جو کھلا رہے گا"_ ڈی سوزا امید کے ساتھ مسکرائی تھی_

اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں_

اس کا دھیان کہیں اور تھا شاید بہت دور

"اور وہ نہیں آیا؟_"

وہ کھو کھلے لہجے میں بولی تھی

ہاں مگر اس کا پیام ضرور آیا تھا"_

اس نے اسکرین روشن کی تھی_

(اے میری بصارت سے محروم دو آنکھو!)؛

میرا عذر قبول کرنا کہ میں تمہاری چاہتیں پوری نہیں کر سکتا!!!

کہ تمہاری حسرتوں کے اجالے تو فنا ہو گئے ہیں مگر یہ اندھیرے فنا ہونے والے نہیں۔ اگر تم؛ لوگوں کی محبتیں بھول گئیں ہو تو مجھے اپنی یادِ رفتگاں میں ضرور شامل کرنا۔ کتنی دفعہ ہم نے زمانے کی مدح بیان کرنے کا ارادہ کیا مگر اہل زمان نے ہمیں اس کی مذمت میں ہی مشغول کیے رکھا۔ میں اس حال میں ان لفظوں کو بیان کر رہا ہوں کہ جب آسمان پر چاند اک کمسن بچے کی صورت نمودار ہے جب کہ اندھیری رات بھرپور جوبن میں ہے (پرانے دوستوں کو یاد کرتے کرتے) نیند میری پلکوں سے دور ہو گئی ہے جیسے بزدل کے دل سے عافیت دور بھاگتی ہیاس رات کے منظر کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا، کہ چاند ثریا ستارے سے عشق کر رہا ہے اور وہ دونوں وقتِ الوداع گلے لگ رہے ہیں: (حسرت کا اظہار ہے)

کتنی ہی راتیں، گر چہ وہ بہت گہری تاریک تھیں، مگر محبوب کی یاد کی ہم نشینی میں خوشنما صبح جیسی حسین بن گئیں۔ سہیل ستارے کا نور کسی محبوب کے گالوں جیسا ہے (جنہیں دیکھ کر) چاہنے والے کا دل بدحواس ہو کر ڈوب جاتا ہے

عَلّلانی فِان بیِض الأ مانی

فنَیث والظلام لیس بفانی

اِن تناسَیتُماو دادا ُناسِ

فاجعلانی من بعض مَن تذ کُران

کم اَردنا ذاک الزمان بمدحٍ

فشُغلنا بذمّ ہذا الزمان

فکأنی ماقلت والبدر طفلٌ
وشباب الظَّلماء فی عُنفوان

ہرب النوم عن جفونی فیھا
ہرَب الأ من عن فؤ ادِ الجبَانِ

وکأنّ الہلال یہوی الثریا
فہما للوداع مُعتنِقان

رُبّ لیلٍ کأنہ الصّبح فی الحُسنِ
وإن کانَ أسودَ الطّیلسانِ

وسُہَیلٌ کوَجنۃِ الحِبِّ فی اللّونِ
وقلبِ المُحِبِّ فی الخفقانِ

"اس پیام میں روشن دن جیسی تمازت ہے"_ وہ ہولے سے مسکرائی تھی کہ کہیں اس کی مسکراہٹ سلسبیل کو زخمی نہ کردے_

"میرے برباد شدہ دل کو کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی"_ وہ رونے لگی تھی۔ تمہارا دل برباد نہیں ہے یہ آباد ہے وقتی آندھی نے اس کا سبزہ اکھاڑا ہے اس پر پھر فصل اگے گی ہریالی ہوگی تمہارے دل کی سرزمین زرخیز ہے"__ وہ اسے پیار کر رہی تھی۔

"پھر بتاؤ وہ آتا کیوں نہیں؟_"

اس نے آنسو بھری آنکھوں کو جھکا کر پوچھا

"وہ ضرور آئے گا_ یہ میرا یقین ہے"_

'میں خطیب سے ملتی ہوں اور ہم وقت طے کرتے ہیں"_ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر اوپر جا رہی تھی وہ جو خطیب اور خداداد کا مسکن تھا وہ جگہ بھی اس گھر کی طرح بے آباد اور ویران لگ رہی تھی۔ ڈی سوزا کے قدم من من بھر کے ہو گے تھے

یہ کیسا امتحان تھا؟

کہ دنیا میں جن دو لوگوں سے اسے محبت تھی وہ دونوں ہی ناقابل تلافی نقصان کی زد میں جکڑے اپنی اپنی زندگی سے ہی بیزار اور مایوس تھے

ہاؤس فراد کا سارا مکان اجڑی بیوہ جیسا تاثر چھوڑ رہا تھا۔ نیم اندھیرا اور بس سسکیاں_ جو لوگ اپنا سب کچھ کھو دیتے ہیں وہ خطیب اور ڈی سوزا کی طرح ہی ہو جاتے ہیں۔ مُردہ کُتیا کے پار چے یہ راجستھانی ادب سے رات کو وہ پڑھ رہی تھی

جے پور" کے کوڑے کی سانسیں

"رَگُود"، کی نسوں میں گھل چکی تھیں

پچھلے ستر جاڑے۔۔۔ اس نے، اسی کوڑے اور کباڑ کو ٹٹولتے ہوئے گزارے تھے۔ بھوک دنیا میں ہر جگہ بھیانک ہوتی ہے

لیکن ایک گمنام صحرا میں سب سے بھیانک؛ ہو جاتی ہے، ایک سنسان گلی میں، جھٹپٹا جب چھا رہا تھا، اس کا ہر عضو تین دن کی بھوک سے تحلیل ہو رہا تھا وہ ریت نہیں کھا سکتا تھا کہ ریت تو اس کے وجود کا ماخذ ٹھیری ریت ہی تو اس کا وجود بن چکی تھی یا پھر۔۔۔

شاید وہ مٹی کھا لیتا لیکن راجھستان میں ہر جگہ مٹی بھی نہیں بھیک کی فریاد سننے کے لیے بھی نہیں، اس کے لیے بھی ریگ اور جھاڑ ہیں۔۔۔ بس! دو ہاتھ کی اوٹ میں، ایک برقی تنصیب کے پاس، وہ جیسے گر گیا ہو۔۔۔

پھر اوٹ سے گزر کر اس کے سامنے ایک مردہ چوپایہ لیٹا تھا۔۔۔، اس کے جبڑے اور پیٹ گل کر سخت ہو چکے تھے، کریہہ سرخی،

اس کے گوشت میں رچی بسی تھی دھڑ جیسے کسی درندے نے پھاڑا ہو

وہ دو پارچے تھے،

اوپر۔۔۔تلے؛ دو پارچے۔۔۔،

وہ آگے بڑھ گیا، اس کے ذہن میں کوئی سوچ نہ تھی ایک پردیسی کی طرح جس کا سامان لٹا جا رہا ہو اور وہ آگے بڑھے، اسے بچانے کی خاطر

اسی مانند اس کے ذہن میں کوئی سوچ نہ تھی وہ خالی تھا،،،، پورا وجود اس کا پیٹ بن گیا تھا

وہ بالکل کورا ہوتا گیا اس نے ایک جھٹکے سے دونوں پارچے الگ کیے اور خود کو اپنی پناہ گاہ کی جانب گھسیٹنے لگا

وہ گوشت لے کہ جا رہا تھا،،،، تین دن کی بھوک کے بعد۔۔۔'ایک پلا' اس کے ٹخنوں سے لٹک رہا تھا

انجانے میں اسے ہوش نہ رہا،،، وہ انہیں مردہ پارچوں کے پاس کہیں ماتم زدہ براجمان تھا۔۔۔وہ آگے بڑھتا گیا۔۔۔

اس کا وجود خالی تھا۔۔۔اس کا دماغ اور سانسیں۔۔۔سب خالیپلے نے اس کی لنگی پر پنجہ اڑایا اس نے اسے ترستا دیکھ کر اٹھا لیا

اس کی آنکھوں میں عجیب درماندگی تھی۔ رگو نے کبھی اپنی آنکھیں نہ دیکھی تھیں

لیکن شاید وہ دیکھتا کہ اس کی آنکھوں میں اس پلے کی آنکھوں۔۔۔سے تشابہ۔۔۔ایک پکار ہے۔ جسے کوئی نہیں سنتا

لیکن پلے کی آہ وہ سن سکتا تھا، اس کی کوئی کان نہ سن سکتا تھا اس نے۔۔۔پلے کو گود میں رکھ کر ایک نگاہ دیکھا اور پھر نیچے اتار دیا

ایک بچے کے سامنے اس کی ماں کو کوئی کھانے کیے لیے جلا دیا ور پھر اسی کی ہڈیاں اس بچے کو چبانے کو دے،،،،اس سے بھی بہت کچھ بھیانک وہ کرسکتا تھا لیکن اس رات اس نے نہ کیا اپنی ہوا اور ریت سے بھری بوری جو کبھی کباڑ میں رضائی بن کر ملی تھی اسے۔۔۔اس نے جاڑے کی ہڈیاں چیخ شدت میں پلے کو لپیٹ کر کونے میں دبا دیا۔۔۔

زندگی میں سب کچھ روٹی نہیں ہے!

لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تو تھی"۔۔۔

جاڑے میں رات کو خالی زمین پر روٹی سے کہیں آگے۔۔۔

ایک لحاف ہے۔۔۔جتنا بھی پرانا ہو۔۔۔جتنا بھی گھٹیا۔۔۔اس کا دماغ اب بھی خالی تھا۔ رات وہ " الومنیم " کے ڈبے میں کوڑا جلا کر سینک لیتا رہا۔۔۔وہ تین دن سے بھوکا تھا اور پلا بھی شاید۔۔۔

صبح پو پھٹنے پر اس کا چہرہ پتھرا چکا تھا وہ آج رات سویا نہیں تھا۔۔۔لیکن پچھلی دو راتوں میں خوابیدہ رہا تھا پلا سو رہا تھا۔۔۔جاڑے میں سب سے بھیانک بھوک نہیں،،،،آگ برساتے آسمان میں جیسے پانی ہو۔۔۔نہیں!

سب سے بھیانک ہے خالی زمین پر رات کو رضائی نہ ہونا سورج نے موسم میں ایک گرم لہر پھیلا دی رگو و سو رہا تھا۔۔۔اور۔۔۔پلا اس کے تلوے چاٹ رہا تھا۔

پاکستان میں رشتوں کو اتنا ہی مفاد پرست دیکھا تھا جتنا جرمنی میں اس کی ماں سمیت بہت سارے لوگ تھے۔ ان میں مخلص بہت کم تھے بہت ہی کم۔ ہر ایک مفاد سے جڑا تھا ہر ایک کی دوسرے کے ساتھ ضرورت وابستہ تھی_ وہ جلدی ہی یہاں کے ماحول سے گھبرا گیا تھا

اسے اردگرد لوگوں نے بھی بتایا تھا کہ یہ جگہ یہ ملک اس کے رہنے کے قابل نہیں ہے_ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ مگر اس سے پہلے شافیہ کی کچھ ضروری ڈاکیومینٹیشن کروانا تھی وہ شافیہ کو ساتھ لے کر جا رہا تھا۔

یہ فیصلہ ہو چکا تھا۔

خداداد اور خطیب کو ہشام کی طرف سے میسج وصول ہو گیا تھا

یعنی وہ واپس آ رہا تھا ڈی سوزا نے سوچا کہ یہ خوشخبری وہ سب سے پہلے سلسبیل کو دے گی مگر

سلسبیل یہ خبر سن کر بھی ٹھس رہی تھی جیسے سن ہوتے ہیں

جیسے بالکل جذبات سے خالی اور کھوکھلے _ جیسے کوئی مجسمہ جس پر کوئی چیز اثر نہ کرتی ہو۔ڈی :

سوزا کا دل بھر آیا تھا

خلیل جبران کہتے ہیں

Do not love half lovers

ادھوری محبت کرنے والوں سے کبھی دل نہ لگاؤ

کچے پکے دوستوں کی خدمت نہ کرو

ایسے لوگوں کے کام میں شریک نہ ہو جو اپنے کام کے ماہر نہیں

آدھی زندگی مت جیو

اور آدھی موت بھی نہ مرو

اگر تم خاموشی چنتے ہو تو مکمل خاموشی اختیار کرو

جب تم بولنے لگو تو تب تک بولو جب تک تمہاری بات مکمل نہ ہو جائے

کوئی بات کہنے کے لیے، خود کو کبھی خاموش مت کرو

اگر تم کچھ قبول کرتے ہو تو کھل کر اس کا اظہار کرو

اس پر نقاب نہ چڑھاؤ

اگر تم انکار کرنا چاہتے ہو تو واضح طور پر کرو

کیوں کہ مبہم انکار کا مطلب، کمزور اقرار ہوتا ہے

کبھی آدھا حل قبول نہ کرو

آدھے سچ پر یقین نہ کرو

کبھی ادھورا خواب نہ دیکھو

ادھوری امیدوں کے بارے میں سنہرے خواب نہ دیکھو

ادھورا مشروب تمہاری پیاس نہیں بجھائے گا

آدھا ادھورا کھانا تمہاری بھوک مٹانے سے قاصر ہو گا

آدھا راستہ طے کرنے سے تم کہیں نہیں پہنچو گے

ادھورا خیال تمہارے لیے کوئی نتائج نہیں لا سکے گا

تم ایک مکمل انسان کی شناخت رکھتے ہو

بجائے اس کے کہ تم ادھوری زندگی جیو"_

اس نے بھیگی آواز میں کہا تھا جیسے اسے تحریک دلا رہی ہو

اسے زندہ رکھنے کے لیے لفظوں کی آکسیجن مہیا کر رہی ہو وہ ایک اچھی غم گسار تھی درد دل رکھتی تھی۔

دہ رہنے کے لیے ہمیں اپنے سے زیادہ غم زدہ لوگوں کو دیکھ کر صبر کرنا چاہیے"_

ڈی سوزا کہہ رہی تھی

"صبر کرنا اور صبر سے جھیلنا بہت فرق ہے نا"_

سلی کی آواز نم تھی

"زندگی کو آگے لے کر جانا ہو گا_ کیا تم نے فلسطین میں بے گور و کفن کٹی پھٹی لاشوں والے بچے نہیں دیکھے؟ بھوک پیاس خوف اور بے گھر_ وہ اللہ کے بھروسے پر ہیں نا جو زندہ رہ گے؟ تو ہم صبر کیوں نہیں کرتے؟ ایک دوسرے کو دیکھ کر"_

میٹھے بول کبھی کبھی سہارا بن جاتے ہیں اور کبھی کبھی سکون کی علامت بھی_

رات کو کھڑکی کے اس پار وہ اپنی گزشتہ کے پل گن رہی تھی۔ وقت جیسے بھاگ رہا تھا بہت تیزی کے ساتھ

المرء یبذل العمر نفسہ
فاذا اللیل بالمساء یشع

انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنی عمر گنواتا رہتا ہے (اور اسے کوئی تعجب نہیں ہوتا) مگر جو کبھی شام ڈھلے رات چھا جائے تو حیران ہونے لگتا ہے"۔

شاید ایسا ہی تھا

احساس کتنا حسین تعلق تھا؟

اس نے اپنے دل میں ایک ہلکی سی رمق محسوس کی تھی۔ جیسے زندگی کی لہر دوڑی ہو۔ کچھ لوگ اسے دھرم کہتے ہیں کچھ ایمان سے مستعار لیتے ہیں کچھ احساس کا ثبوت مانگتے ہیں میں اسے دل کی تنہا دھک کا نام دیتی ہوں، جو سب بتاتی ہے۔۔

"Feelings"

Some call it religion

Few tag it as faith

Other half ask for evidence

name it a silent beat of heart

Which ...

سمیح القاسم کا قصیدہ "ما من الہ سواک" روشن دن کی طرح زندہ حقیقت بن کر ہر سو ایک ردھم میں گایا جا رہا تھا

یہ چراگاہیں مسموم گھاس اور سبزے سے بیزار ہیں

میری بھیڑیں یہاں، میری باہوں کے حلقے میں مردار ہیں

میرے میٹھے کنوئیں میں وہ سب مل کے پتھر گراتے رہے

میری انجیر برباد کی

اور زیتوں جلاتے رہے

میرے خرما کے باغوں پہ
یلغار کی
اور شاخوں کو توڑا
میری داکھوں میں جتنا بھی خوش رنگ شیرہ تھا
لے کر نچوڑا
میرے لیموں کے پیڑوں پہ بمباری کی
اور پودینے کو دی سوکھنے کی سزا
میرے مولائے کل، سب کے حاجت روا
کیسے ظاہر کروں اپنا کرب و بلا؟
اور سناؤں کسے دہشتوں کی کتھا؟
میرا کوئی نہیں ہے تمہارے سوا
دیکھتا ہوں تجھے کس قدر دھیان سے
دیکھتا ہوں تجھے پورے جی جان سے
تو بھی میری طرف دیکھتا ہے مگر
ایک الگ طرز سے
ایک الگ شان سے
تو کہ مولائے کُل، رب ارض و سما
حبس اور قید کے جبر سے ماورا
میں گرفتار، محبوس وحشت سرا
میں اسیر قفس، بے کس و مبتلا۔
لفظ رو سکتے تھے۔ جیسے انسان روتے تھے
ایسے ہی ماحول بھی روتا ہے اور احساسات بھی روتے ہیں

سلسبیل کو لگا وہ بھی رو رہی ہے وہ دونوں رو رہے تھے_ اور ان کے ساتھ پورا ابوار یا رو رہا تھا

ہاں جب غبار چھٹ گیا تھا تو سلسبیل نے زرد پتوں کی چرمراہٹ جیسا ایک سوال پوچھا تھا_

" کیا فلسطینی عورتیں ناجائز بچوں کو جنتی ہیں"؟

اسے لگا خطیب بھی رویا ہے اس کا چہرہ زرد ہوا تھا پھر سیاہ پڑ گیا تھا_

اور وہ لب بھینچ کر ضبط کرتا رہا

" جو تمہارے ساتھ ہوا ایسا بہت ساری مظلوم عورتوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے صبر اور ہمت سے تم اسے شکست دے سکتی ہو اگر تم چاہو تو _ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں "_

خطیب کے لفظ اس کے لیے ایک بڑی امید تھے اسے لگا آج بواریا میں بہت دن کے بعد آکسیجن میسر تھی وہ کھل کر سانس لے سکتی تھی۔

"انسان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے"

یہ بات شافیہ کو کبھی سمجھ نہیں آئی تھی اس نے ہمیشہ دوسروں کے مطابق ہی زندگی گزاری کہ اس سے کوئی ناراض نہ رہے۔کوئی اس کے بارے میں برا نہ سوچے۔کوئی اس کے بارے میں غلط خیال نہ کرے۔

یہ سب کرتے کرتے اس کی اپنی زندگی تو بلکل محدود ہو کر رہ گئی تھی_

اسی لیے عظیم فلسفہ نگار اپنی زندگی کے نچوڑ پیش کر چکے تھے

"مرنے کے بعد لوگ آپ کو زیادہ یاد نہیں کریں گے، یہ صرف چند دن ہے اور پھر آپ بھولے ہوئے لوگوں میں سے ہو جائیں گے، گویا آپ پیدا ہی نہیں ہوئے اور نہ ہی کبھی تھے۔اتفاق سے آپ کا ذکر چند بار ہوگا، لیکن آپ ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گے کیونکہ نئی نسلیں زندہ ہو جائیں گی۔تب لوگ یاد نہیں رکھیں گے کہ آپ کون ہیں، اور وہ آپ کے اصولوں کو یاد نہیں رکھیں گے جن پر آپ ہمیشہ کاربند رہے، اور نہ ہی وہ یہ یاد رکھیں گے کہ آپ شریف النفس تھے یا بُرے ولن ... دونوں صورتوں میں آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ان کے الفاظ بالکل!

اپنی زندگی کو اس طرح گزاریں جس طرح آپ اسے دیکھتے ہیں، جس طرح سے آپ کو خوشی ملتی ہے، کیونکہ زندگی آپ کی زندگی ہے، اور گزرے ہوئے دن کبھی واپس نہیں آئیں گے۔اپنی زندگی جیو

جیسا کہ آپ کو مناسب لگتا ہے۔_"

شافیہ نے سوچا تھا وہ جرمنی جا کر اپنی مرضی کا جینے کی کوشش کرے گی

اس وقت بھی جب سمیرا نے اس کے جانے سے پہلے جو کچھ جی جی اسے دے کر گئی تھیں اس میں سے حصہ مانگ لیا تھا_ تب شافیہ نے جو کچھ اس کے پاس تھا وہ دے دیا_ ، اسے دوبارہ اس خود غرض سرزمین پر قدم نہیں رکھنا تھا_ یہ اس کا آخری فیصلہ تھا۔

جاتے سمے آنٹی ثروت سنہرے اور اس کے بھائی سب ان سے ملنے آئے تھے _ خداداد کی پوری کوشش تھی کہ وہ بھی جرمنی سیٹ ہو کر اپنے بہن بھائی کو بلا لے_ عنقریب یہ لوگ بھی جانے والے تھے_ جس دن ان کی روانگی تھی وہ اس سرزمین سے سارے تعلق ختم کر کے جا رہی تھی یہ چند خود غرض لوگ جو صرف اور صرف پیسے کے پجاری تھے_ ان کی کیا حثیت و اہمیت تھی؟

صرف دو کوڑی کے لوگ تھے_ بابا ایک مٹی کے مادھو_ وہ بہت آزردہ دل کے ساتھ اس سرزمین کو چھوڑ رہی تھی

اور جب جہاز بادلوں کے اوپر پرواز کر رہا تھا۔شافیہ کے لیے دنیا کا ایک اور دروازہ کھل رہا تھا

تم بھلائے گے۔۔۔محمود درویش

کہتے ہیں

"تم بھلائے گئے۔۔۔

یوں بھلائے گئے جیسے تھے ہی نہیں

تم بھلائے گئے

جیسے (کھنڈرات میں) پنچھیوں کی قضا

یا کنیسے کی خاموش، گم سم فضا

راہ چلتی محبت (پراگندہ خواب)

رات کے (ہاتھ میں جیسے) کالے گلاب

تم بھلائے گئے"_

آہ"۔
بواریا کے ایک گاؤں میں سسکی ابھر رہی تھی
" اُقَلِّلُ نَوائِبَ الأیامِ وحدی
إذا اجْمَعَتْ کتائِبُہا احْتِشادا
کأنّی فی لسانِ الدہرِ لَفظٌ
تَضَمَّنَ منہ أغراضاً بِعادا

میں نے حوادثِ زمانہ کو تنہا گزار لیا۔ جب مصیبتوں کے لشکر جمع ہوتے تو میری تنہائی ان کے سامنے ڈٹ جاتی"۔
'میں تو اس ہستی کی زباں پر ایک لفظ تھا جس سے لوگ بعید غرضیں اور مطالب نکالتے رہے۔
میں اپنی بیٹیوں کو یہ
سکھاؤنگی
نہ چپ رہیں کہ عزتوں کے بوجھ سے
کبھی جو سانس تنگ ہو
تو پگڑیوں پہ تھوک دیں
طمانچے مارنے کا حوصلہ نہ ہو
تو پھر بھی اتنا کر سکیں
کہ زندگی کے منہ پر چار
گالیاں تو بک سکیں۔

قسط نمبر16

"صنوبر کا ایک درخت بلند شمالی چوٹی پر
تن تنہا سفید کمبل میں سو رہا ہے،
جس پر برف کے پردے تنے ہوئے ہیں
صنوبر کا یہ درخت اس کا خواب ہے
جو دور دراز مشرقی سرزمینوں کے
جلتے ہوئے صحراؤں میں اکیلا
خاموشی سے روتا ہے۔"

سفید بادلوں کو چیرتا ہوا جہاز اس اجنبی زمین پر لینڈ کر رہا تھا جو شافیہ کے خوابوں کی زمین نہیں تھی راستہ بھر وہ حیرت سے ان لوگوں کو سنتی رہی جو پاکستان کی برائیاں کر رہے تھے یہ لوگ صدیوں پہلے مغرب میں آباد ہو چکے تھے دیکھا جائے تو پاکستان میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا ایک تباہ حال معیشت غیر محفوظ مستقبل اور مایوس نئی نسل۔ لوگ دھڑا دھڑ ہجرتیں کر رہے تھے۔
جو بھی تھا اپنا ملک تو تھا نا شافیہ کو خبر نہیں تھی کہ زندگی کس موڑ پر لے آئی ہے مگر یہ کہ جی جی نے جو فیصلہ کیا تھا اس نے اسے دل و جان سے قبول کیا۔ جی جی اس کے لیے کبھی برا سوچ ہی نہیں سکتی تھیں اس بات کا شافیہ کو پورا یقین تھا راستے میں ہشام نے اسے چار یا پانچ بار مخاطب کیا تھا ایک بار بلینکٹ اوڑھاتے ہوئے۔ دو بار کھانے کے لیے اور ایک بار یہ بھی پوچھا تھا کہ "جہاز کے سفر میں ڈر تو نہیں لگ رہا۔"

شافیہ نارمل ہی تھی۔ نجانے کیوں دل سے تمام خوف دور ہو چکے تھے یہاں ہر ملک اور ہر نسل کے لوگ تھے خاص طور پر جس علاقے میں ہشام رہتا تھا یہاں زیادہ تر ہجرت زدہ لوگ تھے کچھ ایسے جن کے ملک جنگوں میں تباہ ہو چکے تھے۔

"نسل در نسل

ہم نے اپنی جوانی بے ضرر گناہوں میں گزاری

بے وقعت سی محبت میں باہم مبتلا

ہم اکثر سمجھتے کہ ہم کسی بات پر آزردہ ہوئے ہیں

مگر کوئی دکھ دیرپا نہ ہوتا

کوئی ضرب ہمیں زخم نہ لگاتی

ہمارے سرد حسن کو مسخ نہ کر پاتی

ہر موسم میں ہم دراز رہے، مینچے ہوئے، نہیں

صلیبوں پر نہیں بلکہ نرم بستروں پر

گداز جسموں کے ساتھ، جبکہ آہ و زاری کرتی

حساس گھڑیاں شام اور صبح کے جھٹپٹے میں

نیم خواب اور نیم مدہوشی کے عالم میں گزرتی چلی جاتیں

ہم خود سپردگی کے قائل تھے، ہر چیز کے آگے ہتھیار ڈال دیتے۔

یادوں کے لیے، دیواروں اور کوٹھوں کو کھرچنا ہمارا کام نہیں،

نہ ہی موت سے سوال کرنا،

لیکن جیسے بچہ ماں کے بازو؟ وں سے مانوس ہوتا ہے

ہم اپنے آپ کو آگ کے

یا بھوکی زمین کے سپرد کریں گے

آہستہ آہستہ نگلے جانے کے لیے۔

کوئی اپنی صلیبوں سے اتر کر ہمیں

اپنے زخم نہیں دکھائے گا

خاموشی میں گم ہو جانے والا کوئی خدا

اچانک بات نہیں کرنے لگے گا،

کوئی کھوئی ہوئی محبت

ہماری مدعی نہ ہوگی،

نہ ہمیں کبھی سابقہ حیثیت میں بحال کیا جائے گا

نہ ہمیں نیا پن عطا کیا جائے گا۔''

ایک روشن گھر شافیہ کا منتظر تھا اس کی زندگی میں بہت اچانک یہ موڑ آیا تھا پوری زندگی ایک دم ہی بدل گئی تھی اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس خواب نگر میں اتنا اچانک آسکتی ہے؟

یہ اس کی بڑی خوش نصیبی تھی یا آزمائش؟

مگر وہ بہت خوش تھی اور حیران بھی زندگی کا یہ موڑ اس کے تصور سے بہت بڑھ کے تھا۔ دوسری طرف ہشام کے کیا تاثرات تھے؟ وہ شافیہ کو نہیں جانتا تھا۔ وہ اس کے لیے اجنبی تھی

تو کیا شافیہ کا مطالعہ ضروری تھا؟

''بات یہ ہے کہ عورت تو چیز ہی ایسی ہے کہ تم چاہے کتنا ہی اس کا مطالعہ کر لو پھر بھی سب کچھ بالکل نیا ہی ہوگا۔"

"تو پھر بہتر یہی ہے کہ مطالعہ کیا ہی نہ جائے"

اسے ایک مشہور قول یاد آ رہا تھا

"نہیں، کسی ریاضی دان نے کہا ہے کہ اصل خوشی سچائی کو دریافت کر لینے میں نہیں بلکہ اس کی تلاش میں ہے"

دو دن تھکن اتارنے میں گزر گے تھے۔ تیسرے دن ہشام نے شافیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے سارا گھر دیکھایا تھا۔ وہ بہت سنجیدہ تھا

''یہ میرا گھر ہے۔ میرا ذاتی گھر جواب آپ کا بھی گھر ہے اس گھر میں جو کچھ ہے وہ سب آپ کا ہے آپ اسے جیسے مرضی استعمال کر سکتی ہیں۔ یہ گھر بہت اچھی لوکیشن پے ہے اس کے آس پاس پر فضا دیہات ہیں اور آب و ہوا بہت بہترین ہے" دھیمے انداز میں بول رہا تھا اس کا انداز موہ لینے والا تھا۔

"یہ ہال ہے۔ یہ لونگ روم ہے یہ دو بیڈ روم ہیں اور یہ کچن اور لانڈری۔

اس سے آگے لائبریری ہے اور آپ کے ذوق کا سامان بھی موجود ہے۔ تم اس لائبریری سے ہر کتاب اٹھا کر پڑھ سکتی ہو۔"

وہ اسے اپنے خزانے کی طرف لے آیا تھا

''یہ سچ میں میرا خزانہ ہے۔"

:" یہاں ڈاکٹر اور وکیل سب سے مہنگے ہیں مگر مجھے لگتا ہے ادیب اور کتاب یہاں سب سے زیادہ مہنگا ہے۔" وہ اسے کتابیں کھول کھول کر دیکھا رہا تھا

"جب بھی تم نے یہاں وقت گزارنا ہوا تو سب سے پہلے اس کتاب کی پڑھنا۔"

اس نے ایک مشہور نسخہ حیات اس کے سامنے رکھا تھا

"جب میں نے ادب پڑھنا شروع کیا تو سب سے پہلے یہ کتاب پڑھی تھی۔"

وہ اسے دیکھا رہا تھا

"اس میں تم کو سبق بھی ملے گا اور زندگی کا قرینہ بھی۔ اس کے آخر میں ایک چھوٹا سا سبق ہے یہ کہ کبھی روشنی دینے والے کو دم گھونٹ کر مار دینا نہیں چاہیے۔"

اس نے کتاب کھول کر شافیہ کے سامنے کی تھی اس کا لہجہ معنی خیز تھا اور شافیہ کی نظر صفحات پر تھی

اس نے عنوان دیکھا تھا لکھا تھا

" جگنوؤں بھری تھیلی"

"تبت کے لوک ادب سے ایک خوبصورت کہانی"

؟تبت کی ہر وادی برف سے ڈھک گئی تھی۔ راتیں سیاہ تھیں اور لمبی لیکن سفید برف اس سیاہی میں عجیب سا منظر بنا دیتی۔ ایک دور وادی میں، جو کی چار پہاڑوں کے عقب میں تھی، بانس کی ایک کٹیا کھڑی تھی۔ یہ بوڑھے بانگو کا کاشانہ ہے۔ جھونپڑی کے دروازے پر لکڑی کا ایک تختہ بطور آڑ رکھا ہوا تھا اور اس کی چھت کی اطراف ترچھی تھیں تا کہ برف کے گولے گرتے ہی پھسل جائیں اور وزن سے بانس نہ ٹوٹیں۔ جھونپڑی کوئی بیس۔۔۔ پچیس فٹ لمبی اور اتنی ہی چوڑی تھی۔ اندر دو چارپائیاں تھیں اور ایک اپلوں کی انگیٹھی جس کی حرارت اس جان لیوا سردی میں بانس کی اس کٹیا کو ایک اگلو سا بنا دیتی اور مکین جاڑے کی شدت سے محفوظ رہتے۔ ایک طرف کھونٹی سے پرانی لالٹین لٹک رہی تھی جس کی لو سے اندر بمشکل ہی روشن ہوتا تھا۔ جھونپڑی کے دروازے پر قبائلی زبان میں خوش آمدید اور مہمان نوازی کی دعوت کے بارے کچھ الفاظ لکھے تھے اور دائیں جانب ہی گھاس کے ایک ڈھیر کے پاس تین دنبیاں اور ایک یاک کھڑا تھا۔ جب موسم خوشگوار ہوتا تھا تو بانگو اپنے مویشی باہر لے جاتا اور رات خوبانی کے درختوں کے ساتھ باندھ دیتا لیکن آج کل موسم اتنا سرد تھا کہ وہ بے زبان روحیں کھلی فضا میں اس کی شدت کی تاب نہ لاسکتیں تھی۔ بانگو کی بیوی اون کی پوشاک بنتی رہتی اور ہر ڈورے کے ختم ہوتے ہی دوسرا نکال کر دھاگے جوڑ دیتی۔ اس سنسان اور سرد وادی کے اس جوڑے کے دو بچے تھے، لوگیس، بڑی تھی 9 سال کی اور لوشی 5 برس کا تھا۔ بانگو شادی سے پہلے 2 میل دور اپنے گاؤں میں رہتا تھا لیکن شادی کے بعد اس نے خوبانی کا ایک باغ اگایا اور بانس کی یہ رہائش تیار کر کے اپنے گھر والوں کو یہاں لے آیا۔ بانگو خود تو بوڑھا ہو رہا تھا لیکن اس کی بیوی نوجوان تھی۔ ہلکی سی نازک، دو بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی جب کبھی وہ سردی سے ٹھٹھرتی اور اپنی ہتھیلیاں انگیٹھی پر گھماتی تو وہ بھی ایک کمسن بچی ہی لگتی۔ لمبی اندھیری راتوں میں لالٹین کو شعلہ بھی سردی سے مدہم پڑ جاتا اور اس کے گول شیشے پر جمنے والی نمی اس منظر اور دھندلا دیتی۔ بانگو ہر دو ہفتے بعد گاؤں جا کر تیل لے کر آتا۔ لیکن اس بار لگتا تھا کہ وہ برفباری میں جانے سے کترا رہا تھا۔ لالٹین کا شعلہ ہر گزرتی شب اور مدہم ہوتا جا رہا تھا۔

لوشی ہر وقت سرمئی دنبی کے پاس ہی بیٹھا رہتا بلکہ اپنا کھانا اور دودھ بھی اس کے پاس ہی لے جاتا۔ بانگو نے جب سے اسے بتایا تھا کہ یہ دنبی کچھ دنوں میں بچہ جننے والی ہے تب سے اس کے دماغ میں صرف ایک ہی منظر سمایا تھا۔۔۔ دنبی کا معصوم بچہ، جس کے بال موم کی طرح ملائم اور نرم ہونگے اور، وہ اپنی ماں سے چمٹ کر دودھ پیے گا۔۔۔ لوشی اس دنبی کا منہ پکڑ کر سہلاتا اور اس کے کان کے پاس سرگوشی کرتا: "اس بار سب سے پہلے تمہارا بچہ میں دیکھوں گا،، اچھی دنبی! اگر میں سو گیا تو تم بچہ نہ دینا، جب میں جاگ گا تم تب ہی اپنا بچہ پیدا کرنا۔۔۔ نہیں تو میں تم سے کبھی نہیں بولوں گا"۔ دنبی کی آنکھیں حیرت سے لوشی کی تکتی رہتیں۔ بانگو کی بیوی نے دنبی کے پیٹ پر دولائی باندھ دی تھی۔ بانگو کو امید تھی کہ دو، تین دن میں دنبی بچہ جن دے گی لیکن اسے یہ اندیشہ تھا کہ لالٹین بجھ جائے گی اور اندھیری رات میں روشنی کا انتظام مشکل ہو جائے گا۔ لوشی اپنی بہن سے بہت پیار کرتا تھا اور برفباری سے پہلے وہ دونوں باہر وادی میں کھیلتے، تتلیاں، جگنو اور چڑیاں پکڑتے، اور انہیں گھر لے آتے۔ لوشی نے اپنے ڈبے میں مینا کا بچہ ڈال رکھا تھا، جس کو وہ دن میں کئی بار دیکھتا اور پھر ڈبے میں ڈال دیتا۔

اس رات لالٹین کا ٹمٹماتا شعلہ مکمل طور پر بجھ گیا اور جھونپڑی میں پوری طرح اندھیرا چھا گیا۔ بستروں کے پاس انگیٹھی کی آگ سے ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ لوشی اس رات سونے کی کوشش میں نہ تھا۔ اس کے دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ اگر وہ سو گیا تو پھر صبح، دن چڑھے ہی اٹھے گا، اور اگر تب تک دنبی نے بچہ دے دیا تو وہ اسے سب سے پہلے کیسے دیکھے گا، اس کے ماں باپ تو صبح سویرے ہی جاگ جاتے ہیں۔ آدھی رات کو اس نے لوگیس کی رضائی ہلا کر اسے اپنا اندیشہ بتایا۔

بانگو کل سے گاؤں گیا تھا کیونکہ وہ مکھن اور اونی چغے بیچ کر کچھ چیزیں خرید کر لانا چاہتا تھا اور لالٹین کے لیے تیل بھی۔ لوشی دنبی کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن اندھیرے میں وہ اپنے بستر سے نہ اٹھا۔ اندھیری جھونپڑی میں حاملہ دنبی دوسرے مویشیوں سے الگ بیٹھی تھی۔ اچانک اس کی آنکھوں میں چمک کی ایک لہر دوڑی، اس نے اپنا پیٹ اٹھایا اور پھر اس کا موٹا وجود چند لمحوں میں ہلکا ہو گیا، ننھا اونی ریشم کا گولا ماں کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا تھا۔ دنبی زمین پر بیٹھ گئی اور اپنے جگر کے ٹکڑے کا لمس لینے

لگی۔لوگیس نے لوشی کو کچھ کہے بغیر اپنی چارپائی کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک تھیلی نکالی، جس میں اس نے تین، چار دن پہلے کافی جگنو بند کر دیے تھے۔لوشی حیرت سے اپنی بہن کی تھیلی کو دیکھ رہا تھا۔لوگیس چپکے سے اٹھی اور لالٹین اتار کر انگیٹھی کے پاس لے آئی۔اس نے لوشی کو اشارہ کیا، وہ دونوں بہن بھائی لالٹین کو کھولنے لگے۔لوگیس نے جگنوؤں سے بھری تھیلی لوشی کو پکڑاتے ہوئے کہا کہ جیسے ہی وہ لالٹین کا شیشہ سرکائے، وہ تھیلی شیشے میں پلٹ دے۔باہر کہر بھری ہوا چل رہی ہے۔ان کی ماں لحاف اوڑھے نیند کی وادیوں میں گم ہے۔لوگیس نے شیشہ اٹھاتے ہی لوشی کو بلایا تو اس نے فوراً تھیلی کا منہ پھیلا کر شیشے میں پلٹ دی۔لوگیس نے فوراً ہی شیشے کو گھما کر بند کیا اور دامن سے نمی کی تہہ کو صاف کر دیا۔ایک لمحے میں لالٹین کا شیشہ ہلکا سا روشن ہوا۔دسیوں جگنوؤں نے اتنی روشنی ضرور کر دی تھی کہ وہ جانوروں کے پاس چلے جاتے۔لوشی لالٹین اٹھا کر دنبی کے پاس آیا تو خوشی سے لوگیس کو آوازیں دینے لگا، اس نے ننھے میمنے کو چوما،،، وہ سفید اور ملائم تھا--- ،نازک اور کوسا کوسا۔۔لوشی سوچ رہا تھا کہ میمنا بھی برف کی طرح سفید ہے لیکن برف تو بڑی ٹھنڈی ہوتی ہے اور یہ میمنا بڑا گرم ہے۔لوشی بار بار میمنے کو چومتا اور اس کے گرم وجود پر ہاتھ پھیرتا۔اس نے دنبی کے سر کے پاس جا کر کہا:"اچھی دنبی! تمہارا شکریہ"۔لالٹین کی مدھم روشنی میں لوشی دنبی کے پاس بیٹھا خوشی منا رہا تھا جبکہ شیشے میں کئی ننھے شعلے دم توڑ رہے تھے---"

وہ سانس رو کے آخری لائن پڑھ رہی تھی

اس کے نیچے خوب صورت لکھائی میں شاید اس کتاب کو سب سے پہلے پڑھنے والے نے لکھا تھا احمد شاملو کے دل کی آواز۔:

"ہمارے دل ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے

کہ ہم اس دنیا میں کہاں ہیں

دور رہیں مگر (دل سے) نزدیک ہو کر!

میں قریب رہ کر بھی دور ہونے سے ڈرتا ہوں۔۔۔

دِل ہای ما کہ بہ ہم نزدیک باشند

دیگر چہ فرقی می کند

کہ کجای این جہان باشیم

دور باش امانزدیک،

من از نزدیک بودن؟ ہای دوری؟ ترسم۔۔۔

" آہاں ابھی کھونا نہیں۔ میرے اس خزانے میں تم کھو جاؤ گی۔ مگر ابھی کھونا مت۔ میں تم کو کچھ اور دیکھاتا ہوں۔" وہ شیلف سے نایاب کتب نکال کر جیسے اسے سمجھا رہا تھا کہ تمہارا زیادہ وقت ان کے ساتھ ہی گزر سکتا ہے بہتر ہے ان کتابوں کے ساتھ مانوس ہو جاؤ۔

"یہ دیکھو۔۔۔

فارن ہائیٹ ۴۵۱"Fahrenheit 451" ہے

وہ مسکرایا تھا یا شافیہ کو وہم سا لگا۔

۔یہ کتاب شاید زندگی کا ایسا تحفہ ہے جسے زندگی میں کھونے کا کبھی کوئی ڈر نہیں ہوتا۔ باقی تو زندگی دوسروں کے کھو جانے کو کہتے ہے۔" رے براڈبری" شاید اسی قسم کے انسان تھے جس نے اپنا سب کچھ کتاب کے ساتھ جوڑا۔ اور اسکا ناول "فارن ہائیٹ ۴۵۱" اسی کتاب دنیا کے بارے میں ہے۔ وہی کتاب جسے اج کی دنیا اور شاید ہمیشہ سے کبھی اپنا جانا ہی نہیں۔ اپنائیت تو دور، کبھی اس کو دیکھا تک نہیں۔ وہ کتاب جس اپنے اندر تہذیبوں اور ثقافتوں کے رازوں کو سینے سے لگایا، وہ کتاب جو ہمیں اپنے آپ سے روشناس کرتی اور روشنیاں بکھیرتی ہوئی ہر خاص و عام کے دلوں کو منور کرتی۔

"فارن ہائیٹ "اسی طرح ہمیں ایسی دنیا میں لیجاتی ہے جہاں پہ کوئی پڑھنے والا نہیں، کوئی دیکھنا والا نہیں، بالخصوص اس عالم انسان میں جس میں وہ بصارت ہی نہیں جو دنیا کو بھانپ سکے۔" فارن ہائیٹ ۴۵۱" کی اہمیت شاید اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ ہمیں اپنی دنیا کے بارے میں بتا رہا ہے۔ جہاں باتیں

کرنے والے تو زیادہ لیکن پڑنے والے نہیں۔

یہ کتاب ۳۵۹۱ میں لکھی گئی ہے جو کہ "ڈسٹوپیان ادب dyspotian literature" میں آتا ہے۔تم گھبراؤ نہیں مگر تم واقعی ہی ٹھیک سمجھ رہی ہو۔یہ جگہ تمہارے بہت کام آنے والی کیونکہ تم ایک ڈاکٹر کی بیوی ہو۔یہ یاد رکھنا کہ مسیحا کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی وہ دوسروں کی زندگی بچانے کی تگ ودود کرتا ہے۔"

تم کو سب کچھ ملے گا ہر کہانی کے اندر تم کو لگے گا یا تو یہ تمہاری کہانی ہے یا میری یعنی ہشام کی۔مجھے بھی ایسے ہی لگتا ہے جیسے ہر کہانی مصنف نے میری لکھی تھی

جیسا کہ مویان کی کہانیاں

ایسے لگتا ہے وہ میرے جذبات لکھا کرتا تھا

شاید تم کو بھی یہی لگے کہ یہ سب تمہارے لیے لکھا گیا ہے مگر اسے بھی لازمی پڑھنا۔"

وہ اسے ایک اور چکنی کتاب پکڑا رہا تھا یہ صرف کتابیں نہیں تھیں یہ بات شافیہ جان چکی تھی یہ اس کی مستقبل کی ساتھی تھیں۔دوست بھی اور محبوب بھی

"چین کے نوبل یافتہ ادیب "مویان" کی داستان گوئی سن سکتی ہو؟

''میرا خیال ہے کہ آپ سب لوگ ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے ذریعے شمالی گاؤمی قصبے کے بارے میں جانتے ہوں گے۔۔۔آپ نے میرے نوے سالہ بوڑھے والد کو دیکھا ہوگا۔اُس کے علاوہ آپ نے میرے بھائیوں، میری بہن میری بیوی اور میری بیٹی حتیٰ کہ میری پوتی کو بھی دیکھا ہوگا جو کہ اب ایک سال اور چار ماہ کی ہے،لیکن اِس وقت میں سب سے زیادہ جس کو یاد کر رہا ہوں وہ میری والدہ محترمہ ہیں، جو اب اِس دنیا میں نہیں رہیں۔کاش کہ آج وہ بھی یہاں اس تقریب میں ہوتیں۔۔۔

میری والدہ 1922ء میں پیدا ہوئیں اور 1994ء میں اِس جہان سے کوچ کر گئیں۔ہم نے اُن کی تدفین گاؤں کے مشرق میں آڑو کے ایک باغ میں کی تھی۔گزشتہ برس ہمیں اُن کی قبر کو گاؤں سے مزید آگے منتقل کرنا پڑا کیونکہ وہاں سے نئی ریلوے لائن کو گزرنا تھا۔جب ہم نے اُن کی قبر کشائی کی تو

تابوت گل چکا تھا اور اُن کا جسم مٹی میں مل چکا تھا۔ اِس لیے ہم نے آس پاس کی مٹی بھی کھود ڈالی، ایک علامت کے طور پر، اور پھر اُنہیں نئی قبر میں لے گئے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب مجھے احساس ہوا کہ میری والدہ اِس زمین کا حصہ بن چکی ہے اور جب میں دھرتی ماں سے مخاطب ہوتا ہوں تو دراصل اپنی والدہ سے مخاطب ہوتا ہوں۔۔۔

میں اپنی ماں کا سب سے چھوٹا بچہ تھا۔۔۔

عوامی باورچی خانے سے ویکیوم بوتل میں پانی بھر کر لانا میری ابتدائی یادوں میں سے ایک یاد ہے۔ ہفتے کے اختتام پر میں بھوک سے نڈھال تھا۔ اِس لیے بوتل میرے ہاتھ سے گری اور ٹوٹ گئی۔ ڈر کے مارے سارا دن میں بھوسے کے ڈھیر میں چھپا رہا۔ شام کے وقت میں نے سنا کہ میری ماں مجھے میرے اصل نام سے پکار رہی ہے۔ میں رینگتا ہوا باہر آیا اور مار کھانے کے لیے تیار تھا۔ لیکن انہوں نے مجھ نہ مارا اور نہ ہی ڈانٹا۔ اُنہوں نے بس میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور ایک آہ بھری۔۔۔

انہی یادوں میں ایک درد بھری یاد اُس دن کی ہے جب میں اپنی والدہ کے ساتھ کمیون کے کھیت میں گندم کے خوشے جمع کر رہا تھا۔ جیسے ہی محافظ آیا سب نے دوڑ لگا دی لیکن چھوٹے پاؤں ہونے کی وجہ سے میری والدہ بھاگ نہ سکی اور محافظ نے اُنہیں پکڑ لیا اور اتنی زور سے تھپڑ رسید کیا کہ وہ زمین پر جا گریں۔ اُس نے ہماری جمع کی ہوئی گندم ضبط کر لی اور سیٹی بجاتے ہوئے چل دیا۔ میری والدہ کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں ایسی مایوسی تھی جو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ سالوں بعد جب بازار میں میرا سامنا اُس محافظ سے ہوا تو وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے بدلہ لینا چاہا لیکن میری والدہ نے مجھے روک دیا؛

بیٹے" اُنہوں نے پیار سے کہا" یہ آدمی کوئی اور ہے۔"

مجھے مون فیسٹیول کے دن اچھی طرح یاد ہیں کیونکہ یہ تہوار ان چند دنوں میں ایک تھا جب ہم سب کو پیالے میں ایک ایک ڈمپلنگ ملتی تھی۔ ایک بار تہوار کے دن ہم کھانے کی میز پر بیٹھے تو ایک بوڑھا فقیر آ گیا۔ میں نے اسے آدھا پیالہ شکر قندی دے کر بھیجنا چاہا لیکن اسے غصہ آ گیا۔۔۔

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں، اُس نے کہا" تم خود تو ڈمپلنگ کھا رہے ہو اور مجھے یہ دے رہے ہو۔ کوئی اتنا بے رحم کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔؟ میں نے بھی غصے سے جواب دیا" ہمیں سال میں بمشکل ایک ڈمپلنگ کھانے کو ملتی ہے۔ تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے کہ کم از تمہیں شکر قندی مل رہی ہے۔ لینی ہے تو لو ورنہ دفعہ ہو جاؤ۔ میری والدہ نے میری سرزنش کی اور اپنا آدھا پیالہ فقیر کے پیالے میں انڈیل دیا۔۔۔

میری یادوں میں سے ایک یاد ایسی ہے جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ میں بازار میں گوبھی بیچنے کے لیے اپنی والدہ کی مدد کیا کرتا تھا۔ میں نے پیسے وصول کرتے ہوئے ایک بزرگ سے ایک ° جیاو زیادہ لے لیا۔ مجھے نہیں یاد کہ جان بوجھ کر یا بھول کر۔۔۔ اور پھر سکول چلا گیا۔۔۔ جب میں شام کو گھر واپس آیا تو میری والدہ رو رہی تھیں۔ میں حیران تھا کیونکہ وہ بہت کم رویا کرتی تھیں۔۔۔ مجھے ڈانٹنے کے بجائے اُنہوں نے پیار سے صرف اتنا کہا؛

"تم نے آج اپنی ماں کو شرمندہ کروا دیا۔۔۔"

ابھی میں کم سن ہی تھا کہ میری والدہ کو پھیپھڑوں کی بیماری ہوگئی۔ بھوک، بیماری اور کام کی زیادتی کی وجہ سے میرے خاندان کو بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ سامنے کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مستقبل کے حوالے سے مایوس تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ والدہ خودکشی نہ کر لیں۔ ہر روز شام کو جب میں گھر واپس آتا تو سب سے پہلے اپنی والدہ کو آواز دیتا۔ ان کی آواز مجھے جینے کا حوصلہ دیتی اور اگر جواباً ان کی آواز نہ آتی تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی۔۔۔ میں اُنہیں آس پاس کے گھروں اور قریبی فیکٹری میں ڈھونڈنے چلا جاتا۔ ایک دن جب وہ کہیں بھی نظر نہ آئیں تو میں صحن میں بیٹھ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔۔۔ عین اُسی وقت وہ کمر پر ایندھن کے لیے لکڑی لادے داخل ہوئیں۔۔۔ وہ بہت ناراض ہوئیں لیکن میں نے رونے کی اصل وجہ اُنہیں نہ بتائی۔ لیکن وہ جانتی تھیں۔۔۔

بیٹے اُنہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا؛

"پریشان مت ہو، چاہے میری زندگی میں کوئی خوشی نہ ہو، لیکن میں تمہیں تب تک چھوڑ کر نہیں جاؤں گی جب تک پاتال سے خدا کا بلاوا نہیں آتا۔۔۔"

میں پیدائشی بدصورت تھا۔ گاؤں والے میرا مذاق اُڑایا کرتے تھے اور سکول کے بدمعاش لڑکے مجھے مارا کرتے تھے۔ جب میں روتا ہوا گھر پہنچا تو میری والدہ کہا کرتی؛

''تم بدصورت نہیں ہو بیٹے۔ تمہاری ایک ناک اور دو آنکھیں ہیں، ہاتھ پاؤں بھی صحیح سلامت ہیں۔ تم بھلا بدصورت کیسے ہو سکتے ہو؟ اگر تمہارا دل صاف ہے اور تم ہمیشہ بھلائی کرتے ہو تو بدصورتی خوبصورتی میں بدل جاتی ہے۔''

بعد میں جب میں شہر منتقل ہو گیا تو پڑھے لکھے لوگ میری پیٹھ پیچھے مجھ پر ہنسا کرتے تھے۔ کچھ تو میرے سامنے ہی میرا مذاق اُڑاتے تھے لیکن ہر بار میں اپنی ماں کی کہی ہوئی بات یاد کرتا اور عاجزی سے معافی کا طلبگار ہوتا۔۔۔

جو لوگ پڑھنا جانتے تھے، میری والدہ اُن کی بہت عزت کیا کرتی تھیں۔ ہم اتنے غریب تھے کہ ہمیں کبھی بھی یہ پتا نہ ہوتا تھا کہ اگلے وقت کا کھانا ملے گا یا نہیں لیکن جب بھی میں کتاب خریدنے یا لکھنے کے لیے کچھ خریدنے کی فرمائش کرتا تو میری والدہ وہ فرمائش ضرور پوری کرتیں۔۔۔

اُنہیں کام چور لوگ پسند نہیں تھے لیکن جب کتاب پڑھنے کی وجہ سے میں اپنے ذمے کا کام چھوڑ دیتا تو وہ کبھی کچھ نہ کہتیں۔۔۔

ایک بار بازار میں ایک داستان گو آیا اور میں چھپ کر اُس کی کہانی سننے پہنچ گیا۔ وہ ناخوش تھیں کہ میں کام چھوڑ کر کہانی سننے چلا گیا تھا۔ لیکن جب وہ رات کو مٹی کے تیل سے جلنے والے دیے کی روشنی میں ہمارے لیے سردی کے کپڑے سی رہی تھیں تو مجھ سے رہا نہ گیا اور اُنہیں بار بار وہ تمام کہانیاں سنائیں جو بازار میں داستان گو نے سنائی تھیں۔۔۔ پہلے پہل تو اُنہوں نے بے دلی سے میری کہانی سنی کیونکہ اُن کے خیال میں داستان گو لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں اور وقت کا ضیاع کرتے ہیں لیکن جیسے جیسے میں کہانیاں سناتا گیا اُن کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ اُس دن کے بعد اُنہوں نے مجھے اِس بات کی مکمل اجازت دے دی کہ میں کام کے وقت جا کر مزید کہانیاں سن سکتا ہوں۔۔۔ اُن کی اس شفقت کے بدلے میں، میں گھر لوٹ کر اُنہیں کہانی کا ایک ایک لفظ سنایا کرتا تھا۔۔۔

جلد ہی میں داستان گو کی بنائی ہوئی کہانیاں دہرا دہرا کر اکتا گیا، اسی لیے میں نے اُن کہانیوں میں تبدیلیاں کرنا شروع کر دیں۔ میں اُن کہانیوں میں جان بوجھ کر وہ باتیں شامل کرتا جو والدہ کو خوش کر دیتی تھیں اور بعض اوقات کہانیوں کا اختتام بھی تبدیل کر دیا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ سامعین کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میری والدہ کے ساتھ میری بڑی بہنیں، میری خالہ اور میری نانی بھی دلچسپی لینے لگیں۔ کبھی کبھی کہانی سنتے سنتے میری والدہ تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہتی؛

"تم بڑے ہو کر کیا کرو گے بیٹے؟ ایسے ہی بچوں کی طرح کہانیاں سناتے رہو گے۔۔۔؟"

اس کی ماں نے اسے نہیں یہ ہر اس پڑھنے والے کے بارے میں سوال کیا تھا جو میری طرح سوچتا ہے۔ تم کیا کہتی ہو۔"؟

وہ اسے چپ دیکھ کر پھر سے دھیمے سے مسکرایا تھا

"مگر آپ تو بہت خوب صورت ہیں۔" نجانے کیسے شافیہ کے منہ سے پھسل گیا تھا

"تو کیا خوب صورتی بس جسم کی ظاہری حالت میں ہی ہوتی ہے۔ میں رویوں دھوکے اور وعدہ خلافی کو بھی بدصورتی سمجھتا ہوں۔"

وہ جیسے کسی تکلیف دہ یاد میں کھویا تھا شافی کے دل کو کچھ ہوا۔

'اور آپ کتنے خوش قسمت بھی ہیں،"۔ یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ یاسیت سے لبریز تھا

" مگر تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ میں خوش قسمت ہوں۔"؟

وہ متعجب ہوا تھا۔

" یہ کہ آپ بہت کام یاب ہیں اور خوب صورت بھی۔ ایک ایسے ملک میں ڈاکٹر ہیں جہاں زیادہ تر غیر ملکی مزدوریاں کرتے ہیں آپ کے پاس آرام کی ہر چیز موجود ہے اور کسی کے خوش قسمت ہونے کے لیے یہ سب کافی تو ہوتا ہے۔"

شافیہ شاید زیادہ ہی مرعوب ہو چکی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر سکون سے بولا تھا۔

" تم نے یہ کیسے طے کر لیا کہ کچھ مادی چیزوں کی فراوانی کسی بھی انسان کی کام یابی کی ضمانت

ہوتی ہے؟ کیا تم نے وہ چینی تمثیل نہیں سنی؟"۔

"کون سی۔"؟ شافیہ نے پوچھا تھا

"وہ چینی بوڑھا جو پہاڑوں میں رہتا تھا؟ ہیرمان ہیسے کہتا ہے۔

''ایک بوڑھے آدمی کا نام چنگ لنگ تھا، مطلب ''چٹانوں کا ماہر''، اور اس کی پہاڑوں میں چھوٹی سی جائیداد تھی۔ ایک روز اس کے گھوڑوں میں سے ایک گم ہوگیا۔ اس کے ہمسائے آئے اور اس کے ساتھ بدقسمتی کی وجہ سے پیش آنے والے اس واقعے پر افسوس کرنے لگے۔

اس بوڑھے نے لیکن پوچھا، ''تم نے یہ کیسے جانا کہ یہ بدقسمتی ہے؟'' پھر چند روز بعد وہ گھوڑا واپس آگیا اور اپنے ساتھ جنگلی گھوڑوں کی ایک بڑی ٹکڑی بھی لے آیا۔ ہمسائے پھر آگئے اور اسے اتنی اچھی قسمت پر مبارکیں دینے لگے۔ اس پر پہاڑوں میں رہنے والے بوڑھے نے پھر پوچھا، ''تم نے یہ کیسے جانا کہ یہ خوش قسمتی ہے۔''

اب چونکہ گھوڑے کافی زیادہ ہو گئے تھے، تو بوڑھے آدمی کے بیٹے کو گھڑ سواری کا شوق ہوا۔ ایک دن اسی شوق کی تکمیل میں وہ اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ ہمسائے پھر آگئے کہ اس بوڑھے سے افسوس کا اظہار کرسکیں۔ اس مرتبہ بھی اس نے ان سے یہی پوچھا، ''تم نے یہ کیسے جانا کہ یہ بدقسمتی کی بات ہے؟''

اگلے برس ''ریاستی لٹھ برداروں'' کا کمیشن پہاڑوں میں آیا تاکہ توانا مردوں کو بادشاہ کی پیدل فوج کے سپاہیوں اور شاہی پالکیاں اٹھانے والوں کے طور پر بھرتی کر کے ساتھ لے جا سکے۔ انہوں نے بوڑھے کے بیٹے کو، جس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ ابھی ٹھیک نہیں ہوئی تھی، اپنے ساتھ نہ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ چنگ لنگ یہ دیکھ کر مسکرا دیا۔"

وہ سنجیدہ تھا۔

"ہم کسی بھی انسان کو پرآسائش دیکھ کر اس کی خوش قسمتی کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور نا ہی کسی کو غمگین یا امتحان میں دیکھ کر اسے بدقسمت تصور کیا جاسکتا ہے۔"

اس نے گہرا سانس لیا اور اسے کتابوں کی دنیا سے ہاتھ پکڑ کر باہر لے آیا تھا۔

'امید ہے تم کو بواریا پسند آیا ہوگا۔ یہ سکون امن اور حسن کا صوبہ ہے اس کے دیہات حسین اور ان میں رہنے والی دوشیزائیں ملکوتی حسن کی ملکائیں ہیں۔"

تعریف کا کچھ حصہ اسے پسند نہیں آیا تھا۔

مگر شافی نے اپنی ناگواری کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"چلو تم فریش ہو جاؤ۔ میں تم کو ناشتہ کرواتا ہوں۔"

وہ شاید دودھ سے سفید کچن کی طرف جا رہا تھا جس کی ہر چیز سفید اور بجلی سی چمکیلی تھی۔ شافیہ نے زندگی میں اتنے حسین کچن بس گوگل پہ ہی دیکھ رکھے تھے۔

ایسے شفاف جیسے کبھی ان پر گرد کی تہہ نا جمی ہو۔ وہ اس چینی تمثیل کے بارے میں سوچتی ہوئی چھوٹی سی ڈائنگ چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔

اس کا چہرہ دہلا ہوا تھا۔

] کچھ دیر بعد وہ ایک سفید ٹرے میں ناشتے کے لوازمات لے کر آیا تھا۔

"یہ پنیر بہت خالص ہے۔ ایک بوارین لیڈی بناتی ہے تم کو پسند آئے گا۔"

وہ اس کے لیے چائے بنا رہا تھا۔

"اب تم ماں کے بارے میں بتاؤ۔"

اس نے جی جی کا ذکر چھیڑ کر اسے آزردہ کر دیا تھا۔

''وہ تو بس ایک لفظ "محبت" سے گندھی تھیں۔ شاید انسان کے روپ میں کوئی فرشتہ تھیں۔"

"میں جانتا ہوں میں ان کی محبت اپنی سانسوں میں محسوس کر سکتا ہوں۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں ان کی عنایتوں کی وجہ سے ہوں۔"

ہشام نے گہرا سانس بھرا تھا

وہ کبھی بھی خود کو اپنی ماں کے احسانات سے نکلا محسوس نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ وہ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اور شافیہ اس کی ماں کا دیا ہوا ایک تحفہ تھا تحفے کون قبول نہیں کرتا؟

☆......☆......☆

خطیب کی زندگی جمود کا شکار ہوگئی تھی۔ وہ ہنسنا بھول گیا تھا۔ پڑھنا بھول گیا تھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی کام ہی نہیں رہا۔ بے مقصد کھڑکیوں کے پار دیکھتے رہنا۔ اس کے خواب جل گے تھے جیسے اس کا پورا گھرانہ جل گیا تھا

"التوا میں پڑے ہوا ایک خواب"
لانگسٹن ہیوجز لکھتا ہے
التوا میں پڑے ہوئے خواب،
کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟!!!
کیا وہ انگور کی طرح،
کڑی دھوپ میں پڑے رہنے سے،
سوکھ جاتا ہے!
یا کسی زخم کی طرح،
ناسور بن جاتا ہے!
کیا وہ گوشت کی طرح،
خشک ہو جاتا ہے!
یا چینی اور ملائی کی طرح،
میٹھے اور ذائقہ دار!
یا کسی وزندار چیز کی مانند،
لٹکا رہتا ہے!
جو کبھی بھی اچانک،
دھماکے سے پھٹ سکتا ہے!!!

اس کا خواب التوا میں پڑا تھا۔ پتہ نہیں سوکھ گیا تھا یا جل گیا تھا اس نے کبھی اپنے خوابوں کی جلی

ہوئی راکھ تک کو نہیں

کیونکہ یہ راکھ اس کی بینائی چھین لیتی تھی

اکثر سلی اوپر آجاتی اور اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی تھی

خطیب کا کرایہ بھی خداداد بھر رہا تھا اور اس کا خیال بھی رکھتا تھا۔

سلی کو لگتا تھا خطیب کے اور اس کے دکھ مشترکہ ہیں

ایک دن بہت ہمت کر کے سلی نے خطیب سے پوچھا تھا

"تمہارا دوست واپس نہیں آیا۔"؟

"خداداد۔"؟ اس نے بے دھیانی سے پوچھا تھا پھر سلی کا چہرہ دیکھ کر نظر سی چرا گیا

وہ اسے بتا نہیں سکا تھا کہ اس کا دوست واپس آچکا تھا

میں نے کچھ پوچھا ہے۔" اس نے سوال دوہرایا۔

"ہاں وہ آچکا ہے۔"

"پھر وہ تم سے ملنے کیوں نہیں آیا"؟

سلی نے پھر سے سوال کیا

"وہ آئے گا جلد ہی۔"

"کیا تم اس سے ملنا چاہتے ہو تو میں تم کو اس کے گھر لے چلوں؟"۔

سلی نے اسے آفر دی تھی

"نہیں نہیں۔ وہ خود آئے گا وہ ایک ڈاکٹر ہے اس کی روٹین اور مصروفیت ہم سے الگ ہوتی ہے۔"

خطیب نے سرعت سے کہا تھا۔

"کیا ہم انسٹی ٹیوٹ جایا کریں؟ ڈی سوزا ہر روز مجھے تحریک دیتی ہے۔"

"کیوں نہیں اچھی لڑکی۔ ہم ضرور جائیں گے،" وہ سلی کی خاطر مسکرایا تھا۔ اس نے سلی کی خاطر حامی بھی بھر لی تھی۔ اسے سلی زندگی کی طرف لوٹتی نظر آرہی تھی

اپنا سارا گھر برباد ہوتا دیکھ کر اپنی زندگی کے اس شکستہ موڑ پر خطیب کو سلی کا اور اپنا حال ایک جیسا لگتا تھا اس کا بھی خاندان کھو گیا تھا اور سلی کا بھی خاندان کھو گیا تھا۔

دونوں اپنے پیاروں کی قبروں پر رو بھی نہیں سکتے تھے۔ زندگی درد کے ساتھ ہی مگر آگے بڑھنے لگی تھی۔ کیا یہ کم تھا کہ سانسیں چل رہی تھیں اور صبح اور شام ایک خاص رفتار سے گزر رہے تھے۔ اگلے دن کا سورج روشنی اور تمازت لے کر آیا تھا۔ سلی حقیقت میں اپنے اسکول (لینگویج انسٹیٹیوٹ) جانے کے لیے خطیب کی منتظر کھڑی تھی۔: اس نے ڈی سوزا کو بھی میسج کیا تھا اور اس کے دونوں ہمدرد دوست اس کے ساتھ اسکول جانے کے لیے تیار تھے۔ ان کی یہ خوشی ان کے چہرے سے کھلی پڑ رہی تھی۔ وہ تینوں ایک ساتھ اسکول جا رہے تھے وہ ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے کسی کی بھی زندگی میں کوئی زلزلہ نہیں آیا تھا۔

اسکول میں بہت سارے دوستوں نے ان کو ویلکم بیک کی اسمائل دی تھی۔ اور وہ پورا دن اور آنے والے بے شمار دن سبک خرامی سے گزرنے لگے تھے مگر سلی کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ پھر ایک دن اس نے خداداد کی کلاس کے باہر کھڑے ہو کر اس کا انتظار کیا تھا۔ تب وہ لیکچر سن رہا تھا

اندر سے آواز آ رہی تھی

خلیل جبران کی کوئی نظم پڑھی جا رہی تھی۔

"اولاد"

تُمھارے بچے تمھارے بچے نہیں ہیں

ان کو تو زندگی نے خود اپنے تسلسل کی خاطر جنم دیا ہے

تُم ان کے دُنیا میں آنے کا ذریعہ ضرور، مگر وجہ ہرگز نہیں ہو

اور گو کہ وہ تمھارے ساتھ رہتے ہیں، مگر تُم اُن کے مالک بالکل نہیں

تُم اپنی ساری محبت اُن پر وار سکتے ہو، مگر اپنی سوچ ان کو نہیں دے سکتے

کہ وہ اپنے خیالات کے خالق و مالک خود ہی ہیں

تُم ان کے جسموں کو اپنے پاس رکھنے پر قادر سہی، مگر اُن کی روحیں آزاد ہیں

اُن کی روحیں مستقبل کے مکانوں کی مقیم ہیں
اور مستقبل کی ان آماجگاہوں کا تصور تُم اپنے خوابوں میں بھی نہیں کر سکتے
تُم ان جیسا بننے کی کوشش تو کر سکتے ہو
مگر انہیں اپنے جیسا بنانے کی حماقت مت کرنا
کہ زندگی کا پہیہ آگے کی طرف چلتا ہے نا کہ پیچھے کی طرف، اور نا ہی اِس کی فطرت میں ایک جگہ رُک کے رہنا ہے
تُم اِک کمان کی طرح ہو، جس میں سے تمھاری اولاد تیر کی طرح نکل کر وقت کے دھارے میں شامل ہوتی جاتی ہے۔
تمھارا خالق، تمھارا تیر انداز، تمھارے تیروں کے لئے لامحدود مستقبل میں طے کردہ اہداف دیکھ سکنے پر قادر ہے
وہ تیروں کو اپنے ہدف تک پہنچانے کے واسطے تُم پر، جو اُسکی کمان ہو، کچھ سختی بھی روا رکھتا ہے
کہ وہ تیروں کو دور، اپنے اہداف کی طرف سبک انداز سے بھیج سکے
تُم اپنے تیر انداز کو اجازت دو کہ وہ اپنے ہاتھوں کی مضبوطی تمہیں استعمال کرنے میں برت سکے کہ تیر انداز کے لئے تیروں کا اپنے ہدف کی طرف بڑھنے کا نظارہ اتنا ہی پرلُطف ہے جتنا اپنی کمان کو کار آمد دیکھنا"۔

اس نے نظم کے خاتمے کا انتظار کیا۔
اور کلاس ختم ہوتے ہی خداداد کو اشارہ دیا۔
خداداد اچانک گھبرا گیا تھا۔ اسے واضح محسوس ہوا تھا خداداد کے چہرے کا رنگ بدلا ہے
اس نے سنبھل کر مسکرانے کی کوشش کی تھی۔
مگر سلی تو مسکرا بھی نہیں سکی تھی۔
"ہشام کہاں ہے؟"۔

سلی کو لگا تھا اس کی اپنی بازگشت دور دور تک سنائی دے رہی تھی

"میں جانتی ہوں وہ لوٹ آیا ہے۔"

خداداد سن ہو گیا تھا

"تمہاری خاموشی کے پیچھے جو حقیقت ہے وہ سننے آئی ہوں۔"

"تم نے خطیب سے کیوں نہیں پوچھا۔"؟

خداداد نے جواب دیا۔

"تم سے جو پوچھ رہی ہوں۔" سلی کا لہجہ سرد تھا

"وہ مصروف ہے۔تم سے خود ملے گا۔"

اس نے جواب دیا تھا

اور بیچ میں ایک طویل چپ نے چادر تان لی تھی کوئی بواریا کے اس عظیم انسٹی ٹیوٹ کی گرین گھاس پر بیٹھی بوارین لوکل سنگر گا رہی تھی

تم زندگی کے کتنے برس جی چکے ہو

اور تُم کس فیشن کے کپڑے پہنتے ہو

تمھاری جسامت کیسی ہے

یا پھر تمھارے بالوں کی رنگت کیا ہو چکی ہے

یہ سب تُمھاری پہچان نہیں!

تُمھارا نام بھی تُمھارا تعارف نہیں

اور ہنستے وقت جو تمھارے گالوں میں گڑھے پڑھتے ہیں وہ بھی نہیں

تمھارا تعارف تو وہ سب کہانیاں ہیں جو تُم نے کہیں پڑھی ہیں

یا وہ الفاظ ہیں جن کا انتخاب تُم نے اپنے اظہار کے لئے کیا ہے

صبح آنکھ کھلنے کے فوراً بعد تمھاری بھدی، کھردری آواز تمھارا اصل ہے

یا وہ ہنسی ہے جسے تُم ہونٹوں میں دبانے کی کوشش کرتے ہو
تُم اپنے قہقہوں میں چُھپے لُطف وشوخی کا پیکر بھی ہو
اور اپنی آنکھ سے ٹپکے ہر آنسو کا عکس بھی
تُم اُن سب گیتوں کی بازگشت ہو
جو تُم نے کبھی اکیلے، بلند آواز اور بے فکری سے گا؟ ہیں
تُم اُن رستوں کا تعارف ہو جن پر تُم نے سفر کیا ہے
اور اُن منازل کا پتہ ہو جن کو تُم نے اپنا مسکن چُنا ہے
تُم ہر اُس سچ کا حصہ ہو جسے تُم ایمان سمجھتے ہو
اور ہر اس شخص کا بھی جِس سے تُم نے مُحبت کی ہے
تمھارے بیڈ روم میں ٹنگی تصویریں تمھیں بیان کرتی ہیں
اور تمھارے مستقبل کے ارادے تمھارے حوصلوں کا پتا دیتے ہیں
تُمھارا وجود خوبصورتی کے انمول خزانے سے اُٹھا ہے
مگر لگتا ہے کہ شاید تُم یہ سب بھول چکے ہو
کہ تُم نے اپنے تعارف کے لئے وہ سب حوالے چُنے ہیں
جو ہرگز تمھیں بیان کرنے کے لائق نہیں
اور خاموشی بولتی رہی
تمام سچائیاں ایک بھیانک حقیقت بن کر ناچتی رہیں
"وہ مجھ سے ملنے نہیں آیا۔""؟
اس نے آنسو پی لیے تھے
"اس کو مجھ پر گزرنے والی واردات کا شاید نہیں پتہ۔" نا چاہتے ہوئے بھی وہ رو پڑی تھی
"تم کو حوصلہ کرنا ہوگا سلی۔" خداداد کو بولنا پڑا

"دیکھو خطیب کی طرف کہ وہ کس قدر زخمی ہے مگر جی رہا ہے انسان کو جینا پڑتا ہے زندگی میں سب کچھ حاصل نہیں ہو جاتا۔"

وہ اسے سمجھا رہا تھا

"وہ سب ٹھیک ہے۔میں کوشش تو کر رہی ہوں۔" وہ ضبط سے بولی تھی

" مگر ہشام آیا کیوں نہیں۔"؟

"تم جانتی ہو نا وہ ایک ڈاکٹر ہے۔وہ اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر ضرور آئے گا وہ تم کو اس برے وقت میں کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔"

وہ اسے تا دیر سمجھا تا رہا تھا

" کیا یہ ممکن ہے ہم دونوں اس سے ملنے خود چلے جائیں۔"

سلی نے کسی آس سے پوچھا تھا

"یہ ممکن تو ہے مگر مجھے کچھ کام ہے ہم جلد اس سے ملیں گے۔ ." صاف نظر آ رہا تھا کہ خدا داد ٹال رہا ہے مگر سلی کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا

وہ نا چاہتے ہوئے بھی مان گئی تھی

جب وہ گھر کے راستے کی طرف گامزن تھی۔اس کا دل آزردہ تھا۔ایک ایسی بے سکونی تھی جو محبت کرنے والوں کو محبوب کی طرف سے اکثر لاحق رہتی تھی

آج رستے بھی اداس تھے کئی دنوں بعد بھی یہ جانے مانے رستے آسودہ نظر نہیں آ رہے تھے

رابرٹ فراسٹ کی ایک نظم کو سوچتے ہوئے وہ اس دوہری تکلیف میں مبتلا تھی جو اس کے ضمیر اور پیٹ نے اٹھا رکھی تھی

زرد جنگل میں دو راستے ہو رہے تھے جدا،

اور افسوس دونوں پہ چلنا تو ممکن نہ تھا

مجھ کو ہونا تھا بس ایک ہی کا مسافر، میں دیکھا کیا

دیر تک ایک کو حدِ امکان تک
وہاں تک جہاں ،ہو رہا تھا وہ خم کھا کے جنگل میں گُم ؛
میں نے پھر دوسرے کو لیا، وہ جو اُتنا ہی خوش رنگ تھا،
مدعی بھی زیادہ تھا شاید،
کہ تھی اُس پہ گھاس اور وہ قدموں کی طالب تھی ؛
گو اُس جگہ آمدورفت سے
دونوں یکساں ہی پامال تھے،
اور اُس صبح دونوں پہ تھے
راہگیروں کے قدموں سے محفوظ پتے۔
میں نے پہلے کو چھوڑا کسی اور دن کے لیے!
گو کہ معلوم تھا کیسے اک راہ سے دوسری رہ نکلتی ہے،
اور واپسی کتنی دشوار ہوتی ہے۔
میں بیاں کر رہا ہوں گا اک آہ بھر کے
کہیں آج سے سالہا سال بعد:
ایک جنگل میں دو راستے ہو رہے تھے جدا، اور میں۔۔۔
میں نے وہ چُن لیا جس پہ کم آمدورفت رہتی رہی،
اور اِسی بات نے فرق ڈالا تمام۔
جب وہ گھر کے قریب پہنچی تو اس کی دور کی پڑوسن نے اس کو دیکھ کر کراہیت سے منہ موڑ لیا اور اس کی ساتھی لڑکی نے اسے ٹہوکا دے کر پوچھا تھا
"کیا یہ وہ ہی ہے؟"۔
دوسری نے اشارے کی جگہ اپنی زبان سے اسے زخم دیا

''ہاں یہ وہ ہی ہے جس کی بے شرمی نے اس کا پورا گھر کھا دیا۔اور یہ پھر بھی زندہ ہے۔"

اس کے انداز میں اتنی نفرت تھی کہ سلی اس نفرت سے سن ہو رہی تھی

''اسے تو سوسائیڈ کر لینی چاہیے تھی۔"

'' مگر یہ کہ مرتے تو غیرت مند لوگ ہیں۔"

وہ دونوں اس کا استہزا اڑا رہی تھیں

''تو کیا یہ اپنے بوائے فرینڈ کا بچہ نہیں جنے گی؟"۔

"پہلی والی نے مزہ لیا تھا

"اس کا تو ریپ ہو گیا تھا"

سلی کو لگا تھا اس کے تمام زخم ادھڑ گے تھے۔

''تو اس کا بوائے فرینڈ کدھر گیا ہے؟"۔

"چھوڑ گیا ہوگا ایسی لڑکیوں کے ساتھ کون رہ سکتا ہے؟"

اور سلی کا سارا بدن ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔اس نے اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے تھے۔میری آبرو ریزی میں تو جو چاہے بکواس کر میری خاموشی کمینوں کا جواب ہوتی ہمیں کبھی بھی عدیم الجواب نہیں ہوتا مگر یہ مناسب نہیں کہ شیر کتوں کو جواب دے

اسکے موبائل پر ایک میسج آیا تھا

اس نے دھندلی آنکھ سے اسکرین کی طرف دیکھا تھا اور اس کا دل جیسے لرز گیا تھا۔آج اتنے دن بعد اس کے مسیحا کا پیام آیا تھا صلی جیسے باؤلی سی ہو گئی تھی

تمہارے وجود کا ہر ذرہ: مجھے اپنے وجود کی طرح پیارا ہے ؟ اور تمہارے ہر درد و غم میں یہ مجھے ایسے ہی پیارا رہے گا۔تمہارا ضمیر میرا خزانہ ہے ؟ گر یہ شکستہ و چور ہے تو پھر بھی یہ میرا خزانہ ہی ہے...

in pain and :Every atom of your flesh is as dear to me as my own sickness it would still be dear. Your mind is my treasure, and if it were

broken, it would be my treasure still...

Charlotte Brontë Jane Eyre

Sender doctor hasham

اور سلی کو لگا تھا جیسے ہشام اس کے زخم چننے کو بہت دور بیٹھ کر بھی اس کا درد پورا محسوس کر رہا ہے

سلی کے اندر ایک امید جاگی تھی ۔اور وہ جیسے ہر درد سے آزاد ہو کر اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی اس کے اندر مایوسی نہیں تھی مگر ایک عزم دیکھائی دیتا تھا

آج وہ گھر جانے کی بجائے اپنے پیاروں کی قبروں پر گئی تھی ۔اور پھر باڑے کی طرف آئی

اس نے دیکھا کہ ڈی سوزا اس کے بچ جانے والے جانوروں کی دیکھ بھال کر رہی تھی ۔

سلی نے بہت ہی اچانک حادثاتی طور پر اپنے سارے پیارے کھو دیے تھے ۔ابھی وہ اٹھارہ سال کی نہیں تھی کہ اکیلے زندگی گزارنے کا حوصلہ رکھ پاتی ۔

اس نے پے در پے بہت سارے دکھ اٹھائے تھے ۔اس نے اپنی زندگی کا بھیانک وقت دیکھا تھا جب اس کے سارے ہی اپنے چند ہی دن کے اندر بھیانک موت کا شکار ہو گے تھے ۔اس کے ساتھ ہونے والے اس حادثے کے پیچھے وہ ہی ایک شیطان تھا جسے سلی کبھی نانا کہا کرتی تھی ۔ بروز وایک ذلیل آدمی تھا

جو اس کے ڈیڈی ڈینئی وادادادی اور سارے ہی رشتوں کو کھا گیا تھا ۔

وہ آج قبرستان گئی تھی اور پھر بہت سارا رونے کے بعد اس کا دل ہلکا ہو گیا تھا جب وہ باڑے میں آئی تو ڈی سوزا کو ادھر کام کرتے دیکھ کر اسے حیرت نہیں تھی

سلی جانتی تھی کہ اس دنیا میں ڈی سوزا کے علاوہ کوئی اس کا مخلص دوست موجود نہیں ہے ایک ڈی سوزا ہی تھی جس نے اسے سنبھال رکھا تھا ۔

اس کی آنکھ میں احساس تشکر کے آنسو تھے ۔

"سلی !تم یہاں کیوں آئی ہو؟---

"میں نے سوچا تمہاری مدد کروں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔تم تیار ہو جاتی۔ہماری اپائنٹمنٹ تھی آج۔"۔۔۔

ڈی سوزا نے کسی گائنا سے سلی کے لیے وقت لے رکھا تھا۔۔۔

"ہاں تو ہم مل کر چلتے ہیں مگر کام ختم کر کے۔" سلی نے اسے جواب دیا

" مگر تمہاری صحت اچھی نہیں۔"

"میں بہتر ہوں میری جان۔" وہ اس کے ساتھ چارہ کٹواتی رہی تھی

" کل میں پنیر بناؤں گی اور دادی کی بیکری بھی کھولوں گی۔"

سلی کے الفاظ اسے خوشی دے رہے تھے

"میں تمہاری مدد کروں گی۔"

ڈی سوزا نے محبت سے کہا تھا

☆......☆......☆

جبران خلیل جبران نے کہا:

اپنی آنکھوں سے مجھے پیار نہ کرو، ہو سکتا ہے تم کو مجھ سے زیادہ خوبصورت مل جائے، لیکن مجھے اپنے دل سے پیار کرو کیونکہ دل کبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

نزار قبانی نے اسے جواب دیا اور کہا:

اور جان لو کہ محبت یہ نہیں ہے کہ محبوب عیب سے خالی ہو، بلکہ یہ ہے کہ محبوب اپنے عیبوں کے باوجود محبوب رہتا ہے۔"

اس کا دل آج کل ایسے الفاظ پڑھ کر رک جاتا تھا یا پھر وہ خود ساختہ تقویت لینے کی کوشش کرتی تھی۔

وہ ڈی سوزا کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جا رہی تھی دراصل وہ دونوں اس عفریت سے جان چھڑوانا چاہ رہی تھیں جس کی وجہ سے سلی ایک تکلیف ایک بوجھ کا شکار تھی۔ خطیب ان کا مددگار تھا اور ان کے ساتھ ہی جا رہا تھا

جب وہ ٹرین میں بیٹھ رہی تھیں تو کوئی پاس ہی گنگنا رہا تھا

تمھارے پاس بھی فرصت کا پل نہیں ہوگا

تو مسئلہ یہ محبت کا حل نہیں ہوگا

ہزار سوچیے ترکِ تعلقات مگر

یہ جانتے ہیں کہ ہم سے عمل نہیں ہوگا

ہمارے درمیاں خاموش گفتگو ہوگی

سماعتوں میں کسی کی خلل نہیں ہوگا

ہمارے بعد محبت کا قحط پڑنا ہے

جہاں کے پاس ہمارا بدل نہیں ہوگا

کسی نے سچ ہی کہا تھا

"اگر آپ نے اپنے ذہن میں ایک تصوراتی شخص بنایا ہوا ہے کہ ایک دن "وہ" آپ کی زندگی میں آئے گا اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا تو یہ محض ایک خود فریبی ہے۔"۔

ڈی سوزا اور خطیب کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے مگر سلی ان کو سن سکتی تھی

"کسی انسان سے محبت کریں تو اتنی شدت سے کریں کہ نہ اظہار کریں نہ کچھ کہیں مگر آپ کے جذبوں کی کشش اسے آپ سے کبھی دور نہ ہونے دے کسی کو پابندیوں میں جکڑنے سے بہتر پابند ہو کر رہنا سیکھ لیں سامنے والا خود آپ میں قید ہو جائے گا۔۔۔ محبت کا فلسفہ بہت انوکھا ہے لوگ سوچتے ہیں کسی کی سوچوں پہ قابض ہونا محبت ہے جبکہ میرا ماننا ہے کہ کسی کے دل پہ دسترس رکھتے ہوئے اس کے دماغ کو خود سے آزادی دے دینا محبت ہے انسان کی محبت نمو اس وقت تک ہی پاتی ہے جب تک اسکی سانسوں سے دل تک محبت کا آزادی سے سفر ہوتا رہے۔۔۔ جب تک یہ سفر جاری رہے گا تب تک تعلق کبھی (وینٹی لیٹر) پہ نہیں آئے گا اور اگر بدقسمتی سے آ بھی جائے تو یاد رکھیں خود پہ ہر الزام لیکر محبوب کو فاتح قرار دینا مت بھولیے گا۔۔۔ یہی محبت کی معراج ہے۔۔۔"

ایسی بٹن بس ڈی سوزا ہی کر سکتی تھی۔ سلی نے سر کو جھٹک کر خود کو ریلیکس کیا تھا۔ آج نجانے کیا ہونے والا تھا؟ وہ اس بوجھل پن الٹی اور تکلیف سے آزاد ہونے جا رہی تھی جو بروز وکی مرہون منت تھی ۔زندگی ایک فلم کی طرح نہیں ہے کہ کہانی کے آخر میں ولن مر جائے گا اور سب کچھ اچھا اچھا ہو جائے گا۔

کوئی انسان کتنا بھی اچھا ہو یا کتنا بھی برا، ایک خاص مدت کے بعد اس کا راستہ ہم سے الگ ہو جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس شخص کا آپ انتظار کر رہے ہیں وہ آپ خود ہی ہیں۔"

ایسی گفتگو ڈی سوزا جیسے فلاسفر ہی کر سکتے تھے۔ اور خطیب بھلا کیا سوچ رہا ہو گا؟ کہ وہ فنڈنگ اکھٹی کر سکے اور غزہ میں بچ جانے والوں کی کوئی مدد کر سکے

سلی سوچ رہی تھی کہ اس کی زندگی اس بوجھ سے آزاد ہو جو اس نے زبردستی کا اٹھا رکھا تھا

☆......☆......☆

شافیہ نے ایک سنہری صبح کو چمکتے دیکھا تھا۔ وہ اس حسین سویر کی کتنی جلدی عادی ہو گئی تھی۔ وہ اس سفید گھر میں اکیلی مالکن تھی اس کا مالک تو رات رات بھر ہسپتال میں رہتا تھا دن کو سوتا شام کو جم جاتا اور رہی شافیہ تو وہ اس نگر میں اتنی آزاد تھی کہ اس آزادی کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس صبح اس نے پیر نصیر کا کلام سسٹم میں لگا دیا تھا تاکہ گھر میں گونجتی آواز اس کی تنہائی کو کم کر سکے

میری زندگی تو فراق ہے، وہ ازل دل میں مکیں سہی
وہ نگاہِ شوق سے دور ہیں رگِ جاں سے لاکھ قریں سہی

ہمیں جان دینی ہے ایک دن وہ کسی طرح، وہ کہیں سہی
ہمیں آپ کھینچیے دار پر جو نہیں کوئی، تو ہمیں سہی

غم زندگی سے فرار کیا یہ سکوں کیوں، یہ قرار کیا
غم زندگی بھی ہے زندگی، جو نہیں خوشی تو نہیں سہی

سر طور ہو، سر حشر ہو، ہمیں انتظار قبول ہے
وہ کبھی ملیں، وہ کہیں ملیں، وہ کبھی سہی وہ کہیں سہی

نہ ہو، ان پہ جو میرا بس نہیں کہ یہ عاشقی ہے ہوس نہیں
میں انہیں کا تھا، میں انہیں کا ہوں وہ مرے نہیں، تو نہیں سہی

مجھے بیٹھنے کی جگہ ملے، مری آرزو کا بھرم رہے
تری انجمن میں اگر نہیں، تری انجمن کے قریں سہی

ترے واسطے ہے یہ وقف سر، رہے تا ابد ترا سنگ در
کوئی سجدہ ریز نہ ہو سکے تو نہ ہو، مری ہی جبیں سہی

مری زندگی کا نقیب ہے نہیں دور، مجھ سے قریب ہے
مجھے اس کا غم تو نصیب ہے، وہ اگر نہیں تو نہیں سہی

جو ہو فیصلہ وہ سنائیے، اسے حشر پر نہ اٹھائیے
جو آپ کریں گے ستم وہاں، وہ ابھی سہی، وہ یہیں سہی

اسے دیکھنے کی جو لو لگی نصیر، تو دیکھ ہی لیں گے ہم
وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پردہ نشیں سہی

☆......☆......☆

سلی نے باہر بھاگتے منظر میں دادی کو ڈھونڈنا چاہا تھا۔اس کی دادی کتنی جلدی مرگئی تھی۔ہاں مر تو وہ تب ہی گئی تھی جب سلی کو اپنے ہی گھر میں ایک پالتو کتے نے ریپ کا نشانہ بنایا تھا۔مر تو وہ تب ہی گئی تھی جب سلی کو ہسٹریا کے دورے پڑنے لگے تھے۔مر تو وہ تب ہی گئی تھی جب اس کی کنواری پوتی ایک حرامی آدمی سے حاملہ ہو گئی تھی۔

اتنی بار مرنے والا انسان زیادہ تکلیف سے مرتا ہے۔کتنا اچھا تھا کہ دادا ڈینی اور ڈیڈی یک مشت ہی مر گئے تھے۔اسے دادی بہت یاد آتی تھی مگر اپنے زخم زیادہ درد دیتے تھے۔یہ وہ معاشرہ تھا جہاں رشتوں کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔

رات کو سب سو رہے ہوتے تھے گھر کا کوئی فرد چل بستا صبح اسے سروس والوں کے حوالے کر کے لوگ اپنے کام کاج پے نکل جاتے تھے وہ سلی بھی اسی بے حس معاشرے کی پیداوار تھی مگر اس کی فطرت میں بہت حساسیت تھی۔

قسط نمبر 17

اکثر سلی کو اپنے پیاروں کی یاد ستاتی تو وہ اس مخصوص جگہ پے جاتی تھی جہاں مسلمانوں کے مردے دفن کیے جاتے تھے۔یہاں صرف اسے اپنی دادی کی قبر سے لگاؤ تھا۔باقی کون تھے اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔سلی کی زندگی میں ان کا تعلق بس اتنا ہی تھا کہ وہ جب تک موجود تھے بس نام کے رشتے تھے۔ان کے مصرنے کے ساتھ ہی یہ تعلق ختم ہو گیا تھا سلی کو دادی کے مرنے کا کبھی یقین نہیں ہوتا تھا اسے لگتا تھا کہ دادی اپنی قبر میں مری نہیں ہے وہ زندہ ہے اور سلی کی منتظر ہے دادی کی موت تو بلکل ہی اچانک تھی وہ سارا دن اپنے معمول کے کام کرتی رہی۔پنیر بنایا اسے بیکری پے فروخت بھی کیا اور کچھ جمع پونجی نکال کر کسی ڈاکٹر سے مشورہ بھی لینے چلی گئی تھی ہاں دادی چاہتی تھی کہ سلی کو اس زبروستی کے بوجھ سے نجات دلا سکے۔اور وہ آزاد زندگی کی شروعات کر سکے

آج بھی دادی کی قبر پر ہاتھ پھیر کر روتی ہوئی سلی کو یاد آ رہا تھا کہ اب تین ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔اور ابھی تک وہ کسی بھی ڈاکٹر تک رسائی حاصل نہیں کر سکی۔دادی کو سوچتے اس کو اچانک خیال آیا تھا کہ دادی کہیں زندہ ہی نا ہو

کیا کوئی سوتا سوتا بھی مر سکتا ہے؟

اپنے بستر پر اتنی نے سانس جیسے کبھی سانس لیا ہی نا ہو

اسے اکثر ایک لکھاری کی تحریر یاد آتی تھی

جب بھی وہ دادی کی قبر پے آتی تو اسے عظیم لکھاری پو یاد آنے لگتا تھا

"زندہ موت۔بدن جُدا ہوتے ہیں، دل مگر جُدا نہیں ہوتے"

(موت کی آغوش میں سو کر بیدار ہونے والوں کا احوال، زندہ دفن ہونے والوں کی داستانیں، ایڈگر ایلن پوُ کے جنونی قلم سے)" یہ کتاب اس نے دادی کے مرنے سے بہت پہلے پڑھی تھی

مَر کر کوئی دوبارہ زندہ نہیں ہوتا نہ کسی کو خوابوں، خیالوں، اور یادوں کے سوا کہیں نظر آتا ہے (معجزہ اور خرق معمول کے چندہ واقعات اس سے مستثنیٰ ہیں) مگر جب کوئی مرا ہی نہ ہو تو وہ آپ کو یقیناً دوبارہ نظر آسکتا ہے، حرکت کرتا، بولتا، چلتا؛ مگر ٹھہریے!! اگر آپ نے ایک زندہ شخص کو مردہ جان کر دفنا دیا ہو اور پھر وہ آپ کو دوبارہ زندہ ملے تو آپ کی حالت کیا ہوگی؟

دنیا کی طبی یادداشتوں اور میڈیکل ریکارڈز میں ایسے کئی واقعات درج ہیں کہ جب مریض کو مردہ جان کر دفنا دیا گیا، جبکہ اس کی روح ابھی باقی تھی (ایسا اکثر سکتہ، قومہ، عارضی سکتہء اعصاب یا وقتی بندش قلب کے علاوہ ہزاروں نامعلوم وجوہات کے سبب ہوسکتا ہے)۔ اور پھر ایسے واقعات منظر پر تب آتے ہیں جب مریض کو قبر میں زندہ محسوس کیا جاتا ہے یا کسی حرکت و آواز کے سبب اس کی زندگی کا پتہ معلوم ہو جاتا ہے۔ جو لوگ تو زندوں کے ادراک میں آکر قبر سے باہر نکل آئے فبہا۔۔۔ اور جو نہ نکل سکے۔۔۔ تو ان کی اذیت کا گمان بھی ہم شاید نہ کر سکتے ہوں۔

کوئی دو مہینے پہلے کی کسی طویل رات کا ذکر ہے کہ اس کی دوست سوزانے سونے سے پہلے اسے ایک کتاب دی تھی جس میں پیرانارمل واقعات درج تھے جو کہ شاید اس کی زندگی کا حاصل اور ذوق ادب کا تنہا سامان تھے۔۔ اس نے ایک آپ بیتی پیش کر دی تھی۔ تب اس لمحے ایڈگر ایلن پو کی ایک کہانی اسے یاد آئی جو گزشتہ برس کے مارچ میں بھی سلی نے پڑھ رکھی تھی۔

دادی کی قبر کی نم مٹی کو چومتے ہوئے اس نے۔ پو کے افسانوں اور شاعری کو سوچا تو سب کچھ پردہ اسکرین پی روشن ہو گیا تھا

"The Premature Burial".

جن لوگوں نے پو کو پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ پو نہ صرف پیرانارمل، مسٹری، جاسوسی، تھرل اور ہارر فکشن کا بانی ہے بلکہ اس کا سحر آج بھی ان اَصناف ادب میں متاخرین لکھنے والوں سے کہیں بڑھ کر

ہے۔ اکثر کہانیوں میں پو تخیلات سے خوف پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر سورج پوری آب میں ہو تو وہ اندرونی کیفیات سے تاریک غار جیسا سماں پیدا کرتا ہے۔ مگر مذکورہ کہانی ایسی نہیں تھی۔ بلکہ پو نے لکھا ہوا تھا کہ۔ "یہ سب کچھ سچ ہے فکشن نہیں"۔

۔اس لیے پو نے ان واقعات کو سیدھا سیدھا بیان کیا ہے۔

اس نے گیلی مٹی کو ہتھیلی میں رکھا

"Truth is far stranger than fiction."

کہ اگلے الفاظ سوچ کر اس کی حیرت، حالت اور نظر تینوں گم گئے۔ شدید ٹھنڈی رات میں دادی کی قبر سے حرارت نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

" کیا آپ کبھی کسی کی حالیہ موت پر اس کی تدفین کے بعد اس کی قبر پر اس لیے گئے ہیں کہ کہیں وہ زندہ ہی نہ ہو اور اسے مردہ جان کر دفنا دیا گیا ہو۔"؟

کوئی ایسا اندوہناک کرب اور عجیب سلیقے کا بیان سن کر قاری کیا کر سکتا ہے؟

۔اس افسانے میں یوں تو تاریخ اور میڈیکل دستاویز سے کئی سچے واقعات سپرد قلم کیے گئے ہیں لیکن ایک کہانی تو جہاں بھر کا حیرت کدہ ہے۔ یہی کہانی اس کی یادداشت میں ابھر آئی تھی۔

کیا ضروری تھا چند قبروں کے بیچ بیٹھ کر ایسی کہانی کو سوچنا؟

"۔فرانس کے شہر پیرس کی ایک عالی نسب دوشیزہ جو مثل حسن اور جمال شہر تھی، اس پر ایک غریب ادیب اور صحافی عاشق ہو جاتا ہے۔ اپنی قابلیت سے وہ اہل پیرس کی آنکھوں کا تارا بھی بنتا ہے اور پھر اس عالی نسب محبوبہ کو بھی اپنے اس گمنام چاہنے والے کی خبر ہوتی ہے۔ مگر وہ اپنے اعلیٰ خاندان کے فخر میں ایک امیر بینک افسر سے شادی کرتی ہے اور وہ غریب قلم کار آنسو بہاتا خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ مگر ہر لمحہ وہ اس محبت کی یاد میں جیتا ہے۔ جب بھی اسے فرصت ملتی ہے وہ اس کے حالات جاننے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ یہ واقعہ پیرس شہر میں 1810ء میں پیش آیا تھا اور پو کے بیان پر نقل ہے کہ عین حقیقت اور سچ ہے۔

شادی کے بعد وہ امیر بینک افسر اس لڑکی کو اپنے برے رویے اور بے توجہ زندگی کا عادی بنا دیتا ہے۔ اس کی رعونت میں محبت کا کوئی جذبہ باقی نہیں بچتا۔ ہر سانس غم زدہ رہنے کے بعد اس پھول جیسی لڑکی کی صحت تباہ ہونے لگتی ہے۔ کئی روز بیمار رہ کر آخر وہ وقتی قومہ میں چلی جاتی ہے۔ اس کی حالت اور صحت اتنی خراب ہوتی ہے کہ ڈاکٹروں کا پورا یونٹ اسے معائنے کے بعد مردہ قرار دیتا ہے۔ رسمی کاروائی کے بعد پیرس سے کئی کلومیٹر دوری پر واقع اس کے آبائی گاؤں کے ایک قبرستان میں لے جا کر اس کے مردہ خیال کردہ جسم کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ اسی شام جب وہ زندہ دل عاشق یہ سنتا ہے تو جنون محبت اور بے کیف دیوانگی سے، سب کام چھوڑ کر وہ اس لڑکی کے گاؤں روانہ ہو جاتا ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ ایک بار اس لڑکی کا چہرہ دیکھ سکے، اس کو چھو سکے یا پھر اور کچھ نہ ہو تو قبر سے اس کی کوئی چیز (کپڑا یا بال وغیرہ) ہی نشانی کے طور پر اپنے پاس رکھ لے۔ اسے یہ غم ہر قدم ستاتا ہے کہ وہ اتنا غافل ہو گیا کہ اس کی محبوبہ غموں سے مر گئی اور اسے خبر بھی نہ ہو سکی۔

ایڈگر ایلن پو لکھتا ہے کہ، جب وہ مجنوں بیل گاڑی پر سوار، ہر سو پوچھتا، نشان ڈھونڈتا اس لڑکی کی قبر پر پہنچا تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ بڑی ہمت سے وہ قبر کھود کر تابوت باہر نکالتا ہے اور آنسو بہاتے ہوئے جب اس لڑکی کے کچھ بال اتارنے لگتا ہے تو وہ اپنی آنکھیں کھول دیتی ہے۔۔۔

یہاں پو جملہ معترضہ میں قاری سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

(اے پڑھنے والے! تو سوچ اگر اس عاشق ادیب کی جگہ تو ہوتا تو تیری حالت کیا ہوتی)۔

مگر وہ شخص لڑکی کو آنکھیں کھولتا دیکھ کر ذرا نہیں گھبراتا۔ وہ اس کی سانس محسوس کر کے اسے کمر پر اٹھاتا ہے اور پاس والی بستی سے جو طبی سہولیات ملتی ہیں اس رات وہ حاصل کرتا ہے۔ کچھ دن کی نگہداشت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ لڑکی خفیفی کے سکتہ سے حرکت میں آتی ہے اور اپنے پیارے محبوب پر دل و جان نچھاور کر دیتی ہے۔ وہ اپنے پہلے شوہر کے پاس واپس نہیں جاتی بلکہ اپنی آبائی جائیداد بیچ کر، اس قسمت کے دھنی کے ساتھ امریکہ چلی جاتی ہے۔

پو کا پیغام ہے کہ ایسے واقعات کو قابو میں کرنا انسان کے بس میں نہیں، اور نہ ہی میڈیکل اس پر تا

ابد پورا کنٹرول حاصل کر سکے گی۔ مگر ہم کو مردے اور قبر سے جو فطرتی خوف اور دوری ہے اسے ہم قابو میں کر کے، ہی اس المیے پر کوئی قابو پا سکتے ہیں۔

عشق اور محبت کے جذبے بغیر ایسا ممکن نہیں۔ اور ایک باذوق اور زندہ دل انسان کو چاہیے کہ وہ ہر انسان سے اپنے محبوب کی طرح ہی محبت کرے اور موت یا قبرستان کے بارے میں جو توہمات ہیں ان پر تحقیق کرے اور من گھڑت خیالات کو خود سے دور کر کے میت کے قریب رہے۔ موت اور قبر سے دنیا کی دوسری عام چیزوں کی طرح تعلق رکھے۔ اپنا عقیدہ اور عقل بیدار کرے کہ کبھی مردہ زندہ نہیں ہو سکتا، اور جو زندہ ہے وہ ابھی مرا نہیں۔ موت سے نظریں چرا کر آپ پوجیسے عظیم لکھاری کے شبدوں کے راز و اسرار نہیں جان سکتے۔۔۔"

اس لمحے سلی کو لگا کہ دادی بھی اس کی محبوب ترین ہستی یعنی اس کی محبوبہ ہیں تو کیا پتہ وہ قبر کے اندر زندہ ہو اور وقتی صدمے سے اچانک کومے میں چلی گئی ہو؟

اس خیال کے آتے ہی سلی نے قبر سے کان لگا کر دادی کی آواز دینی شروع کی تھی

"دادی؟"۔

اس نے دھیمی آواز سے پکارا

مٹی کی ڈھیری اس کی قسمت کی طرح منجمند تھی

سلی نے پھر آواز لگائی تھی

"دادی؟"۔

اندر سے مہیب چپ سنائی دی

"دادی! میں تمہاری سلسبیل ہوں۔" وہ جیسے دادی کو یاد دلا رہی تھی۔ کہ شاید دادی بھول گئی ہو دادی کتنا اچانک دنیا سے چلی گئی تھی۔ اتنی اچانک کہ سلی کو لگا یہ بلکل روزمرہ کا معمول ہو اور دادی باڑے سے اپنی بیکری تک جا رہی ہو

دادا ڈیڈی اور ڈینی کے جانے کا وہ شدید والا دکھ نہیں تھا جس قدر شدید دکھ دادی کے جانے کا تھا

"دادی؟"۔ سلی رونے لگی تھی وہ ٹوٹ ٹوٹ کر رو رہی تھی

"دادی اب نہیں ہیں سلسبیل"۔

کوئی اس کے بلکل پیچھے سے پکارا تھا۔ آواز اتنی قریب اور اتنی اپنایت بھری تھی کہ سلی کو لگا تھا اس کا دل مارے حیرانگی کے بلکل بند ہو جائے گا

مگر یہ دل کم بخت ابھی بھی دھڑک رہا تھا

"سلی۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ اس نے سلی کے شانے پے ہاتھ رکھا تھا

اب سلی کو یقین آ گیا۔ وہ کوئی الوژن نہیں تھا۔ وہ ایک زندہ حقیقت تھا۔ وہ اس کا خواب نہیں تھا

" کوئی دکھ دائمی نہیں ہوتا۔"

وہ اس کے کانوں میں امرت اتار رہا تھا

"میں بھی اس ماں کو دفنا کر آیا ہوں جو زندگی بھر میرا انتظار کرتی رہی۔ ہمیں اپنے دکھوں کو سنبھال کر زندگی میں آگے بڑھنا پڑتا ہے۔"

وہ اس کا شانہ سہلا رہا تھا جیسا کہ کسی بچے کو شفقت سے اس کا کوئی بڑا تسلی دے رہا ہو۔

"زندگی ورد مسلسل ہے۔ ہم بہت سارے رشتے کھو دیتے ہیں اور بہت سارے رشتے ہمیں میسر آتے ہیں۔ نئے تعلق دوست اور اکثر رشتے بھی۔ نا چاہتے ہوئے بھی ان کو نبھانا مجبوری بن جاتا ہے۔"

وہ اس کی ذات کے لیے شفا تھا امرت تھا سکھ تھا شانتی تھا وہ آ گیا تو جیسے سلی کی بے رنگ برباد زندگی میں سفید چشمے اتر آئے تھے۔ اسے لگتا تھا بر زخ اچانک گلزار ہو گے ہیں

"سلی! تم اس دنیا میں اکیلی درد نہیں اٹھا رہی۔ تم نے اپنے قریب نہیں دیکھا؟ اپنے آس پاس؟ کیا تم کو خطیب دیکھائی نہیں دیتا؟ اور خداداد؟ وہ کم سنی کے یتیم ہیں۔ اور وہ سب اپنی اپنی زندگی میں دکھ اٹھا کر پروان چڑھے ہیں۔ خطیب کا پورا خاندان اس کی نسل تمام ہو چکی ہے۔ پھر بھی زندہ ہے نا؟ اور ہم سب کہیں کہیں اپنی جان اور کہیں کہیں اپنے دلوں پر زخم کھائے ہوئے ہیں۔ مگر زندہ ہیں نا۔؟"

کوئی ایسے کسی کو تسلی دے سکتا ہے؟ اتنے پیار سے اتنی ملائمت سے

"تم بہت خوش نصیب ہونا سلی۔"

" مگر میں کیسے؟"۔ وہ ایک دم لگی تھی، اپنی بے وقتی کے احساس سے ٹوٹنے لگی تھی۔ وہ بری طرح رونے لگی تھی اس نے سلی کو رونے دیا تھا۔ یہ غبار دھل جاتا تو اچھا تھا

"میں کیسے خوش نصیب ہوسکتی ہوں۔" اس نے اپنے پیٹ کو دیکھا اسے خود سے کراہیت آئی تھی وہ ایک نفرت بھرے احساس سے لبریز ہونے لگی تھی۔

" تم ابھی بھی خوش نصیب ہو اس لیے کہ تم ابھی زندہ ہو زمین کے اوپر ہو اور بہت سارے تمہارے اردگرد رشتے موجود ہیں جو تم سے محبت کرتے ہیں تمہارا احساس کرتے ہیں۔" اس نے سلی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا وہ اس کا ہاتھ سہلا رہا تھا وہ اس کا محبوب تھا اور محبوب ہر رنگ میں کتنا حسین نظر آتا ہے یہ کوئی سلی سے پوچھتا۔

ندی شاعر درون آنند کہتا ہے

جھیلیں کیا ہیں ندی یں؟

اُسکی آنکھیں

عمدہ کیا ہے؟

اُسکا چہرہ

خوشبو کیا ہے؟

اُسکی سانسیں

خوشیاں کیا ہیں؟

اُسکا ہونا

تو غم کیا ہے؟

اُس سے جدائی

ساون کیا ہے؟

اُسکا رونا

سردی کیا ہے؟

اُسکی اُداسی

گرمی کیا ہے؟

اُسکا غصہ

اور بہاریں؟

اُسکا ہنسنا

میٹھا کیا ہے؟

اُسکی باتیں

کڑوا کیا ہے؟

میری باتیں

کیا پڑھنا ہے؟

اسکا لکھا

کیا سننا ہے؟

اُسکی غزلیں

لب کی خواہش؟

اُسکا ماتھا

زخم کی خواہش؟

اُسکا چھونا

دنیا کیا ہے؟

اک جنگل ہے

اور تم کیا ہو؟

پیڑ سمجھ لو

اور وہ کیا ہے؟

اک راہی ہے

کیا سوچا ہے؟

اُس سے محبت

کیا کرتے ہو؟

اُس سے محبت

مطلب پیشہ؟

اُس سے محبت

اس کے علاوہ؟

اُس سے محبت

اُس سے محبت

اُس سے محبت

"تم کہاں تھے۔"؟ سلی نے بھیگی آواز میں پوچھا

میں بہت دور تھا۔"

"اس میں کیا شک ہے؟ تم دور تھے تمہیں میری سسکی نہیں سنائی دی۔" سلی کی آواز میں شکوہ تھا

"میں ایک مصیبت میں تھا۔۔۔"

وہ مٹی کو کریدنے لگا

"تمہاری والدہ اس دنیا سے چلی گئیں۔"

"ہاں ان کا انتظار ٹھنڈا ہو چکا تھا ان کے جینے کا جواز ختم تھا۔"

وہ آہ بھر کے بولا۔

"جب جینے کا جواز نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہنا چاہتا۔" سلی کے انداز میں مایوسی تھی

"یہ حقیقت ہے۔"

"مگر تمہارے لیے نہیں۔ تم کو زندہ رہنا ہے نا۔ اپنے لیے نہیں۔ اس آزمائش کے لیے جو نا گہانی تھی۔"

تو کیا وہ اس پر بیتے درد سے غافل نہیں تھا؟

سلی کے اندر جیسے سکون کی ایک لہر اٹھی تھی۔

ایسے کیوں حیران ہو؟

اے میری بے چین روح؟"۔ اس نے گیلی مٹی سے جرمن میں محبت لکھا تھا۔ کبھی ایک دوسرے سے اظہار محبت نا کرتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو کوئی وعدہ نا دیتے ہوئے بھی ایک احساس سے جڑے یہ دونوں لوگ محبت کے اٹوٹ رنگ میں بندھے تھے یہ ایسا رنگ تھا جو اتر نہیں سکتا تھا

تم یہاں ہو

اور کہیں مت جاو

تم میری آخری سسکی تک ٹھہرو

اور مجھ سے کسی خوف زدہ شخص کی طرح لپٹ جاو

کہ کبھی ایک اجنبی سایہ تمہاری آنکھوں سے گزرا تھا

اب بھی ہاں ابھی بھی تم میرے لئے شہد آشام بنتی ہو

تمہارے پستانوں میں اس کی خوشبو رچی ہے

جس لمحے اداس ہوا تتلیوں کا قتل کرتے گزرتی ہے

میں تم سے محبت کرتا ہوں

میری مسرت تمہارے ہونٹوں کے میٹھے پھل چکھتی ہے
تم نے کس قدر میری عادی ہو جانے کا دکھ سہا ہو گا
میری وحشی تنہا روح
میرا نام جسے سب چھوڑ جاتے ہیں
کئی بار ہم نے صبح کے بجھتے ستارے کو
ہماری آنکھیں چھوتے دیکھا
ہمارے سروں پر مٹیالی روشنی کو ہوا میں ڈھلتے دیکھا
میرے الفاظ تم پر بارش بن کر برسے
طویل عرصے تک میں نے تمہارے بدن کے چمکتے سیپ سے محبت کی
میں اکثر سوچتا ہوں
تم میری ساری کائنات ہو
میں تمہارے لئے پہاڑوں سے مسکراتے پھول
نیلے سوسن؟ گہری دھند
اور بوسوں سے بھری ٹوکریاں لاؤں گا
میں تمہارے ساتھ وہ کرنا چاہتا ہوں
جو بہار چیری کے سفید درختوں سے کرتی ہے
پابلو نیرودا کی سرگوشیاں اس کے آس پاس تھیں اور وہ محبت کی چاندنی میں نہا رہی تھی
اس کی مجروح روح پر مسیحائی کرنے وہ مسیحا لوٹ آیا تھا
میں تو کسی پل بھی تم سے دور نہیں تھا۔ میں تو ہر پل تمہارا تھا۔ اور تمہارا ہی رہوں گا میں تمہارے ساتھ تھا اس وقت بھی جب ایک درندہ بروز و تم کو بھنبھوڑ رہا تھا میں تب بھی تمہارے درد کو سن رہا تھا میں تمہارے ساتھ تھا تمہارے آنسو صاف کرتا ہوا۔"

اور جیسے محبت کو کسی اور چیز کی طلب ہی باقی نہیں رہی تھی۔

"میں اپنے وجود کا آدھا حصہ کھو کے آیا ہوں مگر میں جتنا بھی بچا صرف تمہارا ہوں۔"

کسی اقرار محبت کی کیا کوئی ضرورت تھی؟ کیا سلسبیل کو کچھ اور چاہیے تھا؟

کیا زندگی سے کوئی گلہ رہ گیا تھا؟

"جب میں اپنی ماں کے پاس تھا بے شک وہ گنتی کے دن تھے مگر وہ کامل دن تھے۔ اور میں یقینی طور پر خوش تھا میں نے ماں کو دیکھا اسے محسوس کیا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا اس ہستی میں سب سے قیمتی وجود عورت کا ہے چاہے وہ کسی بھی روپ میں کیوں نا ہو۔" وہ آج اپنے دل کی باتیں کہنے آیا تھا اس مہیب خاموشی میں اس کی آواز جادو تھی نظم فرشتہء محبتمیں پروین اعتصامی نے کیا خوب جذبات کا اظہار کیا ہے

"جس گھر میں عورت نہیں ہے، وہاں محبت وشفقت نہیں ہے جس کا دل مرجائے، اُس کی روح بھی مرجاتی ہے

تقدیر نے کہیں بھی
مرد کو کامل اور عورت کو ناقص نہیں لکھا
عورت ازل ہی سے خانہ ہستی کا ستون ہے
بنیاد کے بغیر کون کوئی عمارت بنا سکتا ہے؟
عورت اگر زندگی کے راستے میں چراغ بن کر نہ جلتی
تو کوئی بھی ان تاریک راہوں کی منزل تک نہ پہنچ پاتا
اگر عورت کوہسار وجود پر سورج بن کر نہ چمکتی
تو عشق کے جوہری کو کان سے کوئی موتی نہ ملتا
عورت پیدائشی فرشتہ ہے
یہ وہ فرشتہ ہے جس پر شیطان طعنہ زنی کرتا ہے

اگر افلاطون اور سقراط عظیم ہیں

تو ان کو پالنے والی عظیم تر ہے

لقمان بچپن میں ماں کی گود میں بہت سویا

پھر دبستان حکمت میں پہنچا اور دانشور بنا

پہلوان ہو یا صوفی زاہد ہو یا فقیر

سب اسی مدرسے کے شاگرد ہیں

بن ماں کا بچہ محبت کی بات کہاں سے سیکھتا ہے؟

بادشاہ کے بغیر کسی سلطنت میں امن وامان اور نظم وضبط کہاں ہوتا ہے؟

اے دانشمند! تم جانتے ہو کہ عورت اور مرد کا فریضہ کیا ہے؟

ایک کشتی ہے اور دوسرا کشتی بان

ناخدا سمجھدار اور کشتی مضبوط ہو

تو موجوں بھنور اور طوفان کا کیا ڈر؟

حادثاتِ زمانہ کے سمندر میں، مصیبت کے دن

دونوں ہی سے سعی وعمل کی توقع ہوتی ہے

جو آج بیٹی ہے، وہی کل ماں بنے گی

بیٹوں کی عظمت ماں ہی سے وابستہ ہے

اگر اچھی عورتیں رفو نہ کرسکتیں

تو اچھے مردوں کے لباس پھٹے رہتے

مرد کا زادِ سفر کیا ہے؟ عورت کا ساتھ

عورت کا سرمایہ کیا ہے؟ بچوں کی محبت

اچھی عورت صرف گھر کی مالکہ ہی نہیں ہوتی

طبیب نرس، حاکم اور دربان بھی ہوتی ہے

اچھے دنوں میں محبت کرنے والی رفیق

اور برے دنوں میں خیر خواہ اور سہارا دینے والی

عقلمند عورت کسی کمی بیشی کی وجہ سے ناراض نہیں ہوتی

اچھا مرد بری باتوں سے زبان آلودہ نہیں کرتا

زندگی کا گھوڑا جب سرکشی پر اتر آتا ہے

تو کبھی مرد اس کو لگام دیتا ہے تو کبھی عورت

مرد ہو یا عورت، عظمت اور کامیابی اس کو ملتی ہے

جس کے دامن میں باغِ علم کے پھل ہوں

بازار ہنر اور کارگاہِ دانش میں

بہت ہی ساز و سامان ہے، چلو کہ اس کی تجارت کریں

جس عورت نے تعلیم و تربیت کا گوہر نہ خریدا

اس نے اپنی عمر عزیز کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دی

زندہ کہلوانے کی مستحق وہی ہے جس نے لباس فضل زیبِ تن کیا ہو

وہ نہیں کہ جس کی قدر و منزلت ہی نہ ہو

آسمان نے ہمیں معانی کے ہزاروں دفتر دیے

ہم نے ایک کے سوا سب پھاڑ ڈالے

جب دبستانِ خرد کھلا تو ہم کھیل کود میں لگ گئیں

جب فن نے جلوہ گری کی تو ہم چھپ گئیں

خود پرستی اور سستی کے شیطان کی بساط

فنا نہ ہوئی تو ہماری خیر نہیں

ہمارا وقت ہمیشہ انہی باتوں میں ضائع ہو گیا
کہ فلاں کپڑے کا یہ نرخ تھا اور فلاں جوتے کا یہ
ہم نے جسم کے لیے غرور کا زیور خریدا
ہم نے روح کے لیے لباسِ خسارہ سیا
تکبر میں ہماری روح کی دکان کا سامان گل سڑ گیا
جسم کے لیے ہم نے ہر طرف دکانیں کھول لیں
یہ رویہ، سربلندی نہیں، خرابی ہے
یہ سوچ، عزت نہیں، ذلت ہے
ہم سبزہ نہیں ہیں کہ یونہی ندی نالوں کے کنارے آ گئیں
نہ پرندہ ہیں کہ مٹھی بھر دانے دنکے پہ خوش رہیں
جب ہم اپنے موٹے جھوٹے کپڑے پر قناعت کر لیں تو پھر کیا غم
کہ حلب کا چغہ سستا ہے یا مہنگا؟
اغیار کے بنے ہوئے ریشم سے
اپنا ٹاٹ ہزار بار بہتر ہے
قبائے علم سے زیادہ قیمتی ملبوس کون سا ہے؟
دنیائے عرفان سے بہتر کون سا ریشمی کپڑا ہے؟
عقل کے چرخے کی ہرائی
عزم و ہمت کی کارگاہ میں ریشم بن جاتی ہے
گوشوارے، گلوبند اور مرجان کے کنگن کی وجہ سے
اپنے آپ کو برتر سمجھنے والی عورت، عورت نہیں ہے
چہرے پر فضل و کمال کا غازہ ہی نہیں ہے

تو زربفت کے کپڑوں کے رنگ اور زیورات کی چمک کا کیا فائدہ؟
پروین! اچھی عورت کی گردن اور ہاتھوں کی شایان شان
علم کے موتی ہیں، نہ کہ ہیرے، جواہر۔"

'ماں بڑا ہی حسین احساس تھا مگر جلدی جدا ہوگیا۔" وہ اس دکھ کے اندر ملیا میٹ ہوا۔ یہ دکھ اس کا دائمی دکھ تھا

اس کی ماں اس کے لیے حقیقت میں ایک دیوی تھی جو ساری عمر ایک مسند پہ بیٹھی اس پر مہربان رہی تھی۔

"ماں نے عمر بھر مجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ جاتے سمے مانگا بھی تو میرا اپنا آپ۔ ماں جان بھی مانگتی تو انکار نا کرتا یہ تو پھر میرا وجود تھا جس نے ایک دن فنا ہو جانا تھا۔"

وہ بولتا رہا اور رات ڈھلتی رہی۔۔۔

"ماں نے کہا۔ یہ لڑکی ہے مجھ پر ساری زندگی مہربان رہی۔ تم اس کا ساتھی بن جاؤ۔ اور اس پر مہربان رہو۔ اور میں احسان فراموش نہیں تھا۔ میں نے ماں کی بات مان لی۔ میں ادھورا ہوں مگر جتنا ہوں اسے کافی سمجھنا۔" شاید اس کے پاس اب الفاظ ختم ہو گے تھے

خلیل جبران کہتا ہے

عورت کا دل اس بیاباں کی طرح ہے جسے مرد اپنی جنگوں اور قتل و غارت کے لیے بطور میدان استعمال کرتا ہے، اس کے درختوں کو اکھاڑ پھینکتا ہے، اس کی جڑی بوٹیوں کو جلا دیتا ہے، اس کے پتھروں کو خون آلود کرتا ہے، اور اس کی مٹی میں ہڈیوں اور کھوپڑیوں کو ہموار کرتا ہے، لیکن وہ دل پرسکون اور مطمئن رہتا ہے۔ موسم بہار میں اس میں بہار رہتی ہے اور موسم خزاں میں خزاں، وہ دل گزرتے وقت کے ساتھ ایسا ہی رہتا ہے.

عورت کا دل نہ وقت کے ساتھ بدلتا ہے اور نہ موسموں کے ساتھ بدلتا ہے۔ وہ دل مقابلہ کرتا رہتا ہے، مگر دم توڑتا نہیں۔

نزار قبانی کہتا ہے

کیا آپ کو کوئی شک ہے کہ آپ دنیا کی سب سے خوبصورت اور دنیا کی سب سے عظیم خاتون ہیں؟

کیا تمہیں شک ہے کہ جب میں نے تمہیں پایا تو میرے پاس دنیا کی کنجیاں آ گئیں؟

کیا تمہیں شک ہے کہ جب میں نے تیرے ہاتھ چھوئے تو دنیا کی ترکیب بدل گئی؟

کیا تمہیں شک ہے کہ میرے دل میں تمہاری انٹری تاریخ کا سب سے بڑا دن ہے؟ اور دنیا کی سب سے خوب صورت خبر؟

نوال السعد اوی کہتا ہے

میرا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ میں لونڈیوں اور غلاموں کے دور میں آزاد پیدا ہوئی، ایک ایسے مفکر دماغ کے ساتھ پیدا ہوئی جس وقت سوچنے پر پابندیاں عائد ہیں۔

انیس منصور کہتا ہے

عورت کا کوئی اصول نہیں ہوتا ... وہ یا تو اصولوں سے پرے ہے، یا اصولوں سے بالاتر، وہ عورت جو محبت کو نہیں جانتی ... اس میں نسائیت کہاں؟

ابراہیم المصری کہتا ہے

جب عورت خلوص سے محبت کرتی ہے تو وہ پاکیزہ اور خوبصورت ہو جاتی ہے۔ جس سے وہ پیار کرتی ہے، اپنے آپ کو اس کے علاوہ کسی اور کی ملکیت تصور کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ نہ پیسہ، نہ جذبات اور نہ ہی عیش و عشرت کے حیرت انگیز کرشمے اسے متاثر کر سکتے ہیں۔ اور نہ اسے اپنے پریمی کو دھوکہ دینے کے لیے دھکیل سکتے ہیں۔

ابراہیم نواز کہتا ہے

عورت ایک باغیچہ ہے، پر بسا اوقات کسی ایسے صحرا میں بدل جاتا ہے، جو صرف کیکٹس اگانے کے لیے موزوں ہوتا ہے۔

شیکسپیئر کہتا ہے

عورت ایک ستارہ ہے جس سے مرد درخشاں ہوتا ہے، اور اس کے بغیر سیاہ راتوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔

ارسطو کہتا ہے

عورت گلاب کی مانند ہے، جو اپنی خوشبو سے مرد کو اپنے کانٹوں سے ڈنک مارنے پر آمادہ کرتی ہے۔

محمود درویش:

ہم دونوں دوست ہیں، تو میرے ساتھ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر چل، مل کر روٹیاں پکاتے ہیں اور مل کر گانے گاتے ہیں۔۔۔

کیوں پوچھتی ہو یہ راستہ کہا جاتا ہے۔"؟

وہ بے سانس روح کی طرح بیٹھی بھیگی رات میں اس سچے کو دیکھ رہی تھی جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا

میں وہ نہیں ہوں

کہ جو محبت میں دوستی میں

جنسوں کے مابین اونچ نیچ سے کام لے

حسن کہیں بھی ملے کبھی بھی ملے

میری حیرانی کی گہرائی جیسی یہاں تھی

وہاں بھی رہے گی

محبت شے میں نہیں تیور میں ہوتی ہے

مجھے کسی سے بھی پیار ہوتا ہے تو ہو جاتا ہے

میری محبت محبوب میں قیام نہیں کرتی

خود اپنے اندر رہتی ہے۔

" کیا تم تقدیر پے یقین رکھتی ہو؟" وہ سوال کر رہا تھا

"ہاں"۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا

" تقدیر ہماری زندگی اور موت کے فیصلے کرتی ہے تقدیر ہمیں بے بس کرتی ہے اور ہم تقدیر کے سامنے سرنگوں ہیں۔ میری تقدیر مجھے جرمن کے صوبے بواریا سے اٹھا کر ایسے ملک لے گئی جو میرے ذہن کے نقشے میں میرے مستقبل کے طور پے نہیں تھا۔ وہاں میری زندگی کا فیصلہ ہوا۔ دیکھو میں تم کو ایک کہاوت سناتا ہوں۔ یہ بہت مشہور کہاوت ہے۔

بغداد میں ایک تاجر رہتا تھا۔۔ ایک دن اس نے اپنے ملازم کو بازار بھیجا کہ وہ کچھ چیزیں خرید لائے۔۔۔ کچھ دیر بعد وہ ملازم واپس لوٹا تو حواس باختہ تھا خوف سے کانپ رہا تھا۔

مالک کے استفسار پر ملازم بولا:" میرے آقا! جب میں بازار میں داخل ہی ہوا تھا تو مجمع میں سے ایک خاتون مجھ سے بری طرح ٹکرائی، خاتون نے مڑ کر دیکھا تو ایک لمحے میں میں سمجھ گیا کہ ٹکرانے والی دراصل میری موت ہے۔"

نوکر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:" میرے آقا اس عورت نے ٹکرانے کے بعد میری طرف دیکھا اور پھر دھمکی آمیز اشارے کیے، اب آپ مجھے اپنا گھوڑا دے دیں، میں اس شہر سے فوراً فرار ہونا چاہتا ہوں، میں موت سے بھاگنا چاہتا ہوں۔

نوکر بولا کہ گھوڑا لے کر سامرہ چلا جائے گا، وہاں اسے موت نہیں ڈھونڈ سکے گی (سامرہ بغداد سے ایک سو پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک عراقی شہر ہے)

یہ باتیں سن کر مالک نے موت سے خوفزدہ ہو کر فرار ہونے والے نوکر کو اپنا گھوڑا دے دیا..

نوکر گھوڑے پر بیٹھا اور اسے جتنا تیزی سے دوڑا سکتا تھا، دوڑایا اور شہر سے باہر نکل گیا۔

نوکر کے چلے جانے کے بعد مالک خود بازار گیا .. اس نے ہجوم میں اسی موت کو کھڑے ہوئے دیکھا .. مالک سیدھا اس کے پاس گیا اور بولا:" صبح تم نے میرے نوکر کو کیوں دھمکی آمیز اشارے کیے تھے؟" موت بولی:" میں نے تو کوئی دھمکی آمیز اشارے نہیں کیے، دراصل میں تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کہ وہ بغداد کے بازار میں کیا کر رہا ہے۔ میری تو اس کے ساتھ ملاقات آج رات سامرہ میں

طے تھی۔

تو جیسے طے شدہ مقام پر موت کھینچ کے لے جاتی ہے ایسے ہی طے شدہ مقام پر اس کی شادی اسے کھینچ کر لے جاتی ہے۔"

وہ چپ ہو گیا تھا یا شاید اس لمحے سے خود کو نکال رہا تھا

سلی سن تھی جیسے برف میں لگی کوئی سل ہو

یا کوئی پیتل کا مجسمہ

یا مٹی کی کوئی ڈھیری۔

"ہماری زندگی میں کچھ چیزیں طے ہو چکی ہوتی ہیں ہمیں صرف پرفارم کرنا ہوتا ہے۔"

وہ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔

" سلی نے ایک گہرا سانس کھینچا اس نے یہ کوشش بار بار کی تھی اسے اندازہ ہوا کہ وہ ابھی زندہ ہی تھی جب سامنے ہشام موجود تھا تو وہ مر کیسے سکتی تھی؟

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنی ماں کی خوشی کو پورا کیا۔"

"مجھے بھی یہ خوشی ہے۔"

وہ شاید پہلی بار مسکرایا تھا

آپ جن سے پیار کرتے ہیں انہیں کھو نہیں سکتے یہ واقعی ایسا ہی ہے

چیزیں، لوگ

وہ جلد یا بدیر، چلے جاتے ہیں

انہیں آپ تھام کر نہیں رکھ سکتے

جیسے آپ چاندنی کو پکڑ نہیں سکتے

لیکن اگر ان نے آپ کو اپنی انتہا سے چھوا ہے

تو پھر وہ آپ کے اندر ہی ہیں

وہ آپ کے لئے ہیں
کیوں کہ آپ بس ان چیزوں کے ہی مالک ہیں
جنہیں اپنے دل میں بسا کے رکھتے ہیں۔"
بوار یا گنگنا رہا تھا ہر آن میں ہر سانس میں
بوار یا بول رہا تھا لب کھول رہا تھا

Nothing you love is lost. Not really. Things, people—they
t hold them, any more'always go away, sooner or later. You ca
re've touched you, if they'than you can hold moonlight. But if the
re still yours. The only things you ever really'inside you, then they
۔have are the ones you hold inside your hear

"تم میرے پاس ہو یہ کافی ہے۔ ایک آدھا حصہ ہی سہی۔ یہ کافی ہے کہ میرے ساتھ بیت چکے حادثے کے بعد بھی تم میرے ہو بے شک آدھے ہی۔" وہ روتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

"تمہاری مسکراہٹ بتا رہی ہے خدا موجود ہے اور اس نے امید کو ختم نہیں کیا۔"

"ہاں بے شک خدا موجود ہے وہ نظر نہیں آتا۔ مگر وہ موجود ہے اور میرے ساتھ ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا

"دیکھو تو سیاہ اندھیرے کے پار میں اکیلی ہوں اس احساس کے ساتھ کہ خدا موجود ہے اور مجھے اداس دیکھ رہا ہے پھر اس نے تم کو میرے پاس بھیج دیا تا کہ تم میرے آنسو چن سکو۔" وہ روتے روتے مسکرا رہی تھی جیسے اسے اپنے تخلیق کار پے پیار آ رہا ہو

شام نگر میں بارش کا یہ منظر ہشام سمجھ سکتا تھا کیونکہ اس کے دل میں محبت تھی اور سلی اس کی نو عمر محبوبہ تھی

"خدا میرے دل کے بہت قریب ہے جب میں زیادہ غمگین ہوتی ہوں وہ میرے غم سے بڑی مجھے خوشی عطاء کرتا ہے۔" وہ اسے چھوٹے بچوں کی طرح چہک کر بتا رہی تھی وہ رات سحر تک اتنی ہی

خوب صورت رہی۔ ہشام پہلی بار اس کے ساتھ رہا آج اس کو ممی بروز و دادا یا ڈیڈی میں سے کسی کا کوئی خوف نہیں تھا

کچھ اس کی زندگی سے نکل گے تھے اور کچھ لوگ اس مٹی کے نیچے خاک ہو گے تھے جو موجود رہے وہ سانس لینے والے جسم تھے جو زندہ تھے اور یہ کافی تھا کہ زمین کے اوپر تھییہ خداوند کا انعام تھا۔

بواریا کا آسمان خوب سفید تھا۔اور سفید بادلوں سے دلفریب تھا آج سلی اپنی فلسفے کی کلاس میں موجود تھی اور اس کے تمام فیلوز حیران اور خوش تھے سلی ایک طویل ٹراوما سے نکل کر آئی تھی اسے سب نے ہی ویلکم کیا تھا۔آج وہ فلسفے کی کلاس میں موجود بہت توجہ سے خدا کے ہونے پر لیکچر سن رہی تھیآج اس کے دل میں کوئی ابہام موجود نہیں تھا۔۔۔فلسفہ کی تاریخ کا ایک لیکچر تھا جسے وہ کئی مہینے بعد پہلی بار غور سے سن رہی تھی۔اس کے پروفیسر ایک خیر مقدمی مسکان کے ساتھ اسے دیکھ کر اپنا لیکچر جاری رکھتے ہوئے بولے تھے۔

"اریوجینا اور متضاد تصورات

(Eriugena and Contradictory Predicates)

اریوجینا نے خدا کے تصور کو متضاد تصورات کے ذریعے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ان کے مطابق، خدا ایک طرف ایک مطلق وجود یا بینگ "Being" ہے، جس نے اس کائنات کو بنایا ہے۔ دوسری طرف، جب یہ فانی کائنات ختم ہو جائے گی، تو یہ عدم یا نان بینگ "Non"-"Being" ہو جائے گی، اور وہ بھی خدا ہی ہے۔

اریوجینا کے اس نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے، ہم مشہور گلوکار نصرت فتح علی خان کے ایک گانے "تم ایک گورکھ دھندا ہو" سے استعارہ استعمال کر سکتے ہیں۔ اس گانے میں، گلوکار ایک ایسی ذات سے مخاطب ہیں جو ایک " گورکھ دھندا" ہے، یعنی ایک ایسی ہستی جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔اسی طرح، اریوجینا کے مطابق، خدا ایک " گورکھ دھندا" ہے، یعنی ایک ایسا وجود جو دونوں متضاد تصورات، "Being" اور "Non"-"Being" کا حامل ہے۔خدا ایک طرف تو ایک وجود ہے جس نے کائنات

کو بنایا ہے لیکن دوسری طرف، وہ ایک غیر وجود یا عدم بھی ہے جو کائنات کے خاتمے کے بعد باقی رہے گا۔

• ایریوجینا کے نزدیک خدا کا تصور

ایریوجینا نے خدا کے تصور کو ایک منفرد انداز میں پیش کیا۔ ان کے نزدیک، خدا اس کائنات کی بنیادی محرک (Prime Mover) اور حتمی علت (Ultimate cause) ہے۔ وہ ہر چیز میں موجود ہے، وہ ہر چیز جاننے والا ہے، وہ مطلق خیر ہے اور وہ زماں و مکاں سے بالاتر بھی ہے۔

خدا کائنات کی ہر چیز میں موجود ہیں اور دوسری حوالے سے خدا از خود مادی شے بھی نہیں ہے۔

وہ ہر چیز میں ہے بھی اور ہر چیز میں نہیں بھی ہے۔ اس کے علاوہ ایریوجینا کے مطابق خدا ہر چیز جاننے والا بھی ہے اور اس کے برعکس خدا برائی نہیں جانتا۔ یعنی خدا ہے ہی اسلیئے خدا کیونکہ وہ ہر شر اور برائی سے پاک و پاکیزہ ہے۔ وہ مطلق خیر (Absolute Goodness) ہے۔

دراصل ان تمام متضاد اصول و قواعد کے خدا پر لاگو کرنے سے ایریوجینا ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ خدا کو دراصل ہم مکمل طور پر جان ہی نہیں سکتے۔ وہ دراصل ایک " گورکھ دھندا" ہے۔

• انسانی فطرت

ایریجینا کے نزدیک انسان میں بھی خدا کی طرح متضاد قوتیں اور اصول و قوانین پوشیدہ ہیں۔

ایریوجینا ان متضاد اصول و قوانین کو انسان پر بھی لاگو کرتے ہیں۔ یعنی انسان بھی خدا کی نور کا ایک عظیم مظہر ہے لہذا انسان کے اندر بھی کئی متضاد قوتیں اور اصول و قوانین پوشیدہ ہیں۔ ایک حوالے سے انسان جانور ہے مگر دوسری اعتبار سے انسان کے اندر ایک روحانی عنصر بھی پایا جاتا ہے۔

یعنی انسان ایک طرف حیوان ہے اور دوسری طرف فرشتہ۔ اس کا جسمانی حصہ حیوانوں سے ملتا جلتا ہے، جبکہ اس کا روحانی حصہ فرشتوں سے ملتا جلتا ہے۔

آسان الفاظ میں یہ کہ انسان میں بھی جسمانی اور روحانی دنیا کا تضاد پایا جاتا ہے۔ ایریوجینا کے مطابق۔

"Human nature meditates between spiritual and material things.

یعنی انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے مادی اور روحانی دنیا کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں دونوں دنیاؤں کے رجحانات موجود ہیں۔ ایک طرف، انسان ایک جسمانی وجود ہے جسے کھانے، پینے، سونے اور افزائش نسل کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف، انسان ایک روحانی وجود بھی ہے جسے محبت، امید، ایمان اور معنویت کی ضرورت ہے۔

انسان اپنی زندگی میں ان دونوں دنیاؤں کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کام کرتا ہے، لیکن وہ اپنی روحانی ضروریات کو بھی پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ محبت، امید اور ایمان تلاش کرتا ہے، اور وہ اپنی زندگی میں معنویت تلاش کرتا ہے۔

عیسیٰ مسیح ع کے حوالے سے اریجینا کا نقطہ نظر کیا تھا؟"

پروفیسر سمجھا رہے تھے۔

"۔ اریجینا کے مطابق، عیسیٰ مسیح ایک طرف تو انسان ہیں لیکن دوسری طرف وہ خدا بھی ہے۔ یعنی عیسیٰ مسیح دراصل خدا کی انسانی شکل ہے۔

وہ انسان اس لحاظ سے ہے کہ وہ ایک عورت سے پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے ایک انسان کی طرح زندگی گزاری۔ وہ خدا اس لحاظ سے ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے تھے اور ان میں خدا کی صفات تھیں۔

اریوجینا کے نزدیک، عیسیٰ مسیح میں خدا اور انسان کا تضاد ایک حقیقی تضاد ہے۔ یہ تضاد اس بات کی نشاندہی ہے کہ عیسیٰ مسیح ایک منفرد وجود ہیں جو خدا اور انسان دونوں ہیں۔ مزید یہ کہ انسان کا مقصد خدا کی طرح بننا ہے اور انسان میں خدا کی صفات پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ انسان ان صفات کو پیدا کر کے خدا کی طرح بن سکتا ہے اور یہی مقصد انسان کو اپنی فطرت کو پورا کرنے اور ایک کامل انسان بننے میں مدد کرتا ہے۔

انسان ہمیشہ یہ کوشش کر رہا ہوتا ہے کہ وہ صفتیں اس کے اندر آ جائے جو خدا کی فطرت کا حصہ ہے یا جو خدا صفات خدا میں پائے جاتے ہیں۔

اریوجینا کا اثر ورسوخ

اریوجینا نے خدا، عیسیٰ مسیح اور انسانی فطرت کے بارے میں بہت منفرد اور دلچسپ خیالات پیش کیے۔ ان کے خیالات نے ان کے بعد آنے والے بہت سے فلاسفہ کو متاثر کیا، بشمول مشہور جرمن فلاسفہ جیسے کانٹ اور ہیگل۔

اریوجینا کے خیالات کو اگرچہ ان کے اپنے عصر میں قبول نہیں کیا گیا بلکہ چرچ نے ان کے افکار و نظریات کو مسترد کر دیا اور ان پر مسیحی دنیا میں سخت تنقید بھی ہوئی۔ تاہم، بعد میں ان کے کام کو بہت پذیرائی ملی اور آج وہ مغربی فلسفے میں ایک اہم شخصیت کے طور پر سمجھے جاتے ہیں۔ حتیٰ کانٹ اور ہیگل جیسے فلاسفہ اریوجینا کو جرمن آئیڈیلزم (German Idealism) کے بانی (Father) مانتے ہیں۔"

اس کے پروفیسر نے مسکرا کر سلی کو دیکھا

"خدا ہے تو یہ مسکراہٹ ہے۔" وہ سلی کو دیکھ کر مسکرائے تھے۔

"خدا اکیلا ہے واحد ہے لاشریک ہے۔" سلی نے اپنی نوٹ بک میں تحریر کیا۔

"وہ اکیلا نا ہوتا تو یہ دنیا اپنے نظام سمیت نیست و نابود ہو جاتی۔ اس اکیلے نے اس نظام کو اپنے کن سے سنبھال رکھا ہے۔"

اس نے کھڑے ہو کر مہیب چپ کو توڑ دیا تھا۔

"سر مجھے نہیں پتہ دنیا کے فلاسفر خدا کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں

مجھے صرف اتنا پتہ ہے خدا ہے اور وہ اکیلا ہی اس ہستی کے لیے کافی ہے وہ اکیلا ہے اور اپنی کسی مخلوق کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔ وہ طاقت ور ہے اور قدرت رکھتا ہے ہر اس دل پر جو سات سمندر دور کسی دوسرے دل سے جڑا ہوتا ہے وہ خدا اس دور رہنے والے کے دل کو اس دوسرے انسان سے جوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کے حالات سے واقفیت رکھتے ہیں

میں اس ظالم تنہائی میں خدا کو بہت قریب سے جانا ہے اور مجھے اپنے پروردگار پے بہت پیار آتا ہے۔"

اور تالیوں کی ایک گونج کے بعد کلاس ختم ہو گئی تھی۔

ڈی سوزا نے اپنا بیگ سمیٹ کر اسے دیکھا

"سلی یہ کیا معجزہ ہے؟ تم بہت خوش ہو۔"؟

"کیا تم کو میرا خوش ہونا اچھا نہیں لگا؟"۔

سلی نے پیار سے کہا

"کیوں نہیں۔ پر میں اس کی وجہ ضرور جاننا چاہوں گی۔"

ڈی سوزا کو تجسس بھی تھا

"کیا تم کو نہیں پتہ کہ ہشام کی واپسی سے میری تمام خوشیاں جڑی ہوئی ہیں۔"

:"تمہاری خوشی تمہارے دوستوں کی سب سے بڑی خواہش ہے خداوند تم کو مسکراتا رکھے۔"

ڈی سوزا نے محبت سے کہا تھا

"اچھا سنو آج تم میرے ساتھ ہسپتال چلو گی؟"۔

"ہاں کیوں نہیں۔ کیا تمہاری کسی گائنا سے بات ہوگئی۔"؟

"نہیں۔" وہ مایوس تھی۔

"دادی نے تو ایک دایہ سے بات کی تھی

اور پھر دادی ہی نہیں رہیں۔" وہ اداس ہونے لگی تھی

"یہ کیا مصیبت ہے جس سے چھٹکارا مشکل ہے۔"

"تم اداس نہیں ہو۔ سب اچھا ہوگا،"۔ ڈی سوزا نے اسے زیادہ اداس نہیں ہونے دیا۔

"ہشام سے ملوں گی تو وہ اس مسلے کا حل نکال دے گا۔"

سلی نے اسے سمجھایا

"یہ بہتر رہے گا۔ ہشام سے زیادہ کون ہے جو اس مسلے میں مدد کر سکے۔" ڈی سوزا کی بھی ہمت بندھی تھی۔

"ہم آج شام کو چلیں گے۔"

اوکے ڈن۔" وہ مسکراتی ہوئی مطمئن جا رہی تھی
صرف ایک شخص کے ہونے کا احساس ہر غم پے بھاری تھا۔"

☆......☆......☆

شافیہ کا یہاں دل لگ گیا تھا۔

بواریا کی خوب صورت آب و ہوا حسین ماحول خوب صورت چہرے انتہا کی تنہائی جہاں کوئی کاٹ دار لہجے میں بات کرنے والا نہیں تھا۔

کبھی کبھی سمیرا کی کال آجاتی تھی جو سلگ سلگ کر انگارہ ہو رہی تھی۔ شافیہ کی دنوں میں چمکتی قسمت اور اس کے یورپ جانے پر اس کا حسد کم نہیں پڑ رہا تھا

اس دن بھی سمیرا کی جلی کٹی کال آ گئی تھی

"بڑی بی جاتے جاتے تمہاری زندگی تو سنوار گئی۔" یہ بات کوئی ہزار مرتبہ تو وہ سنا چکی تھی۔

" کیسے یتیمی میں پل کر جوان ہوئی تم اور کیا جہازوں میں ٹھاٹ سے سفر کر رہی ہو ایک ہماری قسمت نا ہی بدلی۔"

جل بھن کر کوئلہ ہو رہی تھی

"اور سناؤ تم کوئی خوش خبری ہے یا ایسے ہی پھر رہی ہو۔"؟ اب کے انداز ٹوہ لینے والا تھا۔

شافیہ پر جھینپ غالب آ گئی تھی۔

"ابھی تو ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تو بات بنالو نا۔ ایسے لونڈوں کا کیا بھروسہ۔ گوری کا بیٹا ہے۔ دولت تو سمیٹ لی چار دن عیاشی کر کے سائیڈ پے نا کر دے۔" سمیرا کی زبان سے انگارے ہی نکل سکتے تھے۔: ہاں وہ سنو تو ثروت کا بیٹا۔ ارے کتنا خوب صورت تھا۔ وہ کسی لڑکی کے چکر میں پکڑا گیا ہے اچھا ہوا تم تو نکل لی۔ ورنہ ہماری عزت تو جاتی ہی جاتی۔ اس کی نیت تم پر بھی نہیں ٹھیک تھی۔ ثروت کا دل تھا تم کو اپنی بہو بنانے کا۔ شکر ہے تم تو بچ گئی۔ اب یہاں سے چلی گئی ہے۔ اتنی بے عزتی کے بعد کہاں رہا جا سکتا تھا۔"

سمیرا ادھر ادھر کی ہانک کر جب تھک گئی تو فون بند کر دیا
اور شافیہ گہرا سانس بھر کے پھولوں بھری کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی تھی
سمیرا کی بازگشت اس کے پیچھے تھی
وہ کم و بیش ایسی ہی باتیں کرتی تھی
ہر بار شافیہ کا دل نئے سرے سے اداس ہو جاتا تھا۔
اسے ایک نظم یاد آ رہی تھی
بے شک اس کے حالات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی مگر وہ جینے کے لیے رعایت چاہتی تھی
بلکل ہر دیس کی روایتی لڑکی کی طرح۔
رسوئی گھر میں ایک دم ٹھیک مقدار میں ذائقے کا خیال
کہ دال میں کتنا ہو نمک
کہ لبھائے مگر چبھے نہیں،
کتنی ہو چینی چائے میں
کہ پھیکی نہ لگے اور زبان تالو سے چپکے بھی نہیں
اتنے سلیقے سے اوڑھے دوپٹہ
کہ چھاتی ڈھکی رہے
مگر منگل سوتر دکھتا رہے؛
چہرے پر ہو اتنا میک اپ
کہ تل تو دکھے ٹھوڑی کا
مگر رات پڑے تھپڑ
کا سیاہ داغ چھپ جائے
چھوئے اتنے ٹھیک طریقے سے کہ پتی خواب میں بھی نہ جان پائے

کہ اس کے کاندھے پر دیا تازہ گرم بوسہ اسے نہیں
دراصل اس کے پریم کی یاد کے لیے ہے
اتنی ہی حاضری دکھے کہ
رسوئی گھر میں رکھی ماں کی دی پرات میں اس کا نام
لکھا ہو
مگر گھر کے باہر نیم پلیٹ پر نہیں،
کہ گھر کی قسطوں کی ساجھے داری پر اس کا نام ہو
مگر گھر گاڑی کے مختار ناموں پر کہیں نہیں
کچھ اتنا سدھا اور حساب سے ہے عورت کا من
کہ کوئی ماتھے پر چھاپ گیا ہے
'تریاچرترم'
جسے دیوتا بھی نہیں سمجھ پاتے، آدمی کی کیا بساط!!
اور اس طرح عورت کو
'آدمیوں' کے رتبے اور درجے سے بے دخل کر دیا گیا ہے
اتنی ناقابل برداشت ڈرامائیت
اور میکانکی عمل سے تھک کر
اتنے سارے سلیقوں، ترتیبوں اور ٹھیک حساب کے درمیان
ایک عورت تھوڑا سا بے ڈھب، بے سلیقہ ہو جانے
اور بے حساب جینے کی رعایت چاہتی ہے

☆......☆......☆

جینا کسے برا لگتا ہے؟

شافیہ کو ہشام سے کوئی گلہ نہیں تھا۔اس نے شافیہ کو جینے کی رعایت دے رکھی تھی اور ایک عورت کو کیا چاہیے تھا؟ جبکہ وہ بے ڈھب بھی نہیں تھی ۔یہاں اسے آزادی تھی ۔سکون تھا اور اپنی مرضی تھی ۔یہاں کی زبان سیکھنا ضروری تھا نوکری کے لیے یا یہاں رہنے کے لیے۔ہشام نے اس کا گھنے سبزے کے بیچ بنے بین الاقوامی انسٹیٹیوٹ میں داخلہ کروا دیا تھا شافیہ نے اصل زندگی رنگ لوگ رویے تو یہاں دیکھے تھے۔

وہ ایک چھوٹی سی محدود زندگی سے نکل کر اس انسانوں کو ہجوم میں قطعی نہیں گھبرائی تھی یہاں شافیہ کی پہلی بار ملاقات سلسبیل اور ڈی سوزا سے ہوئی تھی

اس نے مغرب کی پیداوار میں ایسی مشرقیت پہلی بار دیکھی تھی وہ بہت حیران تھی اس کی ملاقات لیکچر کے دوران ہوئی تھی ۔جب سلی نے سر کی فرمائش پہ پوری کلاس کو ایک نظم سنائی تھی ۔

"پارسا کا خط مہتاب کرانہ کے نام

میں جتنا تمھیں پیتا جاتا ہوں

میری پیاس اتنی بڑھتی چلی جاتی ہے

اے سب سے زیادہ پیاسا کر دینے والے پانی!

اے سب سے کڑوی میٹھی پیاس!

اے سب سے ہلکے وزن!

تم میری زندگی کی سب سے غمگین خوشی ہو

تم میری زندگی کی سب سے خوش کن اداسی ہو

اے سادہ لیکن پیچیدہ واقعے!

تم مجھے جلا کر بھسم کیوں نہیں کرتی

اے میری زندگی کی سب سے ٹھنڈی آگ!

اے کائنات کے مہاجر پرندے کے سب سے بھاری لیکن ہوا میں تیرتے ہوئے پنکھ!

پرندوں کا شہر کہاں ہے؟

خدا کا چاند سا چہرہ چوم لوں۔"

ہال میں تالیاں گونجی تو پھر ایک فلسطینی لڑکا خطیب کھڑا ہوا تھا۔شافیہ کو لگا وہ کبھی بے حد خوب صورت ہوگا مگر اس کی آنکھیں کسی صدمے نے بنجر کر دی تھیں۔

خطیب کی آواز کا ٹھہراؤ بتاتا تھا کہ اس نے صدموں کے انگنت بھار اٹھار کھے ہیں۔وہ بولتا جا رہا تھا اور سب ہمہ تن گوش تھے

جان کیٹس نے کہا تھا جب میں بلبل کی آواز سنتا ہوں تو مجھے مرنے کا خیال آتا ہے۔مجھے یہ خیال آتا ہے شاید کیٹس نے چرواہے کی بانسری کی آواز نہیں سنی ہوگی وگرنہ انہیں زیادہ عمر جینے کا خیال ضرور آتا ہوتا اور ان کی عمر اتنی کم بھی نہ ہوتی۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ کم عمر ہونے کے باوجود انہوں نے انتہائی گراں قدر ادبی سرمایہ چھوڑا لیکن اس بات سے کس کو انکار ہے کہ وہ زیادہ جیتا تو اور بھی اضافہ کرتا۔بانسری کی آواز اتنی خالص ہوتی ہے کہ یہ ہمیں حیات نو کے لطف سے آشنا کراتی ہے بشرطیکہ سیدھا سادہ چرواہے کے دل میں تخلیق ہوجایے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں ہم ہی کیوں کر تہذیبوں کے سفر کا حصہ بنے اور اس مقام تک پہنچ آئے جہاں اب ہم کھڑے ہیں۔ہمارے ناتواں کندھوں پر سماج نے طرح طرح کے بوجھ لاد رکھے ہیں جیسے ہم وہ گدھا ہیں جو چرواہا بار برداری کے لئے استعمال میں لاتا ہے۔آپ لوگوں نے دیکھا ہوگا اس گدھے کے حقوق نہیں ہوتے ،وہ کسی جشن میں شامل نہیں ہوتا انہیں کام کرنے ہوتے ہیں البتہ جب چرواہا کہیں تھک جائے تو وہ کہتا ہوتا ہے گدھا تھک گیا ہے آرام کرنا چاہئے۔جب خود اسے پیاس لگ جائے تو وہ کہتا ہے گدھے کو پیاس لگ رہی ہے ضروری طور پر کسی چشمے کے کنارے بیٹھ کر پانی پینا چاہئے۔

جب ہم پیدا ہوتے ہیں تب ہی پہلی آواز ہمارے کان میں آذان کی دی جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے ہمارے اوپر مذہبی زمہ داریوں کا بوجھ رکھا گیا، ہم سچے خدا کی تلاش خود سے نہیں

کریں گے تا کہ خالص رہیں بلکہ ہمیں وہ سچ بتا دیا گیا جو ہمارے آباؤ اجداد کا ہے ہم اسی طرح عمل کریں گے اگر نہیں کریں گے تو ہمیں بچپن سے ہی سدھایا جائے گا۔ اسی طرح اپنے بچپن میں جب ہم دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو ہمیں آباؤ اجداد کے قصے سنائے جاتے ہیں ہمیں بار بار یہ یقین دہانی کرائی جاتی ہے کہ اچھا آدمی وہ ہے جسے سماج اچھا کہے، جو اپنے بچوں کے لئے کمائے بھی اور سماجی رسومات میں بھی بھرپور طریقے سے شریک ہوتا رہے۔ میں سوچتا ہوں ہم نے اچھے کپڑے پہن لئے، ہم سریے اور سیمنٹ کے بنے گھروں میں رہنے لگے ہم نے گھروں کے تزئین و آرائش کا ہنر بھی سیکھ لیا، پھر بھی ہم خوش نہیں ہوئے ہمارے دکھ کسی طرح کم نہیں ہوئے۔ چرواہے کے مقابلے میں ہم اس جانوں کی طرح ہو گئے ہیں جنہیں ڈومیسٹک بنایا گیا ہو وہ انسانوں کے ساتھ اپنی جبلت پر سمجھوتہ کر کے رہتا ہو۔ چرواہا وہ جانور ہے جو جنگل میں رہتا ہے اور فطری آزادی سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

چرواہوں کے پاس پھٹے پرانے کپڑے ہوتے ہیں اور وہ فیشن سے ماورا ہوتے ہیں ان کے گھروں میں اچھی کراکری نہیں ہوتی ان کے پاس ہماری طرح کچھ نہیں ہوتا لیکن ان کے کندھوں پر تہذیبی ارتقاء کا بوجھ نہیں ہوتا وہ ہمیشہ سے ایک سی حالت میں رہتے ہیں ان کے پاس جائداد کی صورت میں بھیڑ بکری، نقدی کی صورت میں اون، لطف کے لئے عورت اور بانسری ہوتی ہے اور سفر کے لئے گدھا ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کتنی سادہ اور پر لطف ہوتی ہے۔ سادگی ہی تو مسرت کا نام ہے۔ ان کی بانسری کا وحشی نغمہ غنائیت کو مفہوم دیتا ہے۔ ان کی خوبصورت آوارگی آگہی کو معنی عطا کرتی ہے۔ ان کا رسم و رواج سے آزاد عشق دراصل آزادی کی مسرت کو نام دیتا ہے۔۔۔"

پھر خداداد نامی لڑکا اٹھا اور اس نے ایک نثری نظم پڑھی تھی:

شاعرہ لوئیس گلک ""جنگلی آئرس"" میں کہہ رہی تھی

"مجھے سنو

میری تکلیف کے خاتمے پہ ایک دروازہ ہے

اسے تم موت' کہتے ہو

میں جانتی ہوں

مرے سر کے اوپر صنوبر کی شاخیں اپنی جگہ بدلتی ہیں

ان کا شور میں سن سکتی ہوں

پھر خاموشی

کمزور سورج

خشک مٹی پہ ایک لمحہ کے لئے چمکتا ہے

بچ جانا خوفناک ہے

شعور کے بغیر جو کالی مٹی میں دفن ہے

پھر خاتمہ ہو گیا

جس کا ہمیں خوف تھا

ایک روح رہنا اور بول نہ پانا

یا بولتے بولتے ایک دم سے چپ ہو جانا

زمین سخت ہے

اور تھوڑی سی نیچے کو جھکی ہے

میں کس کو دکھائی دیتی ہوں

جھکی ہوئی؟

پرندے چھوٹی جھاڑیوں میں تیزی سے چھپ جاتے ہیں

تمہیں یاد نہیں

دوسری دنیا کو جانے کا راستہ؟

میں بتا سکتی ہوں

کہ مجھے گفتگو پہ قدرت حاصل ہو گئی ہے

جو کچھ بھی بھول پن سے واپس آتا ہے
اسے آواز ضرور ملتی ہے
میری زندگی کے مرکز سے ایک عظیم چشمہ ابلتا ہے
گہرا اور نیلا
جو سمندر کے پانی پہ نیلا سایہ تنتا ہے

The Wild Iris

At the end of my suffering
there was a door.

that which you call deathHear me out
rememberI

Overhead, noises, branches of the pine shifting.
Then nothing. The weak sun
flickered over the dry surface.

It is terrible to survive

as consciousness
buried in the dark earth.

that which you fear, beingThen it was over
a soul and unable
to speak, ending abruptly, the stiff earth

took to bebending a little. And what I
birds darting in low shrubs.

You who do not remember
passage from the other world
whatevercould speak againtell you I
returns from oblivion returns
:to find a voice

from the center of my life came
a great fountain, deep blue
shadows on azure seawater.

خداداد جذبات میں تھا
اور اسی جذباتیت میں وہ اپنے وطن کے حوالے بول رہا تھا۔ان کے ملک میں ایسے ہی حالات اور شورش تھی

"قابل رحم ہے وہ قوم جس کے لوگ بھیڑ بکریاں ہیں
اور جس کے چرواہے انھیں گمراہ کرتے ہیں۔
قابل رحم ہے قوم جس کے رہنما دروغ گو ہیں جس کے عالم ودانا خاموش ہیں
اور جس کے تعصّبات ہوا کے دوش پر منڈلاتے ہیں۔
قابل رحم ہے وہ قوم جو آواز نہیں اٹھاتی
سوائے فاتحین کی رطب اللسانی کے اور بدمعاش کو سورما قرار دینے کے
اور اس کا مقصد دنیا پر بزورِ طاقت و جبر حکومت کرنا ہے۔

قابل رحم ہے وہ قوم جو اپنی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں جانتی
اور اس کی اپنی ثقافت کے علاوہ کوئی اور ثقافت نہیں۔
قابل رحم ہے وہ قوم جس کی جان پیسہ ہے۔
اور وہ شکم سیر خوابیدہ لوگوں کی مانند سوتی ہے۔
قابل رحم ہے وہ قوم---آہ، افسوس ان لوگوں پر جو اپنے حقوق سلب ہونے دیتے ہیں۔
اور اس کی اجازت دیتے ہیں کہ ان کی آزادیوں کا صفایا کر دیا جائے۔
میرے وطن، تیرے آنسو، آزادی کی پیاری سرزمین۔

Pity the nation whose people are sheep,
and whose shepherds mislead them.
Pity the nation whose leaders are liars, whose sages are silenced,
and whose bigots haunt the airwaves.
Pity the nation that raises not its voice,
except to praise conquerors and acclaim the bully as hero
and aims to rule the world with force and by torture.
Pity the nation that knows no other language but its own
and no other culture but its own.
Pity the nation whose breath is money
and sleeps the sleep of the too well fed.
oh, pity the people who allow their rights tPity the nation — erode
and their freedoms to be washed away.
"-My country, tears of thee, sweet land of liberty.

وہ شاید سانس لینے کو رکا تھا
اور پھر بولنے لگا۔
"پھر خطیب اٹھا اور اس کے لہجے میں ایک جلال ایک وحشت تھی
'امن کے لئے لڑنا چاہتے ہیں
یہ سب سے گمراہ کن روحیں ہیں
جب تک انسانی دل و دماغ سے قتل و غارت کا خاتمہ نہیں ہوگا
تب تک زمین میں سکون نہیں آئے گا
قتل انسانی ذات کا اہرام ہے
جس کی بنیاد خود اس کی قدیم زشت ہے
جو کھڑا ہے اسے گرنا پڑے گا
ہر وہ چیز جس کے لیے انسان نے جدوجہد کی
اس سے پہلے کہ وہ بطور انسان جینا شروع کرے
اسے اس کو ترک کرنا پڑے گا
اب تک وہ ایک بیمار درندہ رہا ہے
اور اس کی الوہیت بھی بدبودار ہے
وہ کئی جہانوں کا مالک ہے
لیکن اپنی ذات میں غلام ہے
وہ دماغ سے نہیں دل سے حکومت کرتا آیا ہے
یعنی اپنی خواہش کے بل بوتے پر
اس کی وحشی فتح صرف موت لاتی ہیں
اس نے بطور انسان اس دائرے سے منہ موڑ لیا ہے
جہاں آزادی ہے

There are people who want to fight to bring about peace—the most deluded souls of all. There will be no pea
until murder is eliminated from the heart and min
Murder is the apex of the broad pyramid whose base is the self. That which stands will have to fall. Everything which m
has fought for will have to be relinquished before he can begin
live as man.
Up till now he has been a sick beast and even his divinity stinks. He is master of many worlds and in his own he is a sla
What rules the world is the heart, not the brain, in every rea
our conquests bring only death. We have turned our backs on t
"one realm wherein freedom lie

وہ رکا اور پھر بولا"

"آپ میرے ساتھ آواز اٹھایے "فری فلسطین" آپ بولیے کہ انسانی حقوق کی دھجیاں بکھر رہی ہیں۔ یہ دنیا ایک دھماکے کا انتظار کیوں کر رہی ہے جسے قیامت کہتے ہیں۔ ہمارے لیے غزہ میں قیامت آچکی ہے۔ سب سو رہے ہیں پوری کائنات سو رہی ہے اور دیکھنا کہ خدا سب دیکھ رہا ہے وہ ایک صور پھونکنے کا حکم دے گا اور میں دیکھوں گا تم میں سے کوئی باقی رہتا ہے کیا؟ ۔ میرا خدا دیکھ رہا ہے۔"

وہ پوری جان سے چیخ رہا تھا یہاں تک کہ اس کے دوست اسے سنبھال رہے تھے۔

قسط نمبر 18

"ہے سلی! میری جان! تم کیسی ہو؟"

"آہاں! تم کو کیسی لگتی ہوں؟" اس نے بھنویں اچکا کے پوچھا تھا۔

"مجھے تم بالکل ٹھیک لگتی ہو۔"

اس نے دل سے کہا تھا

"مگر اس کا راز جاننا چاہتی ہوں۔"

"مگر کیسا راز؟"

سلی حیران نہیں ہوئی تھی

"مجھے لگتا ہے ڈاکٹر ہشام تمہاری زندگی میں واپس آچکا ہے۔" اس نے قیاس کیا

"اور مجھے لگتا ہے وہ گیا ہی کب تھا؟"

اس نے آسمان پر پرواز کرتے شاہین کو دیکھا۔ اسے ہشام بھی شاہین جیسا لگتا تھا جس کی پرواز بہت بلند تھی۔

"اس سے فرق نہیں پڑتا

کہ بظاہر کوئی کتنا خوش نظر آتا ہے

ان کی بھی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں

جب وہ سوال اٹھاتے ہیں

کہ کیا وہ مزید یہ سب جھیل سکتے ہیں؟

اس سے بھی فرق نہیں پڑتا
کہ کوئی کتنا پراعتماد ہے
ایسا وقت آتا ہے
جب وہ اپنے متعلق غیر محفوظ ہو جاتے ہیں
اور بے یقینی کا شکار نظر آتے ہیں
اس سے بھی فرق نہیں پڑتا
کہ کوئی کتنا مضبوط نظر آتا ہے
ایسے دن آتے ہیں
جب مضبوط سے مضبوط انسان کو بھی لگتا ہے
کہ وہ ٹوٹ رہا ہے
سو کبھی ایک لمحے کے لئے بھی نہ سوچیں
کہ بس آپ تنہا زندگی سے نبرد آزما ہیں
یا آپ منتشر ہیں
تم انتشار کا شکار نہیں ہو
کہ تم انسان ہو۔
سچ تو یہ ہے کہ میں نے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔"
سلی کے لہجے میں اعتماد تھا۔
"بزدل موت سے پہلے کئی دفعہ مرتا ہے
جبکہ بہادر صرف موت کے وقت ہی موت کو چکھتا ہے
میں نے زندگی کے تمام عجائب کے بارے سنا
ان سب میں مجھے یہ عجیب لگا
کہ انسان موت سے ڈرتا ہے

آج وہ بہت اداس نہیں تھی۔ شاید اب جینے کا سبب نظر آ رہا تھا۔ ایک امید تھی جس پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا ہشام نے اسے پھر سے ایک جگنو پکڑا دیا تھا

وہ اس روشنی میں کچھ آگے تک اور سفر کر سکتی تھی۔ یہ روشنی رستے کے اندھیروں کو کم کرنے کے لیے کافی تھی۔

آج خطیب نے سلی کو کافی بدلا ہوا اور پر جوش دیکھا تھا جب وہ اپنے پورشن کی صفائی کر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سلی بھی معمول سے ہٹ کر کام میں لگی ہوئی ہے وہ بھی اپنے گھر کی صفائی کر رہی تھی۔ شاید کتنے مہینوں سے جمی کائی کو دھونا ایک دقت طلب کام تھا مگر وہ بہت پر سکون نظر آ رہی تھی کچھ دیر بعد ڈی سوزا بھی اپنا کام ختم کر کے سلی کی مدد کرنے کے لیے آ گئی تھی۔

خطیب جب اوپر آیا تو بیرونی راستے یعنی سیڑھیوں سے خداداد آتا دیکھائی دیا تھا۔ وہ کافی دنوں بعد آیا تھا۔ اتنے دن وہ کہاں رہا؟ کچھ خبر نہیں تھی۔

جو لوگ یورپ میں رہتے ہیں ان کو اندازہ ہو گا کہ یورپ میں نوکری ملنا یا اچھی رہائش ملنا ایک نعمت ہے آجکل جو حالات چل رہے ہیں یورپ میں نوکریاں ناپید ہیں اور مہنگائی کا طوفان ہر جگہ سر چڑھ رہا ہے۔ اس مشکل دور میں اپنی فیملیز کو سپورٹ کرنا کافی مشکل امر تھا

"تم کہاں تھے؟ کوئی خیر خبر نہیں؟"

"میں ایک اور جگہ کام کی تلاش میں تھا۔"

خداداد تھکا سا بولا تھا۔

"تو کچھ بنا؟"

"مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔"

"تو کیا تم واپس اپنا کورس مکمل کر کے نہیں جاؤ گے؟"

خطیب نے پوچھا

کیونکہ اس کی اپنے ملک میں جاب تھی

"وہاں کیا رکھا ہے؟ بھوک اور افلاس کے۔"

وہ تو ارادہ کر چکا تھا

"میں اپنے بہن بھائی یہاں بلا لوں گا اور یہیں سیٹل ہو جاؤں گا۔"

اسے کبھی کبھی یہ زندگی جہنم لگنے لگتی تھی جیسے سبزے کو آگ لگی ہو اور ہر چیز دوزخ میں جل رہی ہو۔

دوزخ بھری پڑی ہے

پھر بھی تم اس میں اکیلے ہو

ویسے بھی تم ہمیشہ اکیلے رہے

اور یہ کسی کو بتا بھی نہیں سکے

مبادا لوگ تمہیں جنونی سمجھیں

پاگل ہونا بھی دوزخ میں رہنے کے مترادف ہے

اور عقلمند ہونا

ہاہا

یہ بھی جہنمی ہونے کی نشانی ہے

جو دوزخ سے بچ نکلتے ہیں

وہ اس کے بارے کبھی بات نہیں کرتے

اس کے بعد انہیں کچھ پریشان نہیں کر پاتا

عمومی چیزیں جیسے

آج آپ کھانا نہیں کھا سکے

آپ نے کار مار دی

آپ آج موت کے خوف میں مبتلا رہے

جب آپ ان سے پوچھتے ہیں

کیسا چل رہا ہے؟
وہ ہمیشہ کہیں گے
"بہت اچھا
بہت خوب"
دوزخ کو ایک دفعہ بھگت لینا
ہمیشہ کے لئے انہیں مطمئن کر دیتا ہے
وہ مڑ کے نہیں دیکھتے
فرش کیوں سرک رہا ہے
سورج آدھی رات کو کیوں نکلا ہے
چیزیں چوہیا کی تیز آنکھوں کیطرح
گاڑی کے بیکار ٹائر
انہیں ہنسا سکتے ہیں
کہ وہ دوزخ کو بھگت آئے ہیں
:"میں مصیبت میں ہوں"
شیطان کرب میں چلاتا ہے ..
کس طرف کو میں پرواز کر جاؤں؟
بے پناہ غضب اور بے پناہ مایوسی
میں اُس کا شکار ہوں
جس طرف کو بھی میں جاؤں
وہاں دوزخ ہی ہے
میں خود دوزخ ہوں

مہیب گہرائی میں مزید پستی

منہ کھولے

مجھے ہڑپ کرنے پہ تلی ہے

یہ دوزخ ہے

گرچہ اسے میری (خواہش) نے جنت بنادیا ہے۔"

جان ملٹن کی نظم "جنت گم گشتہ" بواریا کی سرد ہوا کے ساتھ سوگوار تھی۔

سارا غزہ شیطانوں کے قبضے میں تھا یہاں تک کہ شیطان بھی چلا رہا تھا۔ظلم بربریت کے گھرے بادلوں میں کوئی امید کی کرن نہیں تھی

موت نے پوری بستی کو ڈھانپ رکھا تھا۔

: آنسو بھوک اور سسکیوں کی آواز میں کون سی آواز قبر کے مزار سے آتی سنائی دے گی ۔ جہاں زندگی دم توڑ رہی تھی وہاں روشنی کی جگہ اندھیرا تھا۔

"زیارت گہ الفت میں کوئی مزار بن کر

میں تم لوگوں کی دعاؤں میں

دلوں کی کہانی سننا چاہتا ہوں

تمہارا اسکارف اپنے سر پر اوڑھ کر

میں اذان کی آواز کے ساتھ

دوسرے جہان کو دیکھنا چاہتا ہوں

میں تمہارے آنگن میں بیٹھا پنچھی بن کر

تمہیں ان ملکوں کے گیت سنانا چاہتا ہوں

جو سرحدوں سے آزاد ہیں

میں دیے میں تیل ختم ہونے پر

تمہارے کمرے میں روشنی بن کر آنا چاہتا ہوں
میں تمہارے ساتھ باغیچے میں
پانی کا دھارا بن کر بہنا چاہتا ہوں
ایک غیر معین روپ میں
میں تمہاری ننھی جیب میں ٹیبو
بن کر سونا چاہتا ہوں
جسے تم دوپہر میں کھاتی رہتی ہو
تمہاری پھلکاری میں
جس دھاگے کا رنگ نہیں ملتا
میں وہ رنگ لے
کر تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں
تمہاری کنگھی میں الجھے بالوں کو
میں تعویذ بنا کر
اپنے پرس میں چھپانا چاہتا ہوں
تمہیں سامنے بٹھا کر میں
بالکل تمہاری طرح
ہنسنا چاہتا ہوں
اس خط کے حرفوں سے نکل کر
بچپن میں پڑھی نظموں کی طرح
میں ساری عمر
تمہارے حافظے میں رہنا چاہتا ہوں

یا تمہارے نازک سینے میں

چھپے دل میں!!

خداداد کتنے ہی دن سے کھویا کھویا اور لاپتہ تھا نجانے اس کی اداسی کا سبب کیا تھا؟

اس دن ڈی سوزا نے بھی خطیب سے یہی بات کی تھی

"تمہارا دوست کیا کرتا ہے آج کل؟"

"شاید وہ اپنے ملک واپس نہیں جانا چاہتا اور یہاں کی شہریت حاصل کرنے کی کوشش میں ہے۔"

خطیب کا قیاس بے جا نہیں تھا

"اچھا تو یہ بات ہے۔" اس نے گہرا سانس لیا

"کل تم انسٹیٹیوٹ جاؤ گے؟"

"ہاں انشاءاللہ میں پوری کوشش کروں گا۔"

"ارے واہ" ڈی سوزا خوش ہوئی تھی

"آج کی اچھی خبر تم کو سناؤں؟"

"ہاں کیوں نہیں۔"

خطیب بہت دن بعد مسکرایا تھا

"تو سنو۔ سلی آج بیکری کھولے گی۔"

اس نے جیسے سرپرائز دیا تھا

"یہ بات میں جانتا ہوں۔ سلی نارمل ہو رہی ہے اور یہ خوش آئند ہے۔"

خطیب نے دلی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"اس سب کے پیچھے ہشام ہے نا؟ ہشام بہت اعلیٰ ظرف اور اچھا ہے۔ دیکھو اس نے سلی کو اکیلا نہیں چھوڑا۔"

"ہاں اور وہ سلی کے مجرم کو سامنے ضرور لائے گا۔"

خطیب کی بات مکمل ہوئی تو اوپر سے خداداد بولا

"اگر تمہیں فرصت مل گئی ہو تو کافی بنا دو۔"

"جناب خادم حاضر ہونے ہی والا ہے۔" خطیب نے پوری جان قدری سے کہا

"توبہ کتنا مغرور ہے تمہارا دوست۔"

"کوئی ایسا ویسا۔" خطیب کافی بنانے چلا گیا تو ڈی سوزا بھی اس کے پیچھے آ گئی تھی۔

"آجکل کیا پڑھ رہی ہو؟"

"داغستان کا ترجمہ۔"

"اچھا اس میں کیا ہے؟"

"اس میں امید ہے اور بلندی اور جیسے کسی اور کے لیے ایثار کا جذبہ۔"

"چلو سنا دو پھر۔ جبکہ تم ضرور ہی سنانا چاہتی ہو۔" خطیب شاید پہلی بار مسکرایا تھا وہ اس کی فطرت سے واقف تھا جب تک اپنا اچھا سا پڑھا سنا نا دیتی اسے چین نہیں آ سکتا تھا۔

"ایک بار میں نے ماسکو میں شاہ بلوط کا ایک پرانا درخت دیکھا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ زار روس ایوان چیفناک نے لگایا تھا۔ اس نے نشو ونما کے مختلف مرحلوں پر لوگوں کو مختلف لباس پہنتے دیکھا ھے۔ پہلے لوگ بویار کپڑے پہنتے تھے، پھر کامی سول اور سفید وگوں کا استعمال ہوا، پھر اونچی ٹوپیوں اور رامبر کوٹوں کا زمانہ آیا پھر بدیونی فوجی ٹوپیوں اور چمڑے کی جیکٹوں کا چلن ہوا، کچھ دنوں بعد معمولی کوٹ اور بڑی مہری کے پتلون مقبول ہوئے اور پھر تنگ مہری کے۔ لیکن شاہ بلوط کا وہ پیڑ ان سب تبدیلیوں سے بے نیاز جیسے یہی کہتا رہا ہے کہ

"لوگو! اگر تمہارے پاس کوئی بہتر کام نہیں ہے تو جاؤ کپڑوں کے فیشن تبدیل کرتے رہو، لیکن میرے سامنے زندگی کا ایک مقصد ہے۔ مجھے سورج کی کرنیں جذب کرنی ہیں اور انہیں مضبوط اور شاندار شاخوں پر شاہ بلوط کے پھولوں اور پھلوں کی شکل دینی ہے جن سے شاہ بلوط کے دوسرے طاقتور پیڑ جنم لینگے۔"

" کیسا؟"

"بہت خوب صورت۔ رسول حمزہ توف کے لفظ دل پر اثر کرتے ہیں۔"

"شکریہ۔" وہ مسکرائی جیسے کہ اسی کی تعریف ہو۔ ظاہر ہے انتخاب تو اسی کا تھا۔

"تم کتنی اچھی لڑکی ہو۔"

خطیب نے کہا

"تم کہو تو یہ اچھی لڑکی کافی بھی بنا سکتی ہے۔" اسکی آفر پر خطیب بے ساختہ مسکرایا،

"میں نے تعریف اس مقصد کے لیے نہیں کی۔ تم سچ میں ایک اچھی لڑکی ہو۔"

"میں بھی جانتی ہوں۔ اچھا دیکھو تو تمہارے دوست کو کافی پسند آئے گی۔۔"

ڈی سوزا نے واقعی میں کڑک کافی بنا دی تھی اور اس کا کچن بھی صاف کر دیا باتوں میں ہاتھ چلتے رہے تھے۔

اس نے کافی کے مگ بھرے تو خطیب نہیں تھا

ڈی سوزا نے کچھ دیر انتظار کیا اور آگے بڑھ کے خداداد کی تلاش کی۔ وہ لیونگ روم میں بیٹھا تھا کسی گہری سوچ میں گم لگتا تھا۔ کافی مضطرب اور پریشان۔

"ہائے کتنا حسین ہے یہ لڑکا۔"

ڈی سوزا نے آہ بھری تھی

"اور مغرور بھی ۔"

"ہے۔ یہ کافی لو۔" سوزی کی آواز پر وہ چونکا تھا

"خطیب کہاں ہے؟" اس نے نگاہ چرائی۔ سوزی کو اسکا نگاہ چرانا دل سے اچھا لگا تھا

" کتنی سرخ ہیں اس کی آنکھیں۔۔۔" اس نے سوچا

" کیا تم سوئے نہیں؟"

" کیوں تم میری جاسوسی کرنے آئی ہو؟"

"یہ بات تو نہیں۔"

"پھر جاؤ۔" وہ رکھائی سے بولا

"کتنے کھڑوس ہو تم۔" سوزی نے چڑ کر کہا

"ذرا بھی مروت نہیں۔"

"ایسا ہی ہوں میں۔ اب تم جا سکتی ہو۔"

"میں تمہیں کافی دینے آئی تھی۔" سوزی نے ناک چڑائی

"میں نے خط نہیں لکھا تھا۔"

اس کھلی بے عزتی پر سوزی کسلتی ہوئی وہاں سے نکلی تو خطیب بھی آ گیا

"سوری میں واش روم دھونے چلا گیا تھا۔ تم نے کافی بنا دی۔"

"جی اور پہنچا بھی دی۔ بہت ہی بے مروت دوست ہے تمہارا۔ شکریہ تک ادا نہیں کیا۔" سوزی کسل کر نیچے آ گئی تھی جبکہ خطیب مسکرا دیا تھا

سوزی نیچے آئی تو ایک تڑا سا کاغذ اس کے پیر سے ٹکرایا تھا ایسا لگ رہا تھا یہ اوپر سے آیا ہو یعنی اوپر کسی کھڑکی سے۔ جسے اضطراب میں لکھ کر پھینک دیا گیا ہو

سوزی نے اٹھا کر اسے کھولا

تحریر کچھ نا سمجھ میں آنے والی تھی

''حقوق نسواں کی عملی تصویر، پہلی شہید، شاعرہ، عالمہ، مفسرہ، مدبرہ جسے گلا گھونٹ کر شہید کر دیا گیا تھا یہ اسی کی غزل تھی

"تجھ پہ مری نظر پڑے، چہرہ بہ چہرہ، رو بہ رو
میں ترا غم بیاں کروں، نکتہ بہ نکتہ، مو بہ مو
میں تری دید کے لئے مثلِ صبا رواں دواں
خانہ بہ خانہ، در بہ در، کوچہ بہ کوچہ، کو بہ کو

ہجر میں تیرے خونِ دل آنکھ سے ہے مری رواں
دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ، جو بہ جو
یہ تری تنگئی دہن، یہ خطِ روئے عنبریں
غنچہ بہ غنچہ، گل بہ گل، لالہ بہ لالہ، بو بہ بو
ابرو و چشم و خال نے صید کیا ہے مرغِ دل
طبع بہ طبع، دل بہ دل، مہر بہ مہر، خو بہ خو
تیرے ہی لطفِ خاص نے کر دیے جان و دل بہم
رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ، تار بہ تار، پو بہ پو
قلب میں طاہرہ کے اب کچھ بھی نہیں ترے سوا
صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ

سوزی نے سر اٹھا کر دیکھا
کھڑکی میں کافی کا مگ اور وہ کھڑے نقوش اور سونے جیسی رنگت والا وجیہہ لڑکا دیکھائی دیا تھا
جو شاید مغرور تھا یا بداخلاق؟
شافیہ نے نیلے آسمان کو سیاہ ہوتے دیکھا یہ ہر روز اس کا معمول تھا ایک جیسی زندگی ایک جیسا وقت ایک جیسے منظر۔زندگی رکی نہیں تھی مگر اداس ضرور تھی
اس بے نام اداسی کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ہشام ایک ڈاکٹر تھا اور مغرب کے ڈاکٹرز کی مصروفیت شاید دوگنا تھیں وہ بہت ہی مصروف رہتا تھا۔شاید دن اور رات کی اس تفریق میں سوا جم جانے اور ایکسر سائز کے کوئی تیسرا اس کا کام نہیں تھا۔ہاں وہ اپنی ڈائٹ اور فٹنیس کو ضرور اہمیت دیتا تھا۔
شافیہ چار گھنٹے کی زبان سیکھنے کے بعد کل وقت فری ہی ہوتی تھی۔گھر میں کام بھی کچھ خاص نہیں تھا۔دو افراد کا کام ہی کتنا ہوتا ہے۔ہشام کا کھانا پینا سلیکٹیو تھا اور اپنی مرضی سے ہی کھاتا تھا سو شافیہ کو

کچھ خاص تردد نہیں کرنا پڑتا تھا۔اس دن بورنگ روٹین میں ایک خاص بات یہ ہوئی تھی کہ ھشام اسے لینگویج اسکول سے لینے آ گیا تھا۔شافیہ بے انتہا حیران تھی

''ارے آپ اور یہاں؟"

"میں نے سوچا تمہیں پک کرلیتا ہوں بس سے تو روزانہ آتی ہو۔"اس نوازش کی اسے سمجھ نہیں آئی تھی مگر نجانے کیوں اسے اچھا لگا تھا۔

ھشام کی گاڑی بھی اسی جیسی شاندار تھی۔

گاڑی گھر کے رستے پر نہیں تھی۔بلکہ ایک قدیم سے ریستوران کے قریب رک گئی تھی

"ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"میرا خیال ہے یہاں لوگ کھانا کھانے آئے ہیں۔"ھشام مسکرایا تھا۔

شافیہ کے لبوں پر اس اپنایت پر مسکان آگئی تھی

"مصروفیت کی وجہ سے تمہیں وقت نہیں دے سکا"

"اچھا تو یہ ازالے کے طور پر ہے۔

مجھ سے کچھ کہا ہے؟"

ھشام چونکا تھا مگر شافیہ نے قسمت کے عطاء کیے اس وقت کو ضائع نہیں کیا تھا

ھشام اس کی قسمت تھا۔اور قسمت کس وقت کہاں لے جائے؟ وہ قسمت پے پورا بھروسہ کرتی تھی اور اپنی زندگی کہ اس موڑ پر حیران نہیں تھی۔

"آج کل کچھ پڑھا نہیں؟"

"ہاں کچھ پڑھا تو ہے۔"

"پھر سنا دو۔"وہ کینڈلز کی لو دیتی روشنی میں ایک حسین خواب کی طرح لگ رہا تھا

''دنیا کی پہلی خوشی "

اس نے نظم کا عنوان پڑھا تھا

"میری بھولی بھالی

تیرے روپ کی ایک ہی تشبیہ ہے

پوری دنیا میں

خواب میں چاند کو دیکھنا جیسے

اونٹنی تجھے ماں کی طرح چاہتی ہے

تیرے جنم روز

اس نے اپنے بچے کو دودھ چھڑا دیا

پپیہے کے بچے تجھے شام کو اپنے ساتھ

گھر لے جانا چاہتے ہیں

تیرے گلو کے قہقہے سن کر

ساری گاگریں میٹھی ہو گئیں ہیں

تیرا باپ ہی تجھے

لقطے میں ملی

گری پڑی چیز سمجھتا ہے

حالانکہ

تیرے آنے کے بعد

بادل جب بھی آئے ہیں برسنے کے لیے

آسمان نے انہیں ایک ہی سندیسہ دیا ہے

صرف اس کی سبز آنکھوں کے لیے!!۔"

"بہت عمدہ۔"

ہشام نے تعریف کی تھی

"میری ایک دوست ہے۔تمہاری طرح کتابوں کی باسی ہے۔کتابوں سے عشق کرتی ہے۔میں تم کو اس سے ملواؤں گا۔"

ہشام نے اچانک گفتگو موڑ دی تھی

"وہ میری بہت اچھی دوست ہے دراصل اس کی دادی کے ہاتھ کا پنیر مجھے پسند تھا۔بد قسمتی سے اوپر تلے چند حادثوں میں اس کا خاندان چل بسا۔تب میں یہاں نہیں تھا۔اس کے ساتھ نہیں تھا۔"

'کیا وہ آپ کی کولیگ ہے؟"

اس نے بے معنی سی بے چینی کے ساتھ پوچھا۔اس لیے کہ ہشام کا انداز بے معنی نہیں تھا ہزار اسرار پوشیدہ تھے اس لہجے میں۔ایسے جیسے ان کہی کوئی کہانی اس کے مہر بہ لب لبوں کے پیچھے کرلا رہی تھی

"نہیں وہ چھوٹی سی ہے ۔شاید تم سے بھی چھوٹی ہو۔اس نے ابھی ہائی اسکول پڑھا ہے۔وہ البانوی مسلم فیملی سے ہے۔"

ہشام کا اتنی تفصیل بتانا شافیہ کے لیے ایک دھڑکے سے کم نا تھا۔وہ اتنا تو بولتا ہی نہیں تھا مگر اپنی دوست کے بارے میں بتاتے ہوئے اس کا لہجہ شریں بیان تھا۔شافیہ کو عجیب سا دھڑکا لگا۔

" آپ نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا۔"

"ہاں پہلے ہماری بات نہیں ہوئی۔ابھی اس کی بیکری نہیں چلتی۔کبھی پہلے تم آتی تو ادھر کا پنیر تم کو ضرور ٹیسٹ کرواتا۔"

شافیہ نے سمجھا تھا کہ وہ کسی ہائی فائی لڑکی کے بارے میں اس کو بتائے گا جو ہشام جیسی ہی شاندار ہوگی۔

مگر اسے سلی کو دیکھ کر سچ میں مایوسی ہوئی

وہ ایک کمزور کم گو اداس اور زندگی سے بہت ہی دور لگی تھی۔وہ ہشام کی کس حد تک دوست ہو سکتی تھی؟

یہ بات اسے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

اس لڑکی کے بجھے چہرے پر ہشام کو دیکھ کر جو قندیل روشن ہوئی تھی اس نے سب کچھ واضح کر دیا تھا اور ہشام کی آنکھیں اس کا طواف کر رہی تھیں ۔

شافیہ کے دل نے ایک سو اسی کی رفتار میں ڈوبنا شروع کر دیا تھا۔

"تو کیا یہ ہشام کی محبوبہ ہے؟"

وہ کہیں بھی ہشام جیسے حسین دلفریب اور سحر انگیز بندے کے ساتھ نہیں جچتی تھی

کہاں وہ خوشبو میں بسا دنیا کی مہنگی میڈیکل یونیورسٹی میں پڑھا ایک کام یاب دولت مند ڈاکٹر۔اور کہاں وہ پرانی اسکرٹ میں ملبوس کمزور اور بدحال سی نوعمر لڑکی جس کا بمشکل ہائی اسکول ختم ہوا لگتا تھا۔

ہشام کا اس کے لیے اتنا نرم اور اتنا کیئرنگ انداز دیکھ کر شافیہ کا دل سنبھل نہیں رہا تھا۔

اس نے سب سے پہلے اس کا چیک اپ کیا۔اس کی نبض دیکھی ۔بلڈ پریشر چیک کیا جبکہ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے

"اچھا نا'میں اب ٹھیک ہوں میں تم دونوں کے لیے کچھ لاتی ہوں۔یا ہم مل کر کھانا کھاتے ہیں ۔"وہ بہت ایکسائیٹڈ لگ رہی تھی جب شافیہ نے اسے بتانا چاہا کہ وہ ڈنر کر چکے ہیں تو ہشام نے ابرو کی جنبش سے اسے روک دیا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ سلسبیل مجھے کھانا کھلائے گی۔چلو میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔"

اور وہ دونوں کچن میں چلے گئے تھے کچھ دیر بعد ایک اور لڑکا خطیب آ گیا تھا ۔

"میں نے ہشام کی گاڑی دیکھی ہے سلی! کیا ہشام آیا ہے؟"وہ لونگ روم میں آیا تو سامنے شافیہ موجود تھی

"او آپ بھی یہاں ہیں۔پھر تو واقعی میں ہشام آیا ہے۔"

"آپ آسکتے ہیں۔"

"جی کیوں نہیں۔جب بھی ہشام ادھر آتا ہے تو سوزی کا سارا خاندان فری چیک اپ کے لیے

باہر لائن میں کھڑا ہوتا ہے۔"

سوزی بھی کہیں پیچھے ہی تھی وہ شاید کچھ لائی تھی۔ وہ سب دوست تھے آپس میں بہت بے تکلف بھی تھے۔

"تم کیوں جیلیس ہو۔"

"تم ہمارے دوست کا استعمال کرتی ہو ہم جیلس بھی نہ ہوں۔"

ان دونوں کی تکرار میں شافیہ اپنی پریشانی بھول گئی تھی وہ دونوں بہت ہی مزے کی شخصیات تھے دونوں کی گولہ باری مسلسل جاری تھی۔

"تم کھانے کی خوشبو سونگھ کر اتر آئے ہو گے تو اس آدم بیزار کو بھی بلا لاتے۔"

سوزی کا اشارہ شاید خداداد کی طرف تھا

"وہ تو صبح سے لاپتہ ہے۔"

خطیب نے بتایا تھا

سوزی کچن میں گئی تو خطیب کو خیال آیا۔

" آپ ہشام کی کزن ہیں مگر اس سے بہت الگ ہیں۔"

"میں ایشین اور وہ فارنر لگتا ہے اس لیے؟"

"نہیں مزاج کی بات کر رہا ہوں کیا آپ ہشام کے ساتھ بور نہیں ہوتیں؟"

"ارے ایسی بات نہیں ۔" وہ مسکرادی تھی

" ہم تو بور ہو جاتے ہیں بس ہشام اور سلی ایک دوسرے کے ساتھ خاموشی میں بھی بہت خوش رہتے ہیں۔"

خطیب مسکراتے ہوئے بتا رہا تھا

"دونوں کو ایک دوسرے سے محبت جو بہت ہے۔"

اور شافیہ کو چکر سا آیا تھا۔

اسے لگا تھا اس کا دل ایک لمحے کو رکا ہے۔

"ہشام اور سلی کو ایک دوسرے سے محبت جو بہت ہے"

شافیہ کے کانوں میں یہ بازگشت بار بار گونج رہی تھی

"تو کیا یہی لڑکی تھی جس سے ہشام شادی کرنا چاہتا تھا؟"

اس کا دل بہت زور زور سے پھڑ کنے لگا تھا

" کیا وہ یہی لڑکی؟ یعنی ہشام کی محبوبہ ایک سادی سی البانوی لڑکی؟"

وہ تو کہیں سے بھی ہشام کے میعار پر پورا نہیں اتر رہی تھی

تو کیا ہشام کی یہ پسند تھی؟

اسے کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی جب اس نے ہشام کو اپنی آنکھوں سے سلی پر فریفتہ ہوتے دیکھ لیا تھا

عورت مرد کی ہر نگاہ پہچان لیتی ہے۔

اور اپنے مرد کی تو ہر نگاہ

مگر ہشام اس کا مرد کہاں تھا؟

وہ تو صرف ایک وعدے کی پاس داری کے طور پر اس کے ساتھ اس کا محافظ تھا

جب وہ بھرے پیٹ کے ساتھ دوبارہ اس کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا جب وہ اس کی پلیٹ وقفے وقفے سے بھر رہا تھا۔

جب وہ اسے مسکراتا دیکھ کر واری صدقے جا رہا تھا

جب وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس بیمار نظر آتی لڑکی پر قربان جا رہا تھا

شافیہ کا دل ہر منظر سے اچاٹ ہو گیا۔ ہر چیز دھندلا گئی تھی۔ ہر منظر پھیکا تھا کاش کہ وہ کچھ نہ جانتی کچھ نا دیکھ پاتی ایلس منرو نے سچ ہی کہا تھا۔

"۔ مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں دنیا کے بارے میں مختلف خیالات رکھتی ہوں اور

اگر یہ دوسروں پر عیاں ہوگیا تو مجھے شرمندگی اور مشکل ہوگی۔ میں نے یہ بہت کم عمری میں سیکھ لیا تھا کہ چیزوں کو چھپا لینا چاہیے اسی لئے، میں نے، شاید، کہانیاں بنانا اور ان میں ہی گم رہنا ضروری سمجھا۔۔۔"

کاش وہ بھی کسی کہانی یا کردار میں گم ہو جاتی یا وہ کسی تخلیق کار کا کوئی کردار ہوتی اور سفارش کر کے اپنی مرضی کی زندگی لمحات اور پسند کے کردار میں تبدیل ہو جاتی۔

اس نے ہشام کو بہت دن بعد بے فکر اور خوش دیکھا تھا۔ وہ سلی کے ساتھ کس قدر مطمئن تھا جیسے اس کی کوئی اور مصروفیت ہی نا ہو۔

جیسے اسے کہیں اور جانے کی جلدی ہی نا ہو۔

"سلی! تمہیں اپنا وہ میمنا یاد ہے جس نے مجھے سینگھ مارا تھا۔"

"وہ اتنی پرانی بات۔"

وہ ہنس پڑی تھی۔ شافی دھک سے رہ گئی تھی اس نے اتنی گنگناتی ہنسی کبھی نہیں سنی تھی۔ جیسے بہتے جھرنے ہوں۔ جیسے کہیں کوئی کوئل کوک رہی ہو اس لڑکی کو دیکھ کر اس ایک ہی لفظ ذہن میں آ سکتا تھا "شہد سی میٹھی۔"

شافی کا دل موسم خزاں کی طرح اداس ہو رہا تھا ڈوب رہا تھا۔

خزاں میں میں نے اپنے سارے غم اکٹھا کیے۔۔۔ اور انہیں اپنے باغ میں دفن کر دیا۔۔۔

اور پھر جب اپریل لوٹ کے آیا۔۔ اور بہار زمین کو سجانے آئی۔۔۔ تو میرے باغ میں دوسری جگہ کے پھولوں کے برعکس بہت زیادہ خوبصورت پھول کھل اٹھے۔۔۔

اور جب میرے پڑوسی انہیں دیکھنے آئے۔۔۔ تو سب ہی نے کہا۔۔۔

"اب کے جب خزاں دوبارہ آئے۔۔۔ تو بیج بونے کے وقت کیا تم ان پھولوں کے بیج ہمیں دو گے۔۔۔ تا کہ ہم بھی اپنے باغ میں انہیں اگا سکیں۔۔۔"

وہ سوچوں کے بھنور میں دور تلک ڈوب رہی تھی۔

:بیمار لڑکی بہار کے پہلے پھول کی طرح کھل رہی تھی۔ زرد چہرے پے رنگ تھے خوشی تھی اور بہت سارا سکون نظر آ رہا تھا۔

" کل خطیب اور سلی نے اپنے اپنے گھر چمکائے ہیں۔" سوزی نے سوچا کہ لگے ہاتھوں ان کے کارنامے بھی بتا دیے جائیں

" تبھی میں کہوں ہر چیز صاف ستھری کیوں ہے۔"

ہشام نے حیران ہونے کی پوری اداکاری کی تھی۔

" اور تم نے غور نہیں کیا۔ سلی تو نہائی بھی ہے۔" اس کی شرارت پر سلی نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

اب کہ ہشام نے اداکاری کی انتہا کرتے ہوئے کہا تھا

" اچھا تو میں بھی یہ سوچ رہا تھا کہ آج بواریا میں اتنی روشنی کیوں تھی؟۔"

" اور خوشبو بھی۔"

سوزی نے ٹکڑا لگایا تو سارے میں ان کی ہنسی کے شگوفے پھوٹ پڑے تھے۔

اس نے درد سے بند ہوتی آنکھ میں اپنے مچل پڑتے آنسو کو چھپا لیا تھا۔

أیا ربۃ الخدر التی أذہبت نسکی

علی کل حال أنت لا بد لی منکِ

" او سکارف اوڑھنے والی پری! جو مجھے قربان کر چلی ہو، ہر حال میں میرا رخ تمہاری ہی طرف رہے گا"

اس کا دل موم کی طرح پگھل گیا۔ اس نے محسوس کیا۔ وہ سب لوگ جوان دو لوگوں کے آس پاس تھے وہ اس سارے منظر میں بیکار تھے۔

ان دو لوگوں کو کسی تیسرے کی ضرورت ہی نہیں تھی

وہ ڈاکٹر ہشام ایک ایسی لڑکی پر قربان ہو رہا تھا جو کہیں سے بھی اس کے جوڑ کی نہیں تھی

مگر محبت کیا جوڑ توڑ سے کی جاتی ہے؟

کیا محبت میں حساب کتاب ہوتے ہیں؟

کیا محبت معیار اور اسٹیٹس دیکھتی ہے؟

محبت تو یقینی طور پر کچھ بھی نہیں دیکھتی۔

محبت بس محبوب کا قرب دیکھتی ہے

یہ بات شافیہ کو سمجھ آگئی تھی

:نزار قبانی لکھتے ہیں

" گھر میں قید محبت

میں نے تم سے اجازت مانگی ہے

جب خون' جو پانی میں تبدیل نہیں ہو سکتا تھا'

پانی میں تبدیل ہو گیا ہے

جب آسمان' جس کا نیلا شیشہ'

سمجھا جاتا تھا کہ ٹوٹ نہیں سکتا'

ٹوٹ گیا ہے

جب سورج' جو میں نے تمہارے کان میں

چین کے آویزے کی طرح آویزاں کیا تھا

زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے

جب الفاظ

جس سے میں تمہیں ڈھانپ دیا کرتا تھا

جب تم سو جایا کرتی تھی

بد کے ہوئے پرندوں کی طرح اڑ گئے ہیں

تمہیں بے لباس چھوڑ کر

میں نے تم سے جانے کی اجازت مانگی ہے
جب وہ انتشار 'جو تیرے سینے میں ہے
میری خواہش سے ہم کلام نہیں رہا
جب کوئی خواہش نہیں رہی
تم سے بات کرنے کی
تم سے محبت کرنے کی
جب مجھ میں کوئی جوش نہیں رہا
کسی پر حملہ کرنے کا
کسی کو بچانے کا
ہم وقت کے دائروں میں گھر گئے ہیں
جہاں میرے ہاتھ اور تمہاری کلائی میں
فاصلہ تبدیل نہیں ہو رہا
جب تمہارے جسم اور میرے سونگھنے کی حس
کے درمیان فاصلہ تبدیل نہیں ہو رہا
جب تمہارے جسم اور میری موت کے دائرے میں
فاصلہ تبدیل نہیں ہو رہا
میں نے تم سے جانے کی اجازت مانگی ہے
اتنے قلیل وقت میں
محبت نہیں کر سکتا
نہ ہی میرے پاس وہ جذبات
اور بوسے ہیں

جو میں اس دوران واجب الادا بلوں کی طرح
کسی نہ کسی طرح ادا کر دیا کرتا تھا
میں نے تم سے اجازت مانگی ہے
ایک لمبی رخصت پر جانے کے لئے
میں جذبات سے تنگ آ گیا ہوں
تھک گیا ہوں
نہ محبت رہی ہے نہ خواہش
میں اس سجے سجائے گھر سے بھی اکتا گیا ہوں
جہاں میرے جذبات
اس کی دیواروں کی طرح چوکور ہیں
میری خواہشات
اس کے بڑے کمرے تک محدود ہیں
اور میری امنگیں بھی
اس کی چھت سے اونچی نہیں ہیں
میں پھاڑ دینا چاہتا ہوں
یہ تمثلاتی پہناوے
یہ تمہارے آلات اور تمہارے نقاب
سب کو گولی مار دینا چاہتا ہوں
توڑ دینا چاہتا ہوں
وہ تمام رنگین بوتلیں
جن میں میرا خون بھرا ہے

کاٹ دینا چاہتا ہوں
انگوٹھیوں اور ہاروں کے یہ جنگل
جن سے تم مجھے لبھانا چاہتی ہو
چمڑے کی وہ پٹی بھی توڑ دینا چاہتا ہوں
جس سے تم مجھے مارتی ہو
تباہ کر دینا چاہتا ہوں
تمام کلپ اور سوئیاں
ناخن پالش اور جستی زنجیریں
جو تم مجھ سے اعتراف کرانے کے لئے
استعمال کرتی ہو
میں وہ تمام نظمیں بھی قتل کر دینا چاہتا ہوں
جو میں نے لکھ کر تمہیں سنائی
اور وہ تمام انتسابات بھی
جو میں نے جاری کئے
شدید محبت یا انتہائی حماقت کے لمحات میں۔۔"

شافیہ کو لگا اس کا دل کٹ کٹ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔کوئی آگ تھی جو چاروں طرف سے بھڑک رہی تھی۔

قسط نمبر 19

شافیہ کو کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ہشام کی زندگی کا منظر نامہ مکمل تھا۔شاید یہ لڑکی ہی تھی جس سے راہ چلتے ایک عالیشان ڈاکٹر کو محبت ہو گئی تھی۔
کیا پتہ وہ کوئی بھیڑ چرا رہی ہو، یا پنیر بیچ رہی ہو، یا کسی چائے خانے میں پرانی کتب کا مطالعہ کر رہی ہو۔محبت انسان کو ایسے ہی جکڑ لیتی ہے۔بے بس کر دیتی ہے۔اور تابع کر دیتی ہے۔شافیہ کو اپنا دل خالی لگ رہا تھا۔لوگوں کی نظروں میں اچھا بننے، انکی توقعات پر پورا اترنے اور ان کی محبت کے حصول کی دوڑ میں ہم خود کو گم کر بیٹھتے ہیں۔جسکے نتیجہ میں ہم تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

In the race of achieving people's acceptance and love, we end up losing oursel

''خلوتِ دل

خلوتِ دل کو

غبار نے آن گھیرا ہے

اے بہاروں میں پھول کھلنے کی وجہ!

بے قراروں نے

فانوس، آئینے اور پانی کے ساتھ

کئی سال ہوئے

تمہاری طلب کے لیے
صف باندھ رکھے ہیں
چشمہ ساروں میں
تمہارا پیر رکھنا
غموں کی عادت ڈالی ہوئی مچھلیوں کے لیے
رقص کا باعث ہے
اے بے ادعا اچانک روشنی
رات کے جاگے ہو ؟ں
کے آنسوؤں کے کاندھوں پر
برس لے!
اگرچہ
تمہارے ظہور تک
حصاروں میں قید رہے گا
آزادی سے کھلتے ہوئے پروں کا تازہ مضمون
گھیروں میں
عزلت نشیں ہیں
پھر بھی ہم
تمہارے راستے کی انتہا پر نظریں رکھے ہوئے ہیں
اور جہاں تک ممکن ہو
(ہم رہیں)
اور ایسے انتظار۔''

زہرا محدثی کا انتظار آنکھوں لفظوں سے نکل کر آنسو بن کے پھیل رہا تھا۔سلی نے بہت دیر سے چپ بیٹھی لڑکی سے کہا۔

''شافیہ! کیا تم کتابوں میں دلچسپی رکھتی ہو۔''؟

''آں ہاں۔'' وہ پاکستان کی لڑکی چونک گئی تھی۔،

''اور نظموں کے بارے میں کیا خیال ہے؟۔''سلی نے ایک اور سوال کیا۔

''جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔''

''تم کو پھر ایک نظم سنا دوں؟۔''

''تو اس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے۔''شافیہ سے پہلے ہی ہشام بول پڑا تھا۔سلی مسکرا دی تھی، پھر اس نے ایک ردھم ایک نظم گا کر سنائی تھی

''کیوں کہ خون اور شراب کا رنگ بھی سرخ ہے

اس لئے

اس دن

اس نے نہیں پہنا

گہرے سرخ رنگ کا کوٹ

جب پکڑا اسے مردہ عورت کے پاس سے

اس کے ہاتھ رنگے تھے

خون اور شراب سے

بیچاری عورت

جس سے وہ پیار کرتا

مار ڈالا اس کو اس نے بستر میں

اب وہ چل رہا تھا

سزا موت کے قیدیوں کے بیچ
بھدے رنگ کے کپڑے پہنے
اس کے سر پہ کرکٹ کیپ تھی
اس دن نہیں دیکھا میں نے
اس جیسا اداس انسان
گہری سوچ میں ڈوبا
وہ دیکھ رہا تھا
نیلے معمولی سائبان کو
جسے قیدی خوش دلی سے آسمان کہتے تھے
اسی دوران ایک ٹکڑا بادل کا
ٹوٹ کر
سفید لہروں میں ترتا گیا
دور تلک
قیدیوں کے بیچ میں بھی چل رہا تھا
اپنی طرح کی مصیبت زدہ روحوں کے درمیان
وہ چکر لگا رہی تھیں
ایک دائرے میں
میں سوچ رہا تھا
کہ اس انسان نے کوئی معمولی غلطی کی ہے
یا عظیم خطا؟
بلند ہوئی اس دوران

ایک سرگوشی

ہجوم میں سے

"اس حرام خور کو لٹکا دینا چاہیے"

اے رحم دل مسیح !!

یہ سن کر مجھے ایسا لگا

کہ جیل کی دیواریں گھومنے لگی ہیں

اور آسمان دہکتا آہنی خود ہے

جو رکھ دیا گیا میرے سر پر

پہلے ہی بے پناہ تکلیف میں تھا میں

اس لئے اس درد کو اور محسوس نہیں کر سکتا تھا۔"

سب نے ایک انداز میں کلیپنگ کی تو سلی جھینپ سی گئی تھی۔ ڈی سوزا نے اسے اتنے دن بعد خوش دیکھ کر شکر ادا کیا تھا۔ سلی دھیرے دھیرے زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی

"ہشام تم نے ایک دفعہ وعدہ کیا تھا کہ ہمیں پام آئلس لے کر چلو گے وہاں کی شام کا منظر بہت دلفریب ہوتا ہے۔"

"میں اپنے وعدے پورے کرتا ہوں اور بھولتا نہیں ہوں۔"۔وہ مسکرا کر کافی کا آخری گھونٹ لے رہا تھا پھر اس نے شافیہ کو چلنے کے لیے کہا۔

"ہم چلتے ہیں اگر اجازت ہو۔"

"سلی! اجازت تو دو ہی نا۔ کتنی رونق ہے ہشام کے آنے سے۔"

ڈی سوزا شرارت کر رہی تھی۔

"ایک اچھی بات کے ساتھ ہم اس رات کو اختتام دیتے ہیں۔"

جب میں نے اپنی یادداشتیں لکھنا شروع کیں تو میں نے اپنے آپ کو تخلیقی سرگرمی کے چار یا پانچ

برس دیئے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں جو کچھ بھی اپنے ماضی کی یادیں تازہ کر سکا انہیں ان برسوں میں ریکارڈ کر لوں گا۔ میں نے کسی شرم یا ندامت کے بغیر اپنے آپ کو منکشف کر دیا ہے۔ بنجامن فرینکلن نے لکھا تھا:

اگر تم چاہتے ہو کہ مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد تمہیں فراموش نہ کر دیا جائے تو پھر یا تو پڑھے جانے کے قابل چیزیں لکھو یا لکھے جانے کے قابل کام کرو"۔

"اور تم آخری بات پر یقین رکھتے ہو۔"

خطیب بھی اٹھ گیا تھا۔

اب وہ دونوں جا رہے تھے اور سلی محبت پاش نظروں سے اسے جاتا دیکھ رہی تھی تب ہی ہشام نے پلٹ کر دیکھا۔ نظر سے نظر ملی تو نثار ہوتی نگاہوں نے قربان ہونے کا فیصلہ کر لیا یہ منظر بہت ساری نگاہوں نے قید کیا تھا۔ تب ڈی سوزا نے گلا کھنکھار کے ماحول کو کچھ اور خوش گوار کیا تھا وہ ایک کہانی سنانے لگی تھی۔ دریائے نیل کے کنارے ایک لکڑ بگھے اور مگر مچھ کی ملاقات ہوء۔۔۔ دونوں نے رک کے سلام دعا کی۔۔۔

"اور!۔۔۔ آپکا دن کیسا جا رہا ہے جناب"! لکڑ بگھے نے خوشدلی سے پوچھا۔۔

"کیا بتاوں بھائی" مگر مچھ نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔۔۔

"کبھی تو رنج والم اتنا بڑھ جاتا ہے۔۔۔ کہ میں آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔۔۔ میرا یہ رونا دھونا ساری مخلوق خدا کو بھی پتہ چل گیا ہے۔۔۔ اب ہر ایک یہی کہتا ہے۔۔ کہ جہاں اداسی اور آنسو ہوں۔۔۔ سمجھ لو کہ یہ مگر مچھ کا کیا دھرا ہے۔۔۔ اپنی اس منفی شہرت سے جو دکھ مجھے ہوتا ہے۔۔ وہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔۔۔"

"یہ سب اس لئے ہوتا ہے میرے بھائی! کہ تم ہمیشہ دکھ درد کی باتیں کرتے رہتے ہو!۔۔۔ دوسری طرف مجھے دیکھو! ایک لمحے کو سوچو!۔۔۔ میں ہمیشہ کائنات کی خوبصورتی اور اسمیں موجود عجائبات اور معجزات کو دیکھتا ہوں اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔۔۔ یہ مثبت سوچ میرے دل کو اتنا مطمئین اور خوش کر دیتی ہے۔۔۔ کہ میرے قہقہے دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں۔۔ اور سارا جنگل

کہ اٹھتا ہے۔۔ کہ جہاں خوشی اور شادمانی نظر آئے تو سمجھ جاو۔۔ کہ یہ لکڑ بگھے کا کمال ہے۔''

سب بے ساختہ مسکرا اٹھے تھے اور سب نے تائید بھی کی۔

بواریا حسین ہے۔ اپنے جنگلات کی وجہ سے اور جھیلوں کی وجہ سے۔ اور چشموں کی وجہ سے۔ مگر ہشام کو بواریا سلسبیل کی وجہ سے خوب صورت لگتا تھا۔ آج کی رات اس سچ کے ساتھ شافیہ نے اختتام کی تھی

''یہ جنگل کس کا ہے؟

شاید میں اس کو جانتا ہوں۔۔۔

اُس کا گھر نزدیک اک گاؤں میں ہے لیکن

مجھے وہ برف میں لپٹے ہوئے جنگل میں دیکھے گا نہیں ہرگز۔۔۔

میرا کم عمر گھوڑا کس قدر حیران ہوگا

دل ہی دل میں سوچتا ہوگا

کہ ہم کیسی جگہ پر رک گئے ہیں

جس جگہ نزدیک کوئی فارم ہاؤس ہی نہیں۔۔۔

وہ دل ہی دل میں سوچتا ہوگا

کہ آخر سال کی سب سے سیہ شب

برف میں لپٹی ہوئی اس جھیل اور جنگل کے بیچوں بیچ جانے کیوں رکے ہیں ہم؟

وہ گردن میں بندھی گھنٹی بجا کر پوچھتا ہے۔۔۔

کیا ہوا؟ کچھ مسئلہ ہے؟

اس کی گھنٹی کے علاوہ یا ہوا کا شور ہے

یا برف گرنے کی صدا ہے۔۔۔

کس قدر تاریک جنگل ہے، گھنا ہے، دلنشیں ہے

پر مجھے کچھ نامکمل عہد و پیماں کو نبھانا ہے

مجھے سونے سے پہلے تک بہت ہی دور جانا ہے
مجھے سونے سے پہلے تک بہت ہی دور جانا ہے۔''

سلی ان سب کے چلے جانے کے بعد اپنے اس والدین کے گھر کے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر رہی تھی۔

یہ وہ گھر تھا جو کبھی اس کا نہیں تھا می نے کبھی اس گھر کے ساتھ اپنایت نہیں ہونے دی تھی سوا اجنبیت کے کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اور جب یہ انسانوں سے خالی ہوا تو سارے کا سارا اسلی کا ہو گیا۔ بغیر چاہ کے خواہشات کا پورا ہونا بھی اداس کر دیتا ہے۔ لوگوں کے لیے والدین کے گھر الگ کیفیات رکھتے ہیں

''والدین کا گھر
صرف یہی وہ گھر ہے
جہاں آپ جب جی چاہے
بغیر کسی دعوت کے جا سکتے ہیں
یہی وہ گھر ہے
جہاں آپ دروازے میں چابی لگا کر
براہِ راست گھر میں داخل ہو سکتے ہیں
یہ وہ گھر ہے
کہ جہاں محبت بھری نگاہیں
اس وقت تک دروازے پر لگے رہتی ہیں
جب تک آپ نظر نہ آ جائیں
یہ وہ گھر ہے
جو آپ کو آپ کی بچپن کی بے فکری

اور خوشیوں کے دن یاد دلاتا ہے

یہ وہ گھر ہے

جہاں آپ کی موجودگی

اور ماں باپ کے چہرے پر محبت کی نظر ڈالنا باعثِ برکت ہے اور ان سے گفتگو کرنا اعزاز کی بات ہے۔

یہ وہ گھر ہے

جہاں آپ نا جائیں تو

اس گھر کے مکینوں کے دل مرجھا جاتے ہیں۔

یہ وہ گھر ہے

جہاں ماں باپ ک صورت میں

دو شمعیں جلی رہتی ہیں

تا کہ آپکی دنیا کو روشنی سے جگمائیں

اور آپ کی زندگی کو خوشیوں اور مسرتوں سے بھر دیں

یہی ہے وہ گھر

جہاں کا دستر خواں خالص محبتوں سے بھر پور اور ہر قسم کی منافقت سے پاک ہے

یہ وہ گھر ہے

کہ اگر یہاں کھانے کا وقت ہو جائے

اور آپ کچھ نہ کھائیں

تو اس گھر کے مکیں وں کے دل ٹوٹ جاتے ہیں

اور وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔

یہ وہ گھر ہے جہاں

آپ کو ہر قسم کی خوشیاں

اور قہقہے میسر ہیں

آہ ہ ہ ہ۔۔۔لوگو

ان گھروں کی اہمیت کو پہچانیں

قبل اس کے کہ بہت دیر ہو جائے۔"

وہ لوگ بہت خوش قسمت ہیں

جن کے پاس والدین کے گھر ہیں۔

ہے سلی!" تب ہی ڈی سوزا گھر کے ٹیرس سے لٹک گئی تھی۔

سلی نے چونک کر یادوں کو جھٹکا اور کھڑکی تک آئی تھی

"میری نظموں والی کتاب ریک پہ دھری رہ گئی ہے۔وہ ہی جو مجھے خطیب نے دی تھی۔"

"اچھا میں دیکھتی ہوں۔"سلی نے سر کی جنبش سے اسے تسلی دی اور ریک دیکھنے لگی۔وہاں ایک کتاب پڑی تھی

محمود درویش کی یہ کتاب آج کل ڈی سوزا بہت پڑھ رہی تھی۔ایک ورق بھی اس میں دھرا تھا۔

سلی نے دیکھا۔یہ جرمن میں ترجمہ تھا۔

"سیاہ تلی میرے دل کے اندر

اور لب پہ۔۔۔بھڑکتے ہوئے شعلے

کس ویرانے سے آئی ہیں

اے غصے کی تمام صلیبیں؟

سمجھوتہ کر لیا میں نے اپنے غموں اور رنجوں سے۔۔

اور اپنا لیا میں نے آوارگی اور بھوک کو

میرا ہاتھ غیظ و غضب کی تصویر بن گیا ہے۔۔

میرا کنجِ لب غصے سے سرگشتہ ہو گیا ہے۔۔

اور میری رگوں میں غصے کا لہو دوڑ رہا ہے!

اے مجھے پڑھنے والے!

تو مجھ سے سرگوشی کی امید چھوڑ دے!

اور مجھ سے میرے نغمہ سرا ہونے کی آس چھوڑ دو

یہ میرا اپنا عذاب ہے۔۔

ایک بے سوچی سمجھی چوٹ ریت میں

اور دوسری بادلوں میں!

میرے لیے کافی ہے کہ میں غضبناک ہوں

اور آگ کا پہلا مرحلہ غصے کی شکل میں ہوتا ہے!۔"

اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔خطیب اور ڈی سوزا کی چوائس کتنی ملتی جلتی تھی۔یا یہ مماثلت سلی کو اب نظر آنے لگی تھی

اس نے کتاب ڈی سوزا کو دی تھی۔

"مجھے زندگی کی قیمت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔جب بھی رخ کی تصاویر خطیب کے پاس دیکھتی ہوں تو زندگی مہنگی لگتی ہے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر زندگی قیمتی لگتی ہے۔"

ڈی سوزا نے کتاب کیچ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں کبھی زندگی کو بے دردی سے کھونا نہیں چاہتی اور سلی یاد رکھنا!تم کو بھی اپنی زندگی کی حفاظت کرنی ہوگی۔"

اس کا فلسفہ ایک حقیقت تھا۔ہر حساس انسان رخ میں انسانی گوشت اور جسموں کی بیحرمتی سے لرزا ہوا تھا۔

"تم سے ایک بات کہوں۔"؟

سلی نے کھڑکی بند کرنے سے پہلے کہا
''تم خطیب سے کم ملا کرو۔''
پھر سلی نے کھڑکی بند کردی تھی۔
اس شب سلی کو بہت سکون سے نیند آئی تھی مگر ایک خیال اسے بار بار ستا رہا تھا۔
''شافیہ اور ہشام۔''؟ وہ ایسا بالکل سوچنا نہیں چاہتی تھی۔
''ہشام میرا ہے۔'' اور یہ بات ایک یقین کی طرح اس کے دل میں گڑھی ہوئی تھی۔
''ہشام اور شافیہ ایک کزن کے سوا کچھ بھی نہیں۔''
اور اس رات وہ آخری بات بس یہی سوچ سکی تھی اگلی صبح بہت رنگین تھی۔ وہ تازہ دم محسوس کر رہی تھی پھر وہ کافی دودھ لینے چلی گئی آج اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔
راستے میں وہ بار بار ایک پوئم گنگناتی رہی
'ہر لمحہ کوئی نہ کوئی یہ دنیا پیچھے چھوڑ جاتا ہے ۔ عمر کا اس سے کچھ سروکار نہیں ہے۔
ہم سب اس سے بے خبر ''قطار'' میں لگے ہوئے ہیں.
ہم کبھی نہیں جان پاتے کہ ہمارے آگے کتنے لوگ ہیں۔
ہم اپنی جگہ چھوڑ کر قطار کے پیچھے نہیں جا سکتے۔
ہم قطار سے قدم باہر نہیں لے جا سکتے۔
ہم قطار سے دامن نہیں بچا سکتے.
لہذا جب ہم قطار میں انتظار کرتے ہیں:
لمحات کو شمار کریں۔
ترجیحات بنائیں۔
وقت نکالیں.
تحائف کو معروف کریں.

کسی اجنبی کو اپنا بنائیں۔

اپنی صدا قابل سماعت بنائیں۔

چھوٹی چھوٹی نیکیوں سے بڑا اجر کمائیں۔

کسی کو ہنسائیں۔

کوئی تبدیلی لائیں.

پیار کریں.

خود کو سنواریں.

امن قائم کریں.

اپنے عزیز لوگوں کو یہ باور کرائیں

کہ وہ عزیز ہیں۔

اس بات کو یقینی بنائیں کہ کوئی پچھتاوا باقی نہ رہے۔

اس بات کو یقینی بنائیں کہ آپ تیار ہیں (حاضری کے لیے)...۔"

اس نے ضرورت کا سامان لیا اور اپنی دھن میں مگن آتی رہی۔

اچانک اس کے موبائل پر بپ بجی تھی اس نے اسکرین روشن کی تو ایک دلفریب پیغام تھا

"جانتا ہوں تمہاری صبح خوشگوار ہے اس کی خوشگواریت قائم رہے اس لیے میں نے سوچا کہ تم کو لکھوں آئی لو یو"

سلی بے ساختہ کھل اٹھی تھی

اور اس نے اس میسج کا جواب لکھا

"اب میں یہ لکھ سکتی ہوں کہ آئی لو یو ٹو۔"

وہ پھر وہ کھلکھلا دی تھی

کچھ دیر بعد اسکرین پر بہت کچھ لکھا نظر آیا تھا

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ روبرو
شرح وہم غم تورا نکتہ بہ نکتہ، مو بہ مو

از پئے دیدن رخت، ہمچو صبا فتادہ ام
خانہ بہ خانہ، در بدر، کوچہ بہ کوچہ، کو بہ کو

می رود از فراق تو خون دل از دو دیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ، جو بہ جو

دور دہان تنگ تو، عارض عنبرین خطت
غنچہ بہ غنچہ، گل بہ گل، لالہ بہ لالہ، بو بہ بو

ابرو چشم و خال تو، صید نمودہ مرغ دل
طبع بہ طبع، دل بہ دل، مہر بہ مہر، خو بہ خو

مہر تورا دل حزیں بافتہ برقماش جاں
رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ، تار بہ تار، پو بہ پو

در دل خویش طاہرہ گشت و ندید جز تورا
صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ، تو بہ تو۔۔

اگر مجھے تیرے روبرو ہونے اور آمنے سامنے آنے کا موقع ملے تو میں تیرا غم نکتہ بہ نکتہ اور ہو بہو بیان کروں۔

میں تیرے چہرے کے دیدار کے لئے بادِ صبا کی مانندِ گھر گھر، در در اور کوچہ کوچہ پھرتی ہوں۔۔

تیرے ہجر و فراق میں میری آنکھوں سے دجلہ دجلہ، دریا دریا، چشمہ چشمہ اور نہر نہر خون بہہ رہا ہے۔۔۔

تیرے تنگ دہن کے دائرے، تیرے عارض اور تیرے عنبریں خط کہ مثال غنچے، گلاب کے پھول اور خوشبو کی سی ہے۔

تیرے آبرو، آنکھ اور خال نے مزاج محبت اور خوخصلت سے میرے مرغ دل کو شکار کر لیا ہے۔

میرے غم زدہ دل نے تیرے عشق کو جان کے تانے بانے میں بن لیا ہے۔"

سلی ایک پتھر پر بیٹھ گئی تھی

اور نم آنکھوں سے اس تحریر کے متن کو سمجھتی رہی۔

محبت اس کے لیے کافی تھی زندہ رہنے کے لیے اس سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا؟

اسے لگتا تھا اب دکھ ڈھل رہے ہیں گو کہ اپنا خاندان کھو کر کوئی سکھ میں نہیں رہ سکتا۔ جو چلے گے تھے سلی کو یاد آتے تھے یہ گھر اور اس کی ایک ایک چیز ان کی یاد دلاتی تھی۔ اس نے کہیں لکھا پڑھا تھا کہ

"دنیا میں کون ہے جو کسی محبوب کے لیے تڑپا نہ ہو، اس نے آرزو بھرے لفظوں میں یہ نہ پکارا ہو کہ اے کاش! وہ ایک بار واپس آ جائے، صرف ایک آخری بار۔۔۔؟

اس سچ کے باوجود کے ایسا کبھی بھی ممکن نہیں۔ ہماری فانی دنیا کے اندر یقیناً یہی چیز سب سے زیادہ غمناک ہے، اور اس کی اداسی مسلسل ایک دھند کی چادر کی طرح انسانی زندگی کے مکمل فنا ہونے تک اسے ملفوف کیے رکھے گی۔

Who in the world has not yearned for a loved one, has never said, If only he or she could come back

once, just one more time...? Despite the fact that it never happen, never ever. Surely this is the saddest t about our mortal world, and its sadness will go shrouding human life like a blanket of fog until its f extinction."

جب وہ گھر آرہی تھی اسے ہشام کی کال آئی تھی۔اس نے فون کان سے لگایا

"اچھا ہے کہ تم دودھ اور کافی لے آؤ تا کہ میں اچھا سا ناشتہ بنا سکوں۔"

"کیا مطلب؟"سلی حیران ہوئی تھی۔

"گھر آجاؤ حیران مت ہو۔"

اس نے فون بند کرنے سے پہلے کہا

ہر چیز تشریح (interpretation) کی محتاج ہے اور ہر چیز کی تشریح موجود ہے۔جو بھی اس کی تشریح ہے،وہ طاقت کے زیر اثر پیدا ہوئی،نہ کہ وہ سچ ہے۔

"All things are subject to interpretation. Whichever interpretation prevails at a given time is a function of po and not truth"

اب اس فلسفے کی سلی کو بلکل سمجھ نہیں آئی تھی

مگر وہ اتنی صبح اس کے گھر کیسے آیا تھا؟

ہشام جیسا انسان؟

اس کے پاس اتنا وقت کہاں تھا؟۔

"میں ایک اچھا ڈاکٹر ہوں میں ایک اچھا شیف بھی ہوں۔اب حیران ہونا ترک کردو۔"

وہ حقیقت میں سلی کے کچن میں تھا

اسے خلیل جبران کی ایک بات یاد آ رہی تھی بلکہ باتیں تو کافی تھیں اب گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ اسنے باہر کے مرر میں بلاارادہ رک کر خود کو دیکھا تھا

اور ایک شاعر نے کہا، ”ہم سے خوبصورتی کے بارے میں بات کرو۔“

اور المصطفی نے جواب دیا

”تم خوبصورتی کو کہاں تلاش کرو گے۔۔اور اسے کیسے پاؤ گے۔۔جب تک کہ وہ خود تمہارا راستہ نہ بن جائے۔۔اور تمہاری رہنماء نہ کرنے لگے“!

”اور تم اسکے بارے میں کیسے گفتگو کرو گے۔۔سوائے اسکے کہ وہ خود اس گفتگو کے تانے بانے نہ بننے لگے!

غمزدہ اور زخمی بولے، ”خوبصورتی مہربان اور شریف ہے۔۔۔اس نوجوان ماں کی طرح۔۔جو اپنی ہی عزت میں نیم شرمساری ہمارے درمیان چل رہی ہوتی ہے۔“

اور پرجوش کہنے لگے، ”نہیں! خوبصورتی ایک عظیم اور خوفناک چیز ہے۔۔ایک طوفان کی مانند جو ہمارے نیچے زمین اور ہمارے اوپر آسمان کو ہلاتی ہے“!

تھکے ہوئے بولے، ”خوبصورتی تو ایک نرم سرگوشی کی ہے۔۔جو ہماری روح کے اندر بولتی ہے، اسکی آواز ہماری خاموشیوں کے اندر ایسے پیدا ہوتی ہے۔۔جیسے سائے کے خوف سے ٹمٹماتی ہوء مدہم روشنی۔“

مگر بےچین بولے، ”ہم نے اسکی چیخ پکار پہاڑوں کے درمیان سنی ہے۔۔اور اسکی آہ و بکا کے ساتھ کھروں کی آواز اور پروں کو پیٹنے اور شیروں کی چنگاڑھ سناء دیتی ہے۔۔۔

رات کو شہر کے نگہبان بولے، ”خوبصورتی مشرق سے نکلتے ہوء سورج کے ساتھ ابھرے گی“

اچانک آئنے میں ایک دوسرا عکس ابھرا تھا

سلی ایک دم سہم کر پلٹی تو دیکھا

وہ اس کے بالکل پیچھے کھڑا تھا کہ اسکی گرم سانس اسے اپنے نتھنوں پر محسوس ہو رہی تھی

این یک دم عمر را غنیمت شمریم

فردا کہ ازاین دیر فنا در گذریم

باہفت ہزار سالگان سر بسریم

اے دوست آ، کہ ہم کل کی فکر نہ کریں

اس لمحے کی زندگی کو غنیمت جانیں

کل جب ہم اس فانی دنیا سے گذر جائیں گے

تو سات ہزار سال کے باسیوں کے ساتھ ہوں گے۔''

اس کی دھیمی سرگوشی ماحول میں ساز بجا رہی تھی

''تم سے بولا ہے نا کہ زیادہ سوچا نا کرو۔''

قسط نمبر 20

" زندگی میں اس سے برے حادثے رونما ہوتے ہیں تم اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرو جس نے تمہارا رپ کیا اس نے تمہارا قتل نہیں کیا۔ تم زمین کے اوپر ہو اور زندہ ہو۔"

ہشام نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ اس کے حوصلے کا بلند پہاڑ تھا۔ وہ اس کی ہمت تھا وہ سلی جیسوں سے بہت بلند تھا۔ وہ گرے ہوئے کو سنبھال لیتا تھا۔

جو اس میں تھا وہ کسی میں نہیں تھا

" زندہ ہوں مگر نا ہونے کے برابر ہوں،" وہ زخم زدہ لہجے میں بولی تھی

" یہ سب وقتی ہے ایک دن ختم ہو جائے گا۔"

وہ پرامید تھا

" آؤ ناشتہ بناتے ہیں۔"

وہ اس کے ساتھ کچن میں آگیا تھا

سلی کو پرسکون ہونا پڑا

" وہ تمہاری کزن نہیں آئی کیا؟۔"

" وہ اس وقت سو رہی تھی۔"

ہشام نے نارمل انداز میں کہا

" وہ واپس کب جائے گی؟۔"

سلی نے اچانک پوچھا تو ہشام چونک گیا تھا

"تم کو اس سے کیا تحفظات ہیں؟

"ایسا تو کچھ بھی نہیں۔" سلی مکر گئی تھی

"پھر پر سکوں رہو۔ وہ یہاں ہے اور اپنا کورس مکمل کرے گی جاب کرے گی ور خود مختار زندگی جیے گی۔"

"تم سب کے لیے اتنے اچھے ہو مجھے لگتا تھا یہ سب میرے لیے اسپیشل ہے۔" اس کے لہجے میں اداسی اتر آئی تھی

"میں سب کے لیے مثبت ہوں اس لیے کہ نرم دل ہوں اور تمہارے لیے یہ اسپیشل ہے میں ہر کسی کے لیے ناشتہ بنانے اور اپنی موجودگی میں اس فرد کو ناشتہ کروانے اسکے گھر نہیں جاتا۔"

اور سلی بے ساختہ مسکرا دی تھی

"اب تم ایسے ہی مسکرایا کرو۔"

اس نے ایک چیز سینڈوچ باتوں ہی باتوں میں سلی کو کھلا دیا تھا

"تم کمزور ہو رہی ہو یہ بلکل بھی اچھا نہیں سلی! تم بہادر ہو اور تم کو ثابت کرنا ہو گا۔"

وہ کافی کا سپ لیتے نرمی سے بولا

"تمہارے کیس کی ری او

پنگ ہو گی۔ اور تم کو یہ سب فیس کرنا ہو گا۔"

ہشام نے اسے ذہنی طور پر تیار کیا

"میں یہ سب نہیں کر سکتی۔" وہ رونے لگی تھی

"اس کا سامنا کرنا ہو گا سلی! ہم تمہارے مجرم کو ایسے نہیں چھوڑ سکتے۔۔"

وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

سلی کو لگا وہ بے دم ہو گئی ہے

وہ اس کے زرد چہرے کو دیکھ کر بولا "ایک کہانی سنو

مہا کیشپ نے بدھا کے بعد سب سے زیادہ روشنی پائی۔ آنند نے اسی لیے اسے گرو چنا۔ مرنے

سے پہلے وہ ہر بات کا جواب بدھا کے الفاظ میں دیتا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی بیتی زندگی کی یادداشت کھو چکا ہے مگر اسے بدھ کی طرح اپنا ہر جنم یاد تھا۔ ایک روز آنند انے اس سے زندگی کے بارے پوچھا۔ بہ معمول مہا کیشپ بولے:

"استاد گوتم کہتے تھے زندگی ایک پرانے گھنے درخت کی طرح ہے۔ اس کے کچھ پتے ہرے ہیں کچھ زرد۔ اس نے کبھی اپنے زرد پتوں کو خود نہیں گرایا ہمیشہ تیز آندھی سے خود ہی زمین بوس ہو گئے۔ بہت سے دوسرے درختوں کے پھل اس سے زیادہ خوشنما اور میٹھے ہیں مگر اس نے ہمیشہ اپنے پھل کو ہی خاص جانا۔ اس نے کسی موسم میں اپنے پھل پھول میں کمی نہیں آنے دی۔ وہ نہ دوسرے درختوں کو خود سے ارفع سمجھتا ہے نہ ان سے ناراض ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس جیسے پھول اور پھل وہ کبھی پیدا نہیں کر سکیں گے چاہے جتنے بھی اچھے پھل اگا لیں۔ وہ مٹی کو نیچے دیکھ کر کبھی مغرور نہیں ہوا کیونکہ اس کا وجود خود مٹی سے پھوٹا ہے۔ اس کو زمین کی جتنی ضرورت گھٹلی چیر کر پہلی کونپل اگانے میں تھی اس سے زیادہ آج تناور کھڑا رہنے کے لیے بھی ہے۔ بارش کے دنوں میں وہ بادل سے جی بھر کر پیار کرتا ہے مگر اپنے پرانے دوستوں سورج اور چاند کو کبھی نہیں بھولتا۔ اس نے اپنے پیٹ پر ننھی گلہریوں کے گھر کے پاس ایک زہریلے سانپ کو بھی جگہ دی ہے صرف یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ بنجارا ہے۔ جو پرندے رت بدلتے ہی الوداع کہے بغیر اس کی شاخوں سے ہجرت کر جاتے ہیں، اگلے برس وہ پھر ان کو خوش آمدید کہتا ہے جیسے وہ زندگی میں اس کے ہاں پہلی بار آئے ہیں۔ جو اس کے پھل کو پتھر اور روڑے مار مار کر نیچے گراتے ہیں وہ انہیں بھی کھانے سے نہیں روکتا مگر اپنا سب سے پکا اور میٹھا پھل چپکے سے رات کو اگلی صبح گزرنے والے بھکاری کے لیے گرا دیتا ہے۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اس کے باپ دادا کی نسل کے کتنے شجر کائنات میں موجود ہیں نہ کبھی یہ خیال کیا کہ کچھ پھلوں کا بیج وہ اپنی افزائش نسل کے لیے رکھ لے۔ اس نے کبھی یہ خواب نہیں دیکھا کہ اس کے پھولوں کی جگہ گلاب کے پھول لگیں گے۔ وہ بہت کچھ کر نہیں سکتا مگر بہت کچھ کرنے کا سوچ سکتا ہے، اس کی عمدہ سوچ اس کے ہر پھل میں اسی طرح کامل ہے جس طرح اس کے پورے وجود میں۔ جو بھی اس کا پھل کھائے گا اس کے اندر دل کی خوشبو محسوس

کرے گا۔ پت جھڑ میں وہ بہت تھک جاتا ہے مگر پھر بھی اپنے خشک پتوں پر سوئے جگنوؤں کو بے آرام نہیں کرتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ خود ہر ایک سے مل رہا ہے نہ کہ دوسرے آ رہے ہیں، اسی واسطے تمام راہگیروں کو اپنا دوست سمجھتا ہے۔ جس لکڑہارے نے اس کے ماں باپ کو کاٹا، اس نے کبھی اسے بدلے کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اور جب مچھیرے اس کی ساری ٹہنیاں کاٹ کر لے گئے، وہ حملے کے لیے ان کی تاک میں نہ رہا بلکہ اگلی صبح اس نے ان کے شکستہ چپو کے لیے اپنے بدن کا ایک جزو اور دے دیا۔ اس نے ویران گھونسلے پوری قوت سے آندھی سے جکڑ کر رکھے کہ شاید کسی معذور پنچھی کو ان کی ضرورت ہو۔ اس نے شہد کی مکھیوں سے کبھی شہد نہیں مانگا اور نہ اپنے پتے جھاڑنے والے چرواہے کے پاس دودھ لینے پہنچا مگر ایک دن اس نے اپنی سب سے بڑی اور سخت شاخ کاٹتا ایک بادشاہ پر گرا کر اسے مار دیا، کیونکہ وہ بادشاہ خود کو اس کا مالک سمجھتا تھا"۔

وہ چپ ہوا تو اس کاٹیج کی ہر چیز بولنے لگی تھی

"کبھی کبھی مجرم طاقت ور نہیں کمزور بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی مجرم وہ نہیں ہوتا جسے ہم سمجھتے ہیں۔ تم سمجھتی ہو بروزو یا روسی کے علاوہ کوئی ایسی حد کو نہیں پار کر سکتا؟ میں کل پولیس اسٹیشن گیا تھا وہاں میں مسز رابیکا سے ملاقات ہوئی تھی وہ تمہارے کیس پر بہت سنجیدہ ہے اور وہ اس پر کام کر رہی ہے۔ امید ہے جلد اس کا راستہ مل جائے گا۔"

ہشام کے چپ ہوتے ہی سلی بے قرار ہو گئی تھی

" بروزو کی نظریں گندی ہوتی تھیں اور روسی کے التفات زیادہ تھے میں نہیں جانتی اس رات کون لوگ تھے۔ یا وہ چوری کی نیت سے تھے وہ ایک آدمی تھا۔ اگر زیادہ بھی تھے تو کہیں باہر تھے وہ ایک آدمی بروزو یا روسی کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میرے گھر کو اچھے سے جاننے والے گھر کی لائٹ کا کنکشن کاٹنے والے یہی دو لوگ ہو سکتے ہیں وہ اس گھر میں سالوں آتے جاتے رہے ہیں۔

ان کے آنے اور جانے سے لگتا تھا وہ اس گھر کے سب راستوں سے واقف ہیں۔"

سلی پہلی بار اپنے کیس پر لب کشائی کر رہی تھی اس سے ہشام کو امید بندھی۔

"یہ پوائنٹ بہت اچھا ہے اس پہ یہ کیس آگے بڑھ سکتا ہے۔جب تک مجرم کو سزا نا ملے میں سکوں سے نہیں رہوں گا۔"

سلی کو اندازہ تھا وہ اسکے لیے کسی بھی حد پے جا سکتا ہے

"یم تیار رہنا رات کو ہم ہسپتال جائیں گے اور آؤٹنگ بھی کریں گے۔"

جب وہ جا رہا تھا وہ سلی کا سارا درد بھی ساتھ لے کر جا رہا تھا

چھوڑے ہوئے گھر کا گیت اس کے کان میں گونج رہا تھا

لو اب الوداع

میرے گھر

کیا معلوم ہم کب ملیں گے

کل یا کسی اور دن

کچھ دنوں بعد یا بہت دنوں بعد

ایک اور سفر درپیش ہے

لیکن اس دفعہ ہی تجھ سے ضرور کہوں گا

کہ ہم نے تیرے پتھر کے سینے کو

بہت چاہا ہے

تو نے کتنی سخاوت سے

باورچی خانے کی آگ سے گرمی سے نوازا ہے

تیری چھت

جس سے بارش کی بوندیں

انگوروں کی طرح ٹپکتی ہیں

آسمان سے گرتی ہوئی موسیقی

جب ہم تیری کھڑکیاں بند کرتے ہیں
دم گھونٹنے والی بے وقت رات
تیرے ہر کمرے پر چھا جائے گی
اندھیرے میں ڈوبا ہوا
تو پھر بھی جیتا جاگتا رہتا ہے
وقت تیرے سر پر منڈلاتا رہتا ہے
اور سیل کی گیلاہٹ آہستہ آہستہ
تیری روح کو کھاتی چلی جاتی ہے
کسی وقت
کوئی چوہا کچھ کترتا ہے کاغذ سرکتے ہیں
ایک ملفوف سرسراہٹ
ایک بھٹکا ہوا کیڑا
تھک کر کسی دیوار کے ساتھ لگ جاتا ہے
اور جب بارش آتی ہے
تو اس تنہائی میں
چھت کے ٹپکنے کی آواز
انسانی آواز کی طرح لگتی ہے
جیسے کوئی رو رہا ہو
فقط سایوں کو ہی
مقفل گھروں کے راز کا علم ہے
یا آوارہ ہوا کو

ہشام اپنے وعدے کے مطابق سِلی کو کلینک لے گیا تھا وہاں اس کا معمول کا چیک اپ ہوتا رہا جس پر سِلی سخت بیزار اور اکتائی ہوئی لگ رہی تھی ۔اس کا موڈ سخت آف تھا۔

ہشام نے اسے اشارہ کیا کہ کم سے کم نارمل تو نظر آئے۔

"سلسبیل ! کیا تم خوش نہیں ہو۔"

ڈاکٹر اس کی بیزاری جان کر حیران نہیں تھی اکثر حاملہ لڑکیاں پریگنینسی میں خوش دیکھائی نہیں دیتی تھیں۔

" میں ٹھیک ہوں۔" اسے ہشام کی خاطر کہنا پڑا تھا۔

" امید ہے یہ بچے تمہاری زندگی میں اچھی تبدیلی پیدا کریں گے آپ دونوں کو بہت بہت مبارک ہو۔"

ہشام نے ایسے مبارک باد وصول کی تھی جیسے اس سب کا ذمہ دار بھی وہ ہی تھا۔اور یہ سارا اعزاز اور کریڈٹ اسی کے سر تھا۔

واپسی پر سلی نے پوچھ ہی لیا

"تم کیوں اتنے خوش تھے؟"

"تو ناخوش ہوں؟"

اس نے الٹا سوال کیا

"مجھے الجھن ہوتی ہے۔"

" یہ الجھن تمام ہو جائے گی سب کچھ نارمل لگے گا تم پرسکوں رہو بس۔دیکھنا زندگی کتنی پیاری ہو گی۔"

" کاش ایسا ہی ہو۔"

" ایسا ہی ہو گا اگر تم منہ کے زاویے درست کر لو۔"

جب وہ اسے گھر ڈراپ کر رہا تھا اس نے سلی کو بتایا

" تم کو شاید معلوم نہیں ہے۔خداداد نے اپنے بہن بھائی کا کیس اپلائی کر رکھا تھا ان کے

ویزے لگ گے ہیں جلد ہی وہ لوگ یہاں ہوں گے امید ہے تمہارے کرائے دار اچھے ثابت ہوں ان میں ایک لڑکی بھی ہوگی وہ تمہاری اچھی دوست بنے گی۔اور تم اس کے ساتھ خوشی محسوس کروگی۔"

"کیا سچ میں؟میری بے خبری میں کیا کیا ہو رہا ہے۔"

وہ حیران اور خوش تھی...

خداداد نے جرمنی آکر جوان جتنی کوشش کی تھی وہ اس کی اپنے بہن بھائیوں کی سیٹل منٹ کی تھی وہ چاہتا تھا کہ اس کے بہن بھائی بھی ملک کو چھوڑ دیں کہ اب وہاں ایسے حالات اور تابناک فیوچر نہیں تھا۔

شایان اور سنہرے جرمنی جبکہ چھوٹے دو آسٹریا جا چکے تھے اور ان دونوں نے وہیں سیٹل ہونے کا ارادہ کر لیا تھا۔خداداد یہی چاہتا تھا کہ اس کے بہن بھائی خود مختار زندگی گزار سکیں اب وہ مطمئن تھا کہ سب اپنی اپنی جگہ محفوظ ہو چکے تھے۔شایان اور سنہرے کا فیوچر سیو تھا زبان سیکھنے کے بعد شایان کو نوکری مل جاتی اور سنہرے کی تعلیم شروع کی جا سکتی تھی

وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد گھر کا بھی بندوبست کرے مگر یہ ممکن نہیں تھا۔

ابھی وہ اس مناسب کرائے کے گھر کو چھوڑنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ویسے بھی یہاں کی مالکن ایک بے ضرر سی لڑکی تھی جو اپنے ہی حادثوں اور غموں کا شکار تھی اس کا سارا گھر بلکل تباہ ہو چکا تھا اور وہ اس صدمے کے زیر اثر تھی۔

جبکہ جرمنی میں کرائے کے مکان مہنگے تھے اور ہاؤس فراؤ بہت بدمزاج تھیں

:جرمنی آنے کے بعد سنہرے اور شایان تو بہت خوش تھے انہوں نے جتنی جرمنی کی تعریف سنی تھی اس سے زیادہ جرمنی حسین تھا

ایک دن باغیچے میں پھول چنتی سنہرے نے ایک بے حد حسین دودھ سی سفید اور بے انتہا پن ※ لڑکی کو گاتے ہوئے سنا وہ اس کا حسن دیکھ کر مبہوت رہ گئی تھی۔

مجھے ہر بات یاد رکھنی ہے

گھاس کی پتیوں کا دھیان رکھنا ہے
اُلجھے ہوئے واقعات کے دھاگے
اور مکانات انچ بہ انچ،
ریل کی لمبی پٹریوں کی قطاریں،
درد کا چہرہ، بھرپور اور ابھرا ہوا۔۔۔
اگر میں گلاب کے ایک پودے کو خلط ملط کر دوں
اور رات کو رات کے بجائے خرگوش سمجھوں!!
یا میری یادداشت کی ایک پوری کی پوری دیوار گر جائے
تو مجھے سب پھر بنانا پڑے گا
ہوا، بھاپ، زمین، پتے
بادل اور اینٹیں بھی
کانٹے جو مجھے چبھتے ہیں
مفرور کی تیز رفتاری!!
میں ہمیشہ سے جلد بھولنے والا تھا
میرے ہاتھوں نے صرف غیر مرئی
اور بے ربط اشیا کو پکڑا ہے
جن کا موازنہ صرف غیر موجود سے کیا جا سکتا ہے
دھواں خوشبو کی طرح تھا
اور خوشبو دھوئیں کی طرح
کسی سوئے ہوئے جسم کی جلد
میرے بوسوں سے جاگ اُٹھتی تھی

لیکن وہ مجھ سے دن اور تاریخ نہیں پوچھتی

نہ ہی میرے خوابوں کے نام.....

میں اُس راستے کو نہیں ناپ سکتا

جو کسی جگہ نہیں جاتا

نہ ہی اُس سچائی کو جو بدلتی رہتی ہو

جس کو روشن دن نے مدھم کر دیا ہو

اندھیرے میں جگمگاتے ہوئے جگنو کی طرح!!

"آہم پیاری لڑکی!"

سنہرے اس کے قریب آگئی

"کیا میں تم سے بات کر سکتی ہوں۔"؟

سلی نے سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ سنہرے تھی خداداد کی بہن۔

وہ خیر سگالی کے طور پر مسکرا دی تھی

"خوش آمدید۔"

"تم کون ہو۔"؟

"مسافر۔" سلی کے جواب نے اسے حیران کیا

"کیا واقعی؟۔"

"تو اس میں حیرت کیا ہے؟۔"

"تمہارے پاس سفر کے اسباب نہیں۔"

سنہرے نے حیرت سے کہا

"تمہاری نظر سے اوجھل ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"ہم سب کے پاس ایک بیگ ہے۔

ہم سب مختلف طریقے سے سامان باندھتے ہیں۔

ہم میں سے کچھ کم اسباب کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔

ہم میں سے کچھ خفیہ ذخیرہ اندوز ہیں جو اپنی زندگی سے کبھی بھی کسی یاد کو جدا نہیں کرتے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم سب کو یہ جاننے کے لئے بلایا گیا ہے کہ اپنے بیگ کو اپنی صلاحیت کے مطابق کیسے لے جانا ہے، اسے کیسے کھولنا ہے، اور بے ترتیبی کا سامنا کیسے کرنا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ بڑے ہونے کا ایک حصہ یہ سیکھنا ہے کہ اپنی تمام چیزوں کو کیسے فرش پر پھیلا کر بیٹھنا ہے اور یہ جائزہ لینا ہے کہ ان میں سے اپنے ساتھ کیا لے کر جانا ہے اور کیا پیچھے چھوڑنا ہے۔"

.We all have a bag

.We all pack differently

.Some of us are traveling light

Some of us are secret hoarders who've never parted with a I think we are all called to figure out how to.memory in our lives and how, how to unpack it,the best of our ability "carry our bag I think part of growing up is learning how to sit.to face the mess down the floor with all your things and figuring out what to take "with you and what to leave behind

"ویل ڈن۔" سنہرے نے اسے سراہا

"بہترین فلسفہ۔"

"اسی پر حیات موقوف ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی

"آؤ میرے گھر تم کو ناشتہ کرواتی ہوں۔"

سنہرے معذرت کرتی چونک گئی تھی

"یہ تو ہماری ہاؤس فراؤ کا گھر ہے۔"

"کیا پتہ میں وہ ہی ہوں اور تم میری مہمان۔"

وہ مسکرائی تھی

"یہ تو بہت اچھا ہوگا۔اتنی بہترین مالک مکان۔"

وہ دونوں باتیں کرتی اندر آ گئی تھیں

"تمہارا گھر تمہاری طرح خوب صورت ہے۔"

سنہرے کا مناسب سا تبصرہ تھا۔

"ہم اپنے بھائی کے ساتھ یہاں ہیں۔۔میرا بھائی بہت اچھا ہے۔اس نے ہماری لیے بہت اسٹرگل کی۔"

وہ باتونی لڑکی تھی۔اور سلی کو ایسی لڑکی کی ضرورت تھی

کوئی تو ہو جو اس کے اندر کے سکوت کو توڑ دے

اس تکلیف کو کم کرے

یا کوئی درد بانٹ لے

یا اس بوجھ کو جو سلی نے اٹھا رکھا تھا

"اچھا تو ہشام بھائی تمہارے دوست ہیں۔"؟

سنہرے نے چیز سلائس کھاتے ہوئے بے تکلفی سے پوچھا تھا

"بہت اچھے دوست۔"

"وہ بہترین انسان ہیں۔ایسے لوگ آج کے دور میں بہت کم ہیں۔۔" اس نے تبصرہ کیا

"تمہارے گھر میں تو بہت کتابیں ہیں اتنی کتابیں تو شافی کے گھر تھیں پاکستان میں یا ہشام بھائی کے پاس۔"

اس کی نظر ریکس پہ پڑی تو بے ساختہ بولی تھی

"مجھے اور ڈی سوزا کو شوق ہے۔"

"اچھا ڈی سوزا وہ ہی جو خطیب کی دوست ہے۔"

سنہرے تو اتنے کم عرصے میں ساری معلومات رکھتی تھی

"خطیب نے مجھے کہا تھا سلی اور ڈی سوزا کے ساتھ میرا دل لگ جائے گا۔۔"

"ہم پوری کوشش کریں گے مغربی جرمنی تمہارے لیے مہربان ثابت ہو۔"

سلی مسکرائی

"تم بہت حسین ہو اپنے مزاج کی طرح۔"

سنہرے نے دل سے کہا تھا

"کیا میں یہ بچا ہوا ناشتہ لے جاؤں؟ اپنے بھائیوں کے لیے۔"

اس بے تکلفی پر سلی مسکرا بھی نا سکی۔ مگر اسے سنہرے کا یہ اپنا پن بہت ہی اچھا لگا تھا۔

اب وہ ایک ٹرے میں آملیٹ اور سلائس سجاتی گنگا رہی تھی

محبت کرنے اور چاہے جانے میں
کبھی اپنی بے وقعتی نہ بھول جانا
نہ کبھی عادی ہو جانا ناقابل بیان تشدد کا
یا زندگی کی واہیات تقسیم کا
جو تمہارے گرد بکھری ہے
البتہ اداس جگہوں سے خوشی تلاش کرنا

خوبصورتی کو اس کی گہرائی تک پہنچا کرنا

پیچیدہ کو سادہ نہ بنانا

نہ سادہ کو مشکل

قوت کی عزت کرنا، نہ کہ طاقت کی

ان سب سے بڑھ کر

دیکھنا، کوشش کرنا اور سمجھنا

اور کبھی نظر نہ ہٹانا

اور ہاں کبھی بھی، کبھی بھی بھول مت جانا"

اس نے چائے کی کیتلی میں ابلتی چائے کو ٹکوذی سے محفوظ کیا

" خالی بورے میں زخمی بلا"

وہ گنگنا رہی تھی

" دھان کے اس خالی بورے میں

جان الجھتی ہے

پٹ سن کی مضبوط سلاخیں دل میں گڑی ہیں

اور آنکھوں کے زرد کٹوروں میں

چاند کے سکے چھن چھن گرتے ہیں

اور بدن میں رات پھیلتی جاتی ہے۔۔۔

آج تمہاری ننگی پیٹھ پر

آگ جلائے کون

انگارے دہکائے کون

جدو جہد کے

خونیں پھول کھلائے کون

میرے شعلہ گر پنجوں میں جان نہیں

آج سفر آسان نہیں

تھوڑی دیر میں یہ پگڈنڈی

ٹوٹ کے اک گندے تالاب میں گر جائے گی

میں اپنے تابوت کی تنہائی سے لپٹ کر

سو جاؤں گا

پانی پانی ہو جاؤں گا

اور تمہیں آگے جانا...

...اک گہری نیند میں چلتے جانا ہے

اور تمہیں اس نظر نہ آنے والے بورے...

...اپنے خالی بورے کی پہچان نہیں۔"

اس نے ٹرے اٹھالی اور پیچھے مڑ کر کہا

"میں اندر والا یہ راستہ استعمال کر سکتی ہوں۔"؟

سلی نے اٹھ کر لاک کھول دیا۔وہ سیڑھیاں چڑھتی رہی اور اندر والا یہ رستہ ہمیشہ کے لیے کھل گیا تھا۔

سنہرے کے جانے کے بعد ماحول کا سنہرا پن مدھم ہو گیا تھا

کچھ دیر پہلے زندگی جاگ رہی تھی

ایک بار پھر تنہائی نے پنجہ گاڑ لیا تھا۔

سلی کے اندر اداسی بہنے لگی تھی

اس نے دریچے میں کھلی کتاب پر لکھا

"زندگی بری ہے بس ہشام کے سوا۔"

پھر اس نے کچھ اور لکھنا شروع کیا۔

"کاش میں اپنی زندگی دوبارہ جی سکتی،

تو میں خود کو بیمار محسوس کرنے پر آرام کرنے کے لیے فورا بستر میں گھس جاتی، یہ سوچنے کی بجائے کہ میرے ایک دن کام نہ کرنے سے زمین کی گردش رک جائے گی۔

میں گلاب کی شکل میں بنی گلابی موم بتی کو الماری میں رکھے رکھے پگھلنے دینے کی بجائے جلا دیتی۔۔۔

میں کم بولتی اور زیادہ سنتی۔۔۔

میں دوستوں کو کھانے پر مدعو کرتی چاہے قالین پر کوئی داغ دھبے ہوتے اور صوفے کو صفائی ستھرائی کی ضرورت ہوتی۔

میں "اچھے" کمرے میں بیٹھ کر پاپ کارن کھاتی اور جب کوئی آتش دان میں آگ جلانا چاہتا تو دھول کے بارے میں اتنی پریشان نہ ہوتی۔

میں اپنے دادا کی جوانی کی کہانیاں سننے کے لیے وقت نکالتی۔

میں گرمیوں کے ایک خوبصورت دن میں گاڑی کے شیشے بند رکھ کر گاڑی چلانے پر کبھی اصرار نہ کرتی، محض اس لیے کہ میرے بال تازہ اسٹائل میں بنے ہوئے تھے۔

میں چراگاہ میں گھاس پر سر رکھ کر لیٹی رہتی۔

میں ٹی وی دیکھ کر کم اور زیادہ تر زندگی کے حقائق کو دیکھ کر روتی اور ہنستی۔

لیکن، سب سے بڑھ کر، زندگی کا دوسرا موقع حاصل کرنے پر، میں ہر لمحے کا لطف اٹھاؤں گی، میں واقعی اس پر غور کروں گی۔۔۔میں اسے بھرپور طریقے سے جیوں گی ...

میں اب چھوٹی چھوٹی باتوں پر مزید اتنی پریشان نہیں رہوں گی۔۔۔

ان لوگوں کے بارے میں فکرمند نہیں ہوں گی جو آپ کو پسند نہیں کرتے ،یا بلکہ یوں کہیے، آپ کو پروا نہیں ہونی چاہیے کہ کون کیا کرتا ہے۔۔۔

اس کے بجائے، آئیے ان دوستوں کو عزیز رکھیں جو ہمارے پاس ہیں اور ان لوگوں کو جو ہم

سے محبت کرتے ہیں...

اور ہم اپنے دماغ، جسم، روح، جذبات کی اصلاح کے لئے ہر روز جو کرتے ہیں اس کی قدر کریں۔"

☆......☆......☆

سنہرے نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور اپنے بھائیوں کو آواز دی

خطیب اور شایان تھے خداداد نہیں تھا

"وہ اپنی جاب پر چلا گیا ہے۔"

خطیب کے بتانے پر سلی دکھی ہو گئی تھی

"میرا بھائی کتنی محنت کرتا ہے۔"

"ہاں وہ چاہتا ہے جلدی سے اپنا گھر لے سکے۔"

"انشاءاللہ۔"

"اور تم یہ ناشتہ کہاں سے اڑا لائی ہو۔" خطیب کو شک ہوا جبکہ شایان کو یک تھا۔

"تم سلی سے لائی ہو۔"؟

"اس نے خود دیا ہے"؟

"کیا واقعی؟۔"

"ہاں زیادہ تھا ویسٹ ہو جاتا۔" سنہرے گول مول جواب دے کر صفائی کرنے لگی تھی

جب سے سنہرے آئی تھی ان کا گھر چمک گیا تھا

"سلی بہت اچھی ہے اس سے دوستی کر لو۔"

"ہاں وہ مغرور نہیں ہے۔"

سنہرے نے کہا

"تمہارا وقت اچھا گزر جائے گا۔"

"امید ہے۔"

اس نے جھٹ پٹ اپنا کام ختم کر لیا تھا

"میں سلی کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ چلی جاؤں گی۔۔"

اس نے شایان کو تسلی دی تو وہ دونوں اپنے اپنے کام پر نکل گے تھے

سنہرے بھی تیار ہو کر نیچے آ گئی تھی۔

سلی بھی نہا دھو کر فریش نظر آ رہی تھی

"تم کتنی سفید ہو سلی۔ جھاگ جیسے سفید چشموں کی طرح۔"

سلی بس مسکرا دی تھی

"تم کو ایک نظم سناتی ہوں۔"

وہ دونوں باہر نکل آئیں۔حسین آسمان کے نیچے۔

حسین خواتین حیران ہیں میری خوب صورتی کا راز کیا ہے

میں روایتی حسین ہوں نہ فیشن ماڈل کے سانچے میں ڈھلی ہوں۔

لیکن جب میں انہیں بتانے لگتی ہوں،

وہ سمجھتی ہیں کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔

میں کہتی ہوں

یہ سب میری دسترس میں ہے،

میرے کولھوں کے بھنور ،

میری متوازن چال

میرے لبوں کے گھونگر

میں ایک عورت ہوں

غیر معمولی طور پر

شاندار
غیر معمولی عورت،
جو میں ہوں۔

میں ایک کمرے میں داخل ہوتی ہوں
اتنی پرسکون اور مطمئن جتنے کہ تم ہو
اور ایک آدمی
جس کے ساتھی اس کے آس پاس کھڑے ہوں
یا زانوں کے بل گر پڑے ہوں
پھر وہ میرے گرد دیوانہ وار گھوم رہے ہوں،
جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتہ۔
میں کہتی ہوں
میری آنکھوں میں شرارے ہیں
اور میرے دانتوں کی لپکتی کوند ،
میری کمر میں لچکتے ہوئے خم ،
اور میرے قدموں میں رقص کی سرخوشی۔
میں ایک عورت ہوں
غیر معمولی طور پر
شاندار
غیر معمولی عورت،
جو میں ہوں۔

مرد خود بھی حیران ہیں۔
آخر ایسا کیا وہ مجھ میں دیکھتے ہیں۔
وہ چاہتے ہوئے بھی
چھو نہیں پاتے
میرے اندر چھپے ہوئے اسرار
جب میں انہیں ظاہر کرنا چاہتی ہوں
تو بھی وہ نہیں دیکھ پاتے
اگرچہ وہ اس کشش کو محسوس کرتے ہیں۔
میں کہتی ہوں
یہ میری کمر کی لچکتی کمان میں پوشیدہ ہے،
میری مسکراہٹ کی تابنائی میں،
میرے سینے کے ابھار میں ،
میرے پر وقار انداز میں۔
میں ایک عورت ہوں
غیر معمولی طور پر۔
شاندار عورت،
جو میں ہوں۔
اب تم سمجھے
میرا اسر کیوں ختم نہیں ہوتا
نہ میں بلند آہنگ ہوں اور نہ قلانچیں بھرتی ہوں۔
یا واقعی مجھے اونچی آواز میں بات کرنی ہوگی۔

جب تم مجھے قریب سے گزرتے دیکھو،

یہ سب خود پر فخر کرنے کے لئے کافی ہے

میں کہتی ہوں،

یہ میری ایڑیوں کی ٹک ٹکاہٹ میں ہے،

میرے بالوں کی لہریں

میری ہاتوں کی ہتھیلیاں

میری دیکھ بھال کی منتظر ہیں

'کیونکہ میں ایک عورت ہوں۔

غیر معمولی طور پر۔

شاندار

غیر معمولی عورت،

جو میں ہوں۔۔"

وہ دونوں اچھی دوستیں بن گئی تھیں

مگر کیا وجہ تھی کہ اس کے بھائی خداداد کو یہ دوستی پسند نہیں آئی تھی

اس نے دبے لفظوں میں سنہرے سے کہا بھی تھا

"تم شافیہ سے ہی دوستی رکھو یہ بہتر ہوگا۔"

مگر شافیہ سے ہر روز ملاقات نہیں ہو سکتی۔۔"

سنہرے کا اس نصیحت پہ عمل کا ارادہ نہیں تھا۔

وہ دوسرے دن ڈی سوزا کے ساتھ ایک سبزی والے کھیت میں کام کر رہی تھی جب سنہرے بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئی

" مجھے وہ بلند پایہ روحیں پسند ہیں جو اپنی ذات اور دوسروں کی عزت کرتی ہیں، جو گفتگو میں گہرائی کا رنگ بھرتی ہیں، ادب سے درخواست کرتی ہیں، ذوق وشائستگی کے ساتھ مزاح کرتی ہیں، سچائی سے معذرت کرتی ہیں اور خاموشی سے رخصت ہوتی ہیں۔"

اس نے گلا کھنکھار کے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

ان دونوں نے اسے خوش آمدید کہا

"کیا تمہارا پنیر کا کوئی پلانٹ تھا۔"

سنہرے کے پوچھنے پر کلی اداس ہو گئی تھی

" ہاں ایسا تو تھا۔ پھر اسے نظر کھا گئی۔"

وہ سبزی کے کھیت میں کئی گھنٹے کام کرتی رہیں اور ان کے بیچ بے تکلفی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی

سنہرے زبان سیکھ رہی تھی تو وہ دونوں اس کی بہت مدد کرتی تھیں

" ہم کسی دن شافیہ سے ملنے چلیں گے۔"

سنہرے نے پروگرام طے کر لیا تھا۔

" ہاں مگر سبزی کی ڈش بنانے کے بعد۔"

[وہ دونوں واپسی پر اپنے اپنے خوابوں کا ذکر کر رہی تھیں۔

جب سنہرے نے لجا کر ایک راجھستانی نظم پڑھی

" میں چاہتی ہوں کہی باتیں،

بہت سے سپنے،

میں چاہتی ہوں بڑے ڈنک والی سنہری مکھی کی طرح

سب سے چھپ کر ایک گھر بناؤں

جہاں بیٹے کی بیوی مجھے ڈھونڈ نہ سکے

میں چاہتی ہوں بھنورے جب پھول پر ہنڈیا پکائیں
تو میرے لیے بھی کچھ بنائیں
جب بارش میں سورج گھر سے چلا جائے
تو میں چمپا کی طرح بڑی ہو جاؤں
میں چاہتی ہوں ماں مجھے تہوار والے دن
بنیے کے گھر سے چھٹی کرنے دے،
برف والا پانچ کے سکے میں میرے برتن میں
دوسرے لوگوں سے تھوڑی زیادہ برف ڈال دے
میں چاہتی ہوں باپو گھر میں زیادہ رہے
تاکہ میں ماں کی مار سے بچی رہوں
میں چاہتی ہوں میرے بھائی
شوربہ اور سالن رکابی میں نہ جما رہنے دیں
تاکہ میرے ناخن کھرچن سے درد نہ کریں
میں چاہتی ہوں بھلے ماں مجھے کالی کہتی رہے
مگر دانتن والے سے مجھے چھوٹا سا صابن خرید دے کبھی
میں چاہتی ہوں بنیے کے نل پر پوچا دھو کر
اس کے بچوں کے ساتھ نہاؤں!
میں چاہتی ہوں سکول جانے والی لڑکیاں
مجھے میرا نام لکھ کر دکھائیں
میں چاہتی ہوں زردے کا رنگ
گھر سے کبھی ختم نہ ہو

اور ماں شربت کی بوتل ہم سے نہ چھپائے

میں چاہتی ہوں سورج ہر ہفتے ایک چھٹی کرے

اور چاند سچ مچ ہمارے دابڑے کے پانی میں ڈوب جائے

میں چاہتی ہوں گلہریاں مجھے دیکھ کر

اونچی شاخوں سے پکی ہوئی کھجوریں پھینکیں

میں چاہتی ہوں میری نانی سالوں بعد نہ آئے

ہمیشہ ہمارے گھر میں ہی رہے

میں چاہتی ہوں میرے گھر سے کوئی

بھگوان کے پاس نہ جائے

میں چاہتی ہوں ہر صبح پیٹ بھر کر شکر کھاؤں

اور صاف تولیے سے گیلا منہ پونچھوں

میں چاہتی ہوں کبھی کبھی

ماں بھائیوں کی طرح میری ادوان پر بھی نرم چادر بچھائے

میں چاہتی ہوں دور کھیتوں میں بیٹھے تارے

صبح لوٹا لے کر جاتے ہوئے بھی وہاں دکھیں

میں چاہتی ہوں زندگی میں ایک بار

چشمہ لگا کر اونٹ پر بیٹھوں

میں چاہتی ہوں میرے پیٹ کے کیڑے

ایک ہی بار سارے نکل کر

دادی کی چائے کی پتی میں چلے جائیں

اور میں اتنی چھوٹی ہو جاؤں کہ

تل کی ہتھی پر جھولا جھولوں

اور

ابا کی جیب میں سو جاؤں!۔"

جب وہ چپ ہوئی تو سب کے لبوں پر اداسی بھری مسکان تھی

گھر جا کر بھی سلی سوچتی رہی

اور ابا کی جیب میں سونا کیسے لگتا ہوگا؟: جب وہ گھر آئی تو موبائل بج بج کے ہلکان ہو رہا تھا۔

اس نے دیکھا ہشام کی کال تھی

"کیا سبزی کے کھیت میں تھی تم۔" ؟

"تم کو کیسے پتہ؟۔"

" میں تم سے بے خبر نہیں نا۔"

اور سلی کو لگا زندگی میں بس یہ دو لفظ ہی داستان ہیں

انسان فکر سے آزاد ہو تو ہوا کی طرح ہلکا ہوتا ہے۔ بادل کی طرح اڑتا ہے اور گولوں کی طرح تیرتا ہے۔

چارلس ولئیر کہتے ہیں کہ

"بعض طبیعتیں سراسر فکر زدہ ہوتی ہیں۔ عمل کے لیے قطعاً غیر مستعد، لیکن وہ ایک پُر اسرار اور غیر معلوم تحریک کے تحت بعض اوقات اتنی پھرتی سے حرکت کرتی ہیں کہ اس کا خود انھیں بھی گمان تک نہیں ہوتا۔ ایک ایسا شخص جو بزدلانہ طور پر اپنے پہرے دار کے دروازے کے سامنے، داخل ہونے کی ہمت کیے بغیر، اس ڈر سے چکر کاٹتا ہے کہ کہیں کوئی افسوس ناک خبر نہ ملے، ایک ایسا شخص جو پندرہ روز ایک خط کو بغیر کھولے رکھ چھوڑے، ایک ایسا شخص جو چھ ماہ کی سوچ بچار کے بعد کسی کام کی طرف قدم اٹھائے، بعض اوقات یکا یک کسی ناقابل مزاحمت قوت کے تحت کمان کے تیر کی طرح عمل کی طرف اڑتا ہوا جاتا ہے۔

اخلاق کے معلمین اور ڈاکٹر، جو سب کچھ جاننے کا دعوی کرتے ہیں، اس بات کی توضیح نہیں کر سکے کہ ان کاہل اور عیش کوش روحوں میں کہاں سے یہ جنون آجاتا ہے۔ کس طرح نہایت سادہ اور اہم کاموں کو انجام دینے سے قاصر طبیعتوں میں اتنی عظیم ہمت آٹپکتی ہے کہ وہ از حد بے جا اور خطرناک کاموں سے نہیں چوکتے۔ میرے ایک دوست نے جس کی طرح کامست، بے ضرر اور خوابوں کا بندہ شاید کوئی نہ ہو، ایک دفعہ ایک جنگل کو آگ لگا دی محض یہ دیکھنے کے لیے کہ آگ واقعی اتنی ہی تیزی سے بھڑک اٹھتی ہے جیسے اس کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے؟ دس مرتبہ اس کا تجربہ ناکام رہا مگر گیارہویں دفعہ یہ بہت اچھی طرح کامیاب ہوا۔ ایک اور شخص محض یہ دیکھنے کے لیے، تقدیر سے ٹکر لینے کے لیے، اپنے اوپر جبر کر کے، ایک قوت کا ثبوت دینے کے لیے بس یونہی اپنے وہم میں، اپنی کاہلی میں، ایک بارود کے ڈبے کے قریب سگار جلا دے گا۔ یہ ایک قسم کی قوت ہے جو خوابوں کی دنیا سے سر اٹھاتی ہے۔ اور جن لوگوں میں یہ اپنا نمایاں اثر دکھاتی ہے، جیسا کہ میں نے کہا، یہ عموماً انتہائی کاہل اور خوابوں کے بندے ہوتے ہیں۔

ایک اور شخص جو اس حد تک شرمیلا ہے کہ وہ مردوں کے سامنے گزرتے ہوئے اپنی نظریں نیچی کرلے اور جسے ایک ریستوران میں داخل ہونے کے لیے اپنی تمام قوت ارادی کو اکٹھا کرنا پڑے، اور جو کسی تھیٹر کے سامنے گزرے تو ٹکٹ چیکر اسے بادشاہوں کی عظمت لیے ہوئے نظر آئیں، یکا یک قریب سے گزرتے ہوئے بوڑھے پر کود پڑے گا، اور حیران ہجوم کے سامنے اسے چوم لے گا۔ کیوں؟۔۔۔ کیونکہ اس شکل وشباہت نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ مگر یہ قیاس زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ اس نے کیوں ایسا کیا تھا۔"

کبھی کبھی سلی کا بھی دل کرتا تھا وہ کچھ انوکھا کرے اور اپنی ہی ذات کو چونکا دے

[وہ سوچنے لگی بہت عجیب اور کبھی بہت فضول۔

"میں اس خوفناک نتیجے پر پہنچا ہوں

کہ میں ہی اپنی زندگی کا فیصلہ کن محرک ہوں

اپنے ارد گرد ماحول مجھے خود بنانا ہے

یہ میرا ذاتی نقطہ نظر ہے جو آب وہوا پیدا کرتا ہے

یہ میرا اپنا موڈ ہے جو میرے گرد موسم کو جنم دیتا ہے

میرے پاس عظیم قوت ہے جس سے میں اپنی زندگی کو اداس یا خوش بنا سکتا ہوں

میں اذیت کا آلہ بھی ہو سکتا ہوں

اور خوشی کا بھی

میں تذلیل کر سکتا ہوں یا مزاح

میں چوٹ پہنچا سکتا ہوں یا شفا بخش سکتا ہوں

تمام حالات میں، یہ میرا ردعمل ہے جو فیصلہ کرتا ہے کہ آیا بحران بڑھانا ہے

یا کم کرنا ہے

اور ایک شخص کو انسان بنایا جانا ہے

یا اس سے غیر انسانی سلوک رکھنا ہے

وہ ایک شخص بھی میں خود ہوں

اگر ہم کسی کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں

جیسا کہ وہ ہیں

تو ہم انہیں بدتر بنا دیتے ہیں

اگر ہم ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں

جیسا کہ انہیں ہونا چاہیے

تو ہم ان کی وہ بننے میں مدد کرتے ہیں جو وہ بننے کے قابل ہیں۔"

تب ہی ہشام کی آواز اسے واپس لے آئی تھی

"میں سمجھا تھا تم نارمل ہو گئی ہو۔شاید میں غلط تھا۔"

"میں سن رہی ہوں ہشام۔"!

"یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی

میں صرف تم کو اطلاع دے رہا ہوں کہ تمہاری سال گرہ قریب آ رہی ہے۔"

اور سلی بے ساختہ مسکرا دی تھی

:اس نے سوچا وہ یہ خبر کسے سب سے پہلے سنا سکتی ہے؟ ڈی سوزا تو تھی نہیں وہ سنہرے کے پاس آ گئی مگر وہ بھی نہیں تھی

خطیب موجود تھا۔اور ہر روز رفح اور غزہ کی خبریں سن سن کر دن بدن ختم ہوتا جا رہا تھا

کیا کوئی اسے زندگی کی طرف لا سکتا تھا؟

اس نے اچانک سر اٹھا کر دیکھا اور اس کی آواز پورے ماحول میں سوگواریت چھوڑ گئی تھی

"یادوں کی پٹاری"

میں اپنے مہ و سال کی اٹاری میں کھڑا ہوں، دھول کے ذرے دھوپ کی ترچھی شعاعوں میں ناچ رہے ہیں۔زندگی کی باقیات میرے ارد گرد گرے ہوئے پتوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں ٹکٹوں کے ٹکڑے، دھندلائی ہوئی تصویریں، طویل عرصے سے بند ڈریسٹ میں سے ایک بھرے کنارے والا کافی کا مگہ ہر چیز میں ایک یادداشت دھڑکتی ہے، وقت کا ایک حصہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہے لیکن ہمیشہ کے لیے پہنچ سے دور ہے۔

میں ایک پرانا بیس بال اٹھاتا ہوں، اس کا چمڑا کٹا پھٹا ہوا ہے۔ایک ہی لمحے میں، میں دوبارہ دس سال کا ہو گیا ہوں، موسم گرما کی ہوا وعدے سے بوجھل ہے، میرے والد کی ہنسی گھر کے پچھواڑے میں گونج رہی ہے۔لیکن جیسے یکا یک یہ لمحہ آتا ہے، ویسے ہی پھسل جاتا ہے، جو کبھی تھا اس کا محض واہمہ پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

یہ یادگاریں، میرے ماضی کے یہ قابل لمس ٹکڑے، یہ ایک ایسی کرنسی ہیں جسے خرچ نہیں کیا جاسکتا، ایک ایسا خزانہ ہیں جس کا سودا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ پہلی محبتوں اور آخری الوداع کی سرگوشیاں کرتی ہیں، منائی جانے والی فتوحات اور ناکامیوں کا سامنا کرتی ہیں۔ ہر ایک کہانی، نامکمل لیکن معنی سے لبریز ہے۔

جیسے جیسے سورج نیچے ڈوبتا ہے، فرش کے تختوں پر لمبے لمبے سایے بناتا ہے، مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں بھی ایک یادگار ہوں-ان تمام لمحات کی ایک زندہ، سانس لینے والی یادگار جنھوں نے مجھے تشکیل دیا ہے۔ میری جھریاں مشترکہ ہنسی کے نقوش ہیں، میرے داغ لڑی گئی لڑائیوں کا ثبوت ہیں۔

عشروں پر مشتمل باقیات سے گھرے اس پرسکون کمرے میں، میں حد سے زیادہ امیر ہوں۔ کیونکہ یہ یادگاریں، وقت کے یہ قیمتی ٹکڑے، یہ ایک اچھی بسر شدہ زندگی کی حقیقی دولت ہیں-انمول، بے بدل، اور صرف مجھ اکیلے کی عزیز متاع حیات ہیں۔۔"

dust motes dancing in the,I stand in the attic of my years

are the, scattered like fallen leaves, Around me.slanted sunlight

a, faded photographs,ticket stubs-remnants of a life lived

Each object pulses.chipped coffee mug from a long-closed diner

a fragment of time forever preserved yet forever,with a memory

.out of reach

In an, its leather cracked and worn,I pick up an old baseball

the summer air thick with, I'm ten years old again,instant

But. my father's laughter echoing across the backyard,promise

leaving only the, the moment slips away,as quickly as it comes

.ghost of what once was

they're a, these tangible pieces of my past,These souvenirs

They. a treasure that can't be traded,currency that can't be spent

of triumphs celebrated,whisper of first loves and last goodbyes

incomplete yet, Each one a story.and failures weathered

.overflowing with meaning

"۔,As the sun dips lower

I realize that I,casting long shadows across the floorboards

breathing memento of all the moments,a living-too am a souvenir

, My wrinkles are maps of laughter shared.that have shaped me

.my scars are testaments to battles fought

I, surrounded by the remnants of decades,In this quiet room

these precious, For these souvenirs.am rich beyond measure

- they are the true wealth of a life well-lived,fragments of time

. and mine alone to cherish,irreplaceable, priceless Joy.

"

میں سمجھ سکتی ہوں تم جس کرب سے گزر رہے ہو۔مجھے لگتا ہے ہم سب اپنی لاشیں اٹھا کر چلتے ہیں۔"

"تم ایسا نہیں سوچو! تم اچھی لڑکی ۔بہت خواب دیکھو گی جن کی اچھی تعبیر ہوگی"

وہ اس کا حوصلہ بن گیا تھا

"محب وطن سے غدار تک' محبت سے نفرت زندگی سے موت تک تھوڑا ہی تو فاصلہ ہے جو انسان

طے کرتا ہے۔"

وہ کھڑکی کھول کر حبس دور کر رہا تھا

"ہر طرف گلاب اور مہندی کے پھول تھے
آج کے دن ایک سال پہلے
انہی راستوں پر

لوگ کھڑے تھے پاگلوں کی طرح
گھروں کی چھتیں ان کے بوجھ تلے
دبی دبی سانسیں لے رہی تھیں
گرجا گھر کے مینار روشنیوں میں دمک رہے تھے
ان پہ رنگ برنگے پرچم سجا گئے تھے
ایک سال پہلے آج کے دن
انہی راستوں پر

سب میری آمد کے منتظر، سانس روکے کھڑے تھے
فضا کا سکوت گھنٹیوں کے شور میں ٹوٹ گیا
گرجا گھر کی پرانی دیواریں
لوگوں کے شور اور نعروں سے گونج اٹھیں
لوگوں کے جوش کا یہ عالم تھا

کہ اگر میں کہتا

"اے پیارے لوگو مجھے آپ کا شور ناگوار ہے

اس لئے خاموش ہو جاؤ

اور اگر کچھ کر سکتے ہو تو میرے لئے آسمان سے سورج توڑ کے لاؤ

تو وہ دیوانہ وار کہتے.. اہا یہ تو کچھ نہیں

اس کے علاوہ کچھ بتائیں؟؟"

افسوس!

آج احساس ہوتا ہے کہ وہ میں ہی تھا جو سورج پہ لپکا

اپنے ناممکن وعدوں کے ساتھ

لوگوں کو جلدی مطمئن کرنے کے لئے

آج خود کو دل شکن محسوس کر رہا ہوں؟

اب آپ دیکھ سکتے ہو؟

اس سب کا پھل

جو میں نے بویا، اب کاٹ رہا ہوں

آج کے ہی دن انہی راستوں پہ

اب ان چھتوں پہ میرے لئے کوئی نہیں ہے

نہ ہی پھول بچھے ہیں

نہ ہی میری آواز پہ جان وارتے لوگ ہیں

بس چند بیمار صورت

لاغر، زرد رو، بوسیدہ جسم
جو کھڑکیوں سے میری تباہی دیکھنا چاہتے ہیں

اب جب کہ
مجھے پھانسی گھاٹ کی طرف لے جایا جا رہا ہے
وہ مریض ذہن لوگ ایسی جگہ کھڑے ہیں
جہاں سے میری موت کا بہترین نظارہ دیکھ سکیں
رفتہ رفتہ میں اپنے انجام کو بڑھ رہا ہوں

اس اثنا میں بارش شروع ہو چکی ہے
شائد آسمان کو میرے رونے کی جلدی ہے؟
میرے ہاتھوں کو ضرورت سے زیادہ سختی سے باندھا گیا ہے
کیا میں اب یہاں سے بھاگ رہا ہوں؟
'کوئی بھی انسان اپنے انجام سے بھاگ نہیں سکتا'

میں نے اس ذلت کو قبول کرلیا ہے
میری پیشانی سے خون بہتا ہے
جس کسی کے ہاتھ جو آتا ہے وہ مجھے مار دیتا ہے
صرف ایک سال میں ہی لوگ اس قدر نفرت پہ اتر آئے ہیں؟
شائد یہ میرے اعمال کا نتیجہ ہے؟

اس طرح میں عظمت کی سیڑھیاں چڑھا

اور اس طرح میں یہاں سے جا رہا ہوں

مجھے معلوم ہے لوگ فاتح کے ساتھ ہوتے ہیں

اور کسی کو اس کے نیک اعمال کا اجر نہیں ملتا

لیکن میرا معاملہ اب خدا کے پاس ہے

اسی کے پاس ہے

آج کے دن انہی راستوں پر"

قسط نمبر 21

مغرب سے لے کر مشرق تک دنیا کے تمام درد دل رکھنے والے شاعروں نے ہمارے گوشت کے ٹکڑوں پر شاعری کی مگر آج تک اس زہر کا کوئی تریاق نا کر سکا"۔
خطیب کی آنکھ سے غم بہنے لگا تھا_
"ایک قسم کا دکھ وہ ہے جو بہت زیادہ جاننے سے آتا ہے، دنیا کو اس ہی طرح دیکھ لینے سے جیسی وہ ہے
یہ سمجھنے کا دکھ ہے کہ زندگی کوئی کارنمایاں نہیں ہے، بلکہ چھوٹے، معمولی لمحات کا ایک سلسلہ ہے،
کہ محبت کوئی پریوں کی کہانی نہیں ہے، بلکہ ایک نازک، عارضی جذبہ ہے،
کہ خوشی ایک مستقل حالت نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی چیز کی نایاب، عارضی جھلک ہے جسے ہم کبھی نہیں پکڑ سکتے۔
اور اس تفہیم میں، ایک گہری تنہائی ہے،
دنیا سے، دوسرے لوگوں سے، خود سے منقطع ہونے کا احساس ہے۔"

There is a kind of sadness that comes from knowing too"
It is the sadness of. from seeing the world as it truly is,much
but a series of,understanding that life is not a grand adventure
but a, that love is not a fairy tale, insignificant moments,small
, that happiness is not a permanent state, fleeting emotion,fragile

. fleeting glimpse of something we can never hold onto,but a rare
a sense, there is a profound loneliness,And in that understanding
". from oneself, from other people,of being cut off from the world

کیا اسے ہم حقیقت کہہ سکتے ہیں جو اتنی بھیانک ہے کہ سانس بند کرتی ہے_"
سلی کے پاس کوئی ایک لفظ بھی نہیں بچا تھا کہ وہ اس کے غم کا تدارک کر سکتی_
"کیا یہ صدمہ زیادہ ہے کہ آپ کی زمین پر کوئی بم بلاسٹ کرے اور آپ کا سارا گھر اجڑ جائے یا یہ صدمہ زیادہ ہے کہ ایک ہی رات میں بغیر کسی بلاسٹ کے آپ کا خاندان ختم ہو جائے؟
سلی کی آواز پر اس نے دکھ کے ساتھ اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا تھا جو ایک ان چاہا بوجھ اٹھا کر کھڑی تھی
"کیا یہ صدمہ کم ہے کہ کوئی آپ کے گھر میں آپ کا ریپ کر دے_"
اس کی آنکھیں زخمی ہو گئی تھیں
"اور چاہ کر بھی آپ کسی ایسے بچے کو جنم دیں جس کا تصور بھی آپ کو خوف زدہ کر دیتا ہو_"
وہ اپنے غم میں ڈوبی بول رہی تھی اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ کوئی سانس روک کر دروازے کے پیچھے سلی کو سن رہا ہے وہ بالکل سن کھڑا تھا جیسے بے سانس کا کوئی مجسمہ ہو_
"ریپ ہونا کوئی بڑی بات نہیں سینکڑوں لڑکیاں دنیا میں بغیر چاہے ریپ ہوتی ہیں اور ناجائز بچے جنتی ہیں_ مگر بڑی بات تو ہے کہ سلسبیل ہی کیوں؟
اس کی آنکھ سے لہو بہنے لگا تھا
خطیب گھبرا گیا کہ اب سلی کو کیسے چپ کروائے؟
لیکن یہ بہتر تھا کہ وہ اپنا غبار نکال لیتی_
آج وہ بول رہی تھی اور بوار یا اسے سن رہا تھا

کوئی تھا جو چپ کھڑا تھا اور اس کی چپ کے اندر کئی طوفان چھپے تھے_

کوئی تھا جو موجود تھا مگر نظر نہیں آتا تھا_

تنہائی کی سب سے بھیانک قسم وہ نہیں جو محض تنہا ہونے سے آتی ہے، بلکہ یہ وہ قسم ہے جو غلط فہمی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ تنہائی ہے جب آپ ایک ہجوم سے بھرے کمرے میں کھڑے ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کے درمیان جو آپ کو دیکھتے نہیں، آپ کو سنتے نہیں، اور جو آپ کی حقیقی ذات کو نہیں پہنچانتے۔ اور اس تنہائی میں، آپ محسوس کرتے ہیں کہ جیسے آپ دھیرے دھیرے مٹتے جا رہے ہیں، پس منظر میں غائب ہو رہے ہیں، یہاں تک کہ آپ کچھ نہیں رہتے سوائے ایک بھوت کے، اپنے سابقہ وجود کے ایک سائے کے۔"

اگر میں چاہوں تو اس رات کا حساب لے سکتی ہوں ہر اس چیز سے جس نے اس رات مجھے رسوا کرنے میں کردار ادا کیا_ وہ اچانک چلے جانے والی بجلی بھی ہو سکتی ہے۔"

اور اگر تم یہ حساب لے لو تو تم پرسکون ہو جاؤ گی۔ مجھے یقین ہے۔ طوفان گزر جائیں تو سکوت طاری ہو جاتا ہے۔"

خطیب نے کہا تھا

"ہشام بھی یہی کہتا ہے۔ میں حساب ضرور لوں گی اور جلد از جلد لوں گی۔"

سلی کی آواز میں پراسراریت تھی۔

اور باہر کھڑے وجود کی ہڈیاں بھی سنسنا گئی تھیں۔

"میں تم کو ایک کہانی سناتا ہوں۔"

خطیب نے اس کا دھیان بانٹ لیا تھا

"تم اسے سن کر ہنس پڑو گی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ایک جزیرہ تھا جہاں تمام احساسات رہتے تھے: خوشی، اداسی، علم، اور محبت سمیت دیگر سبھی احساسات۔

بہرحال ایک دن جذبات کے سامنے اعلان ہوا کہ جزیرہ ڈوب جائے گا، چنانچہ سب نے اپنی

کشتیاں تیار کیں اور روانہ ہو گئے۔

محبت واحد تھی جو وہیں ٹھہری رہی۔

محبت اس وقت تک وہاں رہنا چاہتی تھی جب تک وہ ڈوب نہ جائے۔

جب محبت تقریباً ڈوبنے والی تھی،

اس نے مدد طلب کرنے کا فیصلہ کیا۔

امارت ایک خوبصورت کشتی میں محبت کے پاس سے گزر رہی تھی۔ محبت نے کہا،" امارت، کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتی ہو؟"

امارت نے جواب دیا،" نہیں، میں نہیں لے جا سکتی۔ میری کشتی میں بہت سارے سونے اور چاندی کے انبار ہیں۔ تمہارے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

محبت نے خودنمائی سے پوچھنے کا فیصلہ کیا جو وہاں سے گزر رہی تھی" خودنمائی، براہِ کرم میری مدد کرو!"

" میں آپ کی مدد نہیں کر سکتی پیاری. آپ تمام تر گیلی ہیں اور شاید میری کشتی کو نقصان پہنچا سکتی ہیں،" خودنمائی نے جواب دیا۔

اداسی قریب ہی تھی اس لیے محبت نے اسے مدد کے لیے پکارا" اداسی، مجھے اپنے ساتھ جانے دو۔"

" اے محبت، میں اتنی اداس ہوں کہ اکیلے جانے کو ترجیح دیتی ہوں!"

خوشی بھی محبت کے پاس سے گزری لیکن وہ اتنی خوش تھی کہ محبت نے اسے پکارا تو اس نے آواز تک نہ سنی!

اچانک ایک آواز آئی" آؤ محبت، میں تمہیں لے چلوں۔" یہ ایک بزرگ تھے۔

محبت اتنی خوش ہوئی کہ بڑے میاں کا نام پوچھنا بھی بھول گئی۔

جب وہ دوسری طرف پہنچے تو محبت نے جاننے کی خاطر دریافت کیا کہ بزرگ کون ہے۔ " یہ وقت تھا۔"

" وقت؟ لیکن وقت نے میری مدد کیوں کی؟"

"کیونکہ صرف وقت ہی سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ محبت کی قدر و قیمت کیا ہے۔"

سِلی مسکرا دی۔

"میں نے کہا تھا نا تم مسکرا دو گی۔۔"

"محبت کی قدر وقت کے پاس ہے۔۔ایسا ہے نا۔اچھا یا برا وقت؟ بتا دیتا ہے کہ کون آپ سے محبت کرتا ہے یہی بات ہے نا؟"۔

"بلکل۔"خطیب نے سر ہلایا۔

"مجھے لگتا ہے میں سمجھانے میں کام یاب ہو چکا ہوں۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں کہ کون میرے ساتھ ہے۔"اس کے لب مسکرا اٹھے تھے۔

"اور تم عربوں کے لیے میرے پاس ایک گل دستہ ہے۔"

وہ مسکرا کر بول رہی تھی

"گوئٹے کے West-östlicher Diwan دیوان شرق و غرب سے ایک انتخاب جس میں وہ عربوں کو اللہ کی چار عطا کردہ نعمتوں کا ذکر کرتا ہے۔ویسے عرب میرے پسندیدہ رہے ہیں جب تک انکے اندر جذبہ ایمانی رہا۔"

وہ کچھ سنا رہی تھی

"گوئٹے کو یہ دیوان لکھنے کی تحریک دیوان حافظ کے جرمن ترجمے کے مطالعے سے ہوئی تھی

دیوان حافظ کا پہلا جرمن زبان میں ترجمہ جوزیف فون ھامر پرجشتال نے 1812-1813 میں کیا تھا۔

"گوئٹے کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک عکس جس میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس نے اوپر بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی لکھا ہے۔وہ اسے یقین دلانے کے لیے موبائل کھول کر دکھا رہی تھی

"۔چار (عظیم) نعمتیں-Vier Ganaden"۔

اس نے اسکرین روشن کر لی تھی۔"

" ۔اللہ نے عربوں کی زندگی کو پر مسرت بنانے کے لیے انہیں چار عظیم نعمتوں سے نوازا۔
اول دستار جس کی شان کے آگے شہنشاہوں کے تاج ہیچ ہیں۔
دوم خیمہ جسے پر کیف زندگی گزارنے کے لیے چلتا پھرتا مسکن سمجھو۔
سوم تلوار جس کی کاٹ کے سامنے حفاظتی فصیل اور بلند و بالا مینار پر کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔
چہارم نغمہ صحرا جسے سن کر حسینانِ عالم وجد میں آئیں۔

میرے گیتوں میں وہ قوت ہے کہ وہ میری محبوبہ کی گل دار شال سے رنگ و بو چھین کر لے آئیں۔
میری محبوبہ کو بخوبی علم ہے کہ میرے یہ نغمے صرف اسی کے لیے ہیں۔
پھر وہ مجھ پر یوں مہربان کیوں نہ ہو؟ دوستو میں جب بھی آیا تمہارے لیے مید گل اور گیتوں کے ہار لایا۔
آج میں پھر تازہ پھل پھول اور نئے گیت تمہاری نذر کر رہا ہوں۔"
سلی چپ ہوئی تھی ماحول پے سکوت طاری ہو گیا
"تم کو دیکھ کر اکثر غم بھول جاتے ہیں۔"
خطیب نے سچے دل سے کہا
" کاش میں مشہور شامی شاعر نزار قبانی جیسا ہوتا۔ میں ایک چھوٹا سا دیوان تمہارے نام کرتا۔"
سلی اب کھل کر ہنس پڑی تھی ایسے لگا کہ بوار یا میں بن موسم کے بیلوں سے پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑے ہیں۔
باہر کھڑا وجود بلکل مبہوت رہ گیا تھا
اس نے دیکھا تھا کہ سلی حسین ہے
اسے اس وقت کھڑے کھڑے معلوم ہوا تھا کہ سلی اس کے دل پر کس قدر اثر انداز ہے
یا ہو رہی ہے؟۔

یا ہو چکی ہے؟

وہ دبے قدموں پلٹ گیا تھا اس حال میں کہ اس کا دل اس کے اختیار میں نہیں تھا وہ اپنا دل شہد رنگ بالوں والی لڑکی کے گھنگھر بالوں میں اٹکا آیا تھا۔

"زندگی کے اس سفر میں ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں، اس کے دو پہلو ہیں، ایک دایاں بازو اور ایک بایاں بازو ہے:

محبت کے پہلو بہ پہلو قہر ہے۔

تقدیر کے پہلو بہ پہلو خوف ہے۔

درد کے پہلو بہ پہلو شفا ہے۔

اذیت کے پہلو بہ پہلو معافی ہے۔

غرور کے پہلو بہ پہلو عاجزی ہے۔

دینے کے پہلو بہ پہلو لینا ہے۔

آنسوؤں کے پہلو بہ پہلو خوشی ہے۔

انکار کے پہلو بہ پہلو قبولیت ہے۔

فیصلہ کے پہلو بہ پہلو فضل ہے۔

عزت کے پہلو بہ پہلو شرمندگی ہے۔

جانے دینے کے پہلو بہ پہلو روکے رکھنا ہے۔

ہم صرف دو پروں سے پرواز کر سکتے ہیں اور دو پر صرف اسی صورت میں ہوا میں برقرار رہ سکتے ہیں جب ان میں توازن ہو۔ دو خوبصورت پنکھ ہی اوجِ کمال ہیں۔ لوگوں کی ایک نسل ہے جو ہر بار ان میں سے صرف ایک پر کے وجود کے طور پر کاملیت کو مثالی بناتی ہے۔ لیکن میں دیکھتی ہوں کہ ایک پر والا پرندہ نامکمل ہے۔ ایک بازو والا فرشتہ نامکمل ہے۔ ایک پر والی تتلی مر جاتی ہے۔ اس لیے لوگوں کی یہ نسل اپنے کامل آئیڈیل کو مجسم کرنے کی امید میں ہمیشہ دوسرے بازو کو کاٹ دینے کی کوشش

کرتی ہے، اور ایسا کرتے ہوئے، ایک اپاہج نسل پیدا کرتی ہے

there is a,For everything in this journey of life we are on
:right wing and a left wing
;for the wing of love there is anger
;for the wing of destiny there is fear
;for the wing of pain there is healing
;for the wing of hurt there is forgiveness
;for the wing of pride there is humility
;for the wing of giving there is taking
;for the wing of tears there is joy
;for the wing of rejection there is acceptance
;for the wing of judgment there is grace
;for the wing of honor there is shame
.for the wing of letting go there is the wing of keeping

We can only fly with two wings and two wings can only stay . Two beautiful wings is perfection.in the air if there is a balance There is a generation of people who idealize perfection as the But I see that a.existence of only one of these wings every time An angel with one wing is.bird with one wing is imperfect So this generation of. A butterfly with one wing is dead.imperfect people strive to always cut off the other wing in the hopes of have created, and in doing so,embodying their ideal of perfection .“.a crippled race

وہ اپنا سینہ خالی لے کر لوٹ رہا تھا

اس کے سینے کی جگہ ایک دل تھا جو ہجرت کر گیا تھا

یہ اس خداداد کے ساتھ کیا ہوا؟

جس کے پاس خداداد صلاحیتیں تھیں عقل اور زہانت تھی اور وہ جو چاہتا تھا وہ حاصل کر لیتا تھا

اور وہ جو صرف اپنے لیے سوچتا تھا صرف اپنے لیے۔

:اور اس پل خطیب نے اسے دبے قدموں جاتا دیکھ لیا تھا

اس نے اسے لوٹتا دیکھ لیا تھا

اور وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیوں پلٹ گیا؟

وہ اسے کھڑکی سے بیرونی سیڑھیاں اترتا دیکھ رہا تھا۔

وہ اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

کچھ تھا جو خطیب کی گھبراہٹ کو بڑھا رہا تھا

کوئی ایسی بے چینی ضرور تھی جس کے پیچھے کو راز چھپا تھا

"محمد الماغوط کہتے ہیں

گاؤں کے لوگ مجھ سے کہتے ہیں: یہاں تمہاری جگہ نہیں ہے۔

شہر کے لوگ مجھ سے کہتے ہیں: یہاں تمہاری جگہ نہیں ہے۔

وطن کے لوگ مجھ سے کہتے ہیں: یہاں تمہاری جگہ نہیں ہے۔

اور جلاوطنی میں بھی لوگ مجھ سے یہی کہتے ہیں: یہاں تمہاری جگہ نہیں ہے۔

تو پھر میری جگہ کہاں ہے؟ شاید خلا کی وسعتوں میں!

دودھ چھڑانے کے ابتدائی دور میں، جب میں روتا ہوا اپنی ماں کے پیچھے پیچھے گھسٹتا، جو مجھ سے بے خبر صفائی ستھرائی اور گرد جھاڑنے میں مگن ہوتی، تو میں اپنی نرم انگلیوں سے جو کچھ بھی سمیٹ سکتا تھا، اسے کھا لیتا تھا یعنی دہلیز، گلی اور صحن کی خاک۔ یوں لگتا ہے کہ میں نے تبھی سے اپنے وطن کا حصہ اپنے اندر

جذب کر لیا تھا۔۔"

اس کا دل مسلا گیا۔ الجھا گیا۔ اور لمحہ بھر کے لیے رک گیا

" میں اس لیے آئی ہوں کہ میرے کیس میں پیش رفت سے پہلے میں اپنے گھر میں ہونے والے حادثے کا حساب کرنا چاہتی ہوں۔

امید ہے بچوں کی ولادت کے بعد میرے نزدیک رہنے والے لوگ مجھ سے تعاون کریں گے۔

وہ بروز وہو یا میرے گھر کے پے انگ گیسٹ یا کوئی بھی جس پر شک کیا جا سکتا ہے۔

تو کیا تم ڈی این اے کے سیمپل کے لیے تیار ہو گے۔" ؟

اس کے اگلے الفاظ خطیب کی روح کو کھینچ لینے والے تھے۔۔

" کیا تم ہم پر شک کر رہی ہو؟"۔

" اسے شک مت سمجھو۔ یہ میرے کیس کے لیے بہت ضروری ہے۔۔"

" میں سمجھ سکتا ہوں۔ تو کیا تم اپنے مجرم کو سزا دلوانا چاہتی ہو۔" ؟

" سزا۔!؟"

وہ کچھ پل خاموش ہوئی تھی

" یہ ابھی میں نے نہیں سوچا۔ لیکن میرے لیے یہ اہم ہے کہ میں جان سکوں جو بوجھ میں نے اٹھا رکھا اس میں کون ایک فرد شریک تھا۔"

سنہرے نے یہ تمام باتیں کچن کی اوٹ میں سن لی تھیں

اور وہ بالکل ششدر کھڑی تھی

" تو کیا یہ لڑکی ریپ سے حاملہ تھی؟"۔

اس کا دل لرز گیا

" اور ہشام بھائی اس کا ساتھ دے رہے ہیں؟"۔

سنہرے نے کڑی سے کڑی ملا دی تھی

اور اسی رات اس نے اپنے بھائی خداداد سے یہ ذکر چھیڑ دیا

سنہرے نے دیکھا کہ خداداد کا رنگ ایک دم بدل گیا ہے

" وہ چاہتی ہے کہ اس کے گھر میں پے انگ گیسٹ بھی ڈی این اے ٹیسٹ کروائیں ۔ تو پے انگ گیسٹ میں آپ بھی شامل ہیں ۔"

خداداد کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا

" سنہرے تم یہاں آ کر زیادہ پر اعتماد ہو چکی ہو یا بد لحاظ ؟ میں تمہارا باپ جیسا بھائی ہوں ۔ سوچ سمجھ کر بولو ۔"

" بھائی ! میں نے کچھ غلط نہیں کہا ۔ یہ ہو کر رہے گا ۔ اس کا ارادہ نظر آ رہا ہے ۔"

" ہاں تو دیکھ لیں گے ۔ تم اس مسئلے سے دور رہو ۔"

" وہ لڑکی اپنے ہی گھر میں ریپ ہوئی ہے ۔"

سنہرے نے غم زدہ لہجے میں کہا

" اس کے اپنے ہی گھر میں چند دن میں بڑے بڑے حادثے ہوئے ۔ اس میں کیا ہم قصور وار ہیں اچانک اس کا پورا خاندان بکھر گیا ۔ بلکہ یہ اچانک نہیں تھا ۔ اس کی سوتیلی ماں سالوں سے دھوکہ دے رہی تھی اور اسی کی وجہ سے سب برباد ہوا ۔" خداداد نے گہرا سانس بھرا

" تم سے پھر کہہ رہا ہوں ۔ اپنی پڑھائی پے توجہ دو ۔"

" ہاں ٹھیک ہے خدا آپ کی حفاظت کرے بھائی ۔"

سن ✕ رے کچن میں چلی گئی تھی

خداداد لیونگ روم میں آیا جہاں خطیب پہلے سے گم صم بیٹھا تھا

" تم نے کچھ سنا ہے ۔"

و ✕ چونک گیا تھا

" یہ سب ہو گا کیا ؟ ۔"

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے مگر تم کیوں کنفیوز ہو۔"

"ہمارا کیا تعلق ہے اس معاملے سے؟ ہمیں کیوں انوالو کر رہے ہیں؟"۔

خداداد غصے میں تھا بلکہ اس کا دماغ کھول رہا تھا

"ہمیں اور کوئی کام نہیں کیا؟ "۔

میں بھی پریشان ہوں مگر ہمیں کرنا ہی ہوگا۔"

" مائی فٹ۔" وہ کھولتا ہوا اندر چلا گیا

"ہمیں یہ جگہ چھوڑنی ہوگی"۔

وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

☆......☆......☆

"محبت کبھی بھی طبعی موت نہیں مرتی۔ یہ اس لیے مرجاتی ہے کہ ہمیں نہیں معلوم اس کے سرچشمے کو کیسے لبریز رکھنا ہے۔ یہ کور چشمی، لغزشوں اور بے وفائی سے مرجاتی ہے۔ یہ روگ اور گھاؤ سے مرجاتی ہے؛ یہ درماندہ، پژمردہ اور داغ دار ہونے سے مرجاتی ہے۔"

شافیہ گنگا رہی تھی آج کا دن اداس تھا

اس کی گنگناہٹ میں اداسی صاف ظاہر تھی

ہشام آج گھر پے تھا۔ اسی حساب سے اپنے کام کر رہا تھا۔

چھٹی کے دن اس کے بہت سارے جمع ہوئے کام منتظر ہوتے تھے جو وہ خود ہی کرنا پسند کرتا تھا

وہ بھی شافیہ کی طرح تنہائی پسند تھا۔

اور شافیہ کتابوں میں رہ کر انسانوں سے بات کرنے کا سلیقہ بھول چکی تھی

اور ایلف کہتی ہے

" اس کے علاوہ اسکے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا۔

کبھی کبھار درختوں کو بھی اپنی جڑیں ہاتھوں میں تھام کر چلنا پڑتا ہے...

پورے جنگل پر ہجرت آن اترتی ہے"

"کیا مطلب؟"

"ہم کسی زمین پر کتنے ہی گہرے کیوں نہ گڑ چکے ہوں کبھی کبھار طوفان اتنے زورآور ہوتے ہیں کہ ہمیں اپنی ذمین سے نکال باہر کرتے ہیں"

""" آپ تو پہلیاں بجھا رہی ہیں"

"سچائی کی دیوی کو پہیلیوں کا لبادہ اوڑھنا ہی پڑتا ہے"

"مگر سچائی کو لبادے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"سچائی بے لباس نکلے تو لوگ گلی میں پتھر مارتے ہیں"

اس نے گہرا سانس لیا

" زندگی سچ سے زیادہ کڑوی ہے۔"

" اور میری یہاں موجودگی زندگی سے زیادہ بے مقصد۔"

اس نے بہت دور سمندر پار اپنے پیاروں کو یاد میں ٹٹولا تو اسے کسی کا بھی چ※ر※ یاد نا آیا

سب بے رنگ تھا اس کے باپ کا چہرہ بھی

وہ باپ جس پر شاعروں نے دیوان لکھے اس کو باپ کی شکل بھی یاد نہیں آ رہی تھی اس کے نقش بھی بھول رہے تھے

کیوں کہ چند دن پہلے ایک فون کال پے بتایا گیا تھا کہ اس کا باپ ہارٹ اٹیک سے مارا گیا ہے اور اس کو دفن کرنے کے بعد اس کے اثاثے تقسیم کر لیے گے تھے

وہ لوگ جن کی زندگی صرف ضرورت اور پیسے کے گرد گھومتی ہے۔ وہ اپنے مقصد کو پا کر کسی کو یاد بھی نہیں کرتے

اس کی سوتیلی ماں اب اپنی مرضی کی زندگی جی لے گی اور اس کی بہن عرشیہ بھی۔

سب کچھ اچھا تھا یا ہو گیا تھا بس ایک لڑکی کا باپ کھو گیا تھا

"بڑی ہوگئی ہوں، میرے پیارے ابا جان!
اب جان گئی ہوں کہ چاند، جسے میں ہمیشہ اپنا ہم سفر سمجھتی تھی،
درحقیقت میرے پیچھے نہیں آتا۔
وہ گاڑی تھی جو چلتی تھی، درخت اور پہاڑ جامد تھے،
اور اندھیرا وہ بھیانک دیو نہیں تھا جس کا میں تصور کرتی تھی۔
تتلیاں ان نرم اور روشن روحوں کا استعارہ نہیں تھیں
جو ہم سے جدا ہو چکی ہیں،
اور قبر بھی وہ خوفناک جگہ نہیں جس سے میں کانپتی تھی۔
بڑی ہوگئی ہوں، ابا جان...
اور یہ تلخ حقیقت بھی جان لی
کہ جسے دل کی گہرائیوں سے چاہا، وہ ہمیشہ ہمیں واپس ویسی ہی محبت نہیں دیتا۔
ہر مسکراہٹ جو ہماری طرف بڑھتی ہے، دوستی کا وعدہ نہیں ہوتی،
اور ہر آنسو جو آنکھوں سے ٹپکتا ہے، ہمیشہ کسی زخم کا نشان نہیں ہوتا؛
کبھی آنسو دل کی تطہیر کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔
بڑی ہوگئی ہوں، ابا جان...
اور کاش یہ سفر رک سکتا۔
کاش میں کبھی بڑی نہ ہوتی، کبھی حقیقتوں کے بوجھ سے دو چار نہ ہوتی.
کاش میں اس بچپن کی معصومیت میں واپس جا سکتی،
اس ننھی کلی کی طرح، جس کا دل صاف، بے داغ تھا، جس نے نہ کبھی دکھ کو پہچانا اور نہ کبھی غم کی شدت کو محسوس کیا...
اللہ آپ پر اپنی رحمتیں نازل کرے، بابا...

آپ کی بہت یاد آتی ہے، دل کی گہرائیوں سے۔"

اس کے آنسو جو چار راتوں سے ہشام نے صاف کیے تھے کیونکہ

وہ ایک دردمند دل رکھنے والا انسان تھا۔

بیانکا سپارا کینو نے ٹھیک کہا تھا

"وہ شخص بنو جو پروا کرتا ہے۔

وہ شخص بنو جو کوشش کرتا ہے، وہ شخص جو بنا ہچکچاہٹ محبت کرتا ہے۔

وہ شخص بنو جو یہ سب کچھ کھلم کھلا کرتا ہے، وہ شخص جو اپنے احساسات کی گہرائی، یا اپنی امید کی شدت سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتا ہے۔

وہ شخص بنو جو دنیا کی نرمی پر یقین رکھتا ہے، دوسروں کی بھلائی پر یقین رکھتا ہے، کھلے اور بے باک ہونے اور بھروسہ کرنے کی خوبصورتی پر یقین رکھتا ہے۔

وہ شخص بنو جو موقع حاصل کرتا ہے، جو چھپنے سے انکار کرتا ہے۔

وہ شخص بنو جو لوگوں کو دیکھنے کا احساس دلاتا ہے، وہ شخص جو جیسا ہو ظاہر کرتا ہے۔

میرا اعتبار کرو جب میں کہتی ہوں؛ وہ شخص بنو جو پروا کرتا ہے۔ کیونکہ دنیا کو مزید لاپروائی، مزید غفلت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ کسی ایسے شخص سے زیادہ طاقتور کچھ بھی نہیں ہے جو ایک ایسی دنیا میں حلیم رہتا ہے جو ہمیشہ ان کے ساتھ مہربان نہیں رہی ہے۔"

وہ ایک ہشام جیسا تھا۔ اس جیسے کم تھے مگر ضرور تھے۔

اسی لیے دنیا کا نظام چل رہا تھا۔

ہشام نے اسے ٹیرس سے دیکھا وہ گم صم تھی درد میں تھی اور شاید مایوس بھی۔

وہ گہرا سانس لے کر کچن میں گیا اس نے کافی کے دو مگ بنائے اور اس کے قریب آگیا

"میں نے ایک فلسفی سے استفسار کیا۔

"اے حکمت کے عالم، تنہائی کو کس طرح بیان کرو گے؟"

اس نے تھوڑی دیر خاموشی اختیار کی، پھر بولا۔

"تنہائی وہ حالت ہے جب تمہارے پاس خوشیوں کی خبریں ہوں یا غم کے قصے، مگر کوئی ایسا شخص نہ ملے جس کے ساتھ انہیں شیئر کر سکو۔"

میں نے پھر سوال کیا: "اور اجنبیت؟"

وہ زیرِ لب مسکرایا اور بولا:

"اجنبیت یہ ہے کہ تم لاکھوں لوگوں کے بیچ میں ہو، مگر تمہارا دل اور دماغ کسی اور جہان میں بھٹک رہا ہو۔"

میں نے اگلا سوال کیا: "خاموشی کی کیا حقیقت ہے؟"

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا:

"خاموشی وہ ہے جب تم ظاہراً خاموش نظر آتے ہو، لیکن تمہارے دماغ میں خیالات کا طوفان مچل رہا ہو، جو کبھی تھمنے کا نام نہ لے۔"

میں نے پوچھا۔ "اور پختگی؟"

وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولا۔

"پختگی وہ ہے جب تم اپنے دل کی خواہشات کے برخلاف اپنی عقل کے فیصلوں کو ترجیح دو۔"

میں نے کہا "طاقت کا کیا مطلب ہے؟"

اس نے نظریں اٹھا کر کہا:

"طاقت یہ ہے کہ تم لوگوں کے سامنے مضبوط نظر آؤ، جب کہ تمہارا اندر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو۔"

پھر میں نے پوچھا۔ "انتظار سے بڑا کرب کیا ہے؟"

وہ اداسی میں ڈوبا ہوا بولا:

"تمہارا دل کسی بھی چیز سے بے شغف ہو جائے۔"

میں نے دریافت کیا: "غم سے زیادہ سخت کیا ہے؟"

فلسفی نے نگاہوں میں گہری افسردگی کے ساتھ جواب دیا:

"یہ کہ تم غم کے اس قدر عادی ہو جاؤ کہ وہ تمہاری ذات کا ایک حصہ بن جائے، جیسے سانس لینا، جس کے بغیر تم زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

آخر میں میں نے کہا: "درد کو کس طرح سمجھاؤ گے؟"

وہ خاموش رہا، پھر دھیرے سے بولا:

"درد وہ ہے جب حروف کی ترتیب بدل جائے اور "امل" (امید)

کا لفظ بدل کر 'الم' بن جائے..."

وہ چونک گئی تھی

"تم کب آئے۔"

"27 سال پہلے۔"

"پر تم ہماری دنیا کے نہیں ہو۔"

"کوئی ایک تو ایسا ہو۔"

"تم بہت اچھے ہو ہشام! میں چاہتی ہوں تم وہ سب پالو جو تم چاہتے ہو۔"

اس نے دل سے کہا

"دکھی دل کی دعا قبول ہوتی ہے۔" وہ مسکرا دیا

"تم خود کو سنبھال لو۔ ہر رات کی ایک صبح ہوتی ہے اسے امید کہتے ہیں ہر آنے والے نے ضرور جانا ہے۔"

"دکھ اپنی محرومیوں کا ہوتا ہے نا کہ کسی کے بچھڑنے کا۔" شافیہ نے کہا

"یہ حقیقت ہے۔"

"ہاں یہ حقیقت ہے اور معاف کرنا بھی حقیقت ہے اس سے سکون ملتا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا اس کی باتیں دل پر اثر کرتی تھیں۔

" میں نے ان غلطیوں کو معاف کر دیا ہے جو واقعی ناقابل معافی تھیں۔
میں نے ان لوگوں کا بدل پانے کی کوشش کی ہے جو بے بدل تھے اور ان لوگوں کو بھولنے کی کوشش کی جو ناقابل فراموش تھے۔
میں نے جذبات پر عمل پیرا ہو کر، جب یہ سوچا کہ ایسا کبھی ممکن نہیں ہو سکتا ہے تو لوگوں سے مایوس ہوا ہوں۔
لیکن میں نے ان لوگوں کو بھی مایوس کیا ہے جن سے میں محبت کرتا ہوں۔
میں نامناسب مواقع پر ہنسا ہوں۔
میں نے ایسے دوست بنائے ہیں جو اب زندگی بھر کے دوست ہیں۔
میں خوشی کے لیے چیخیں مارتا اور چھلانگیں لگاتا ہوں۔ میں نے محبت کی ہے اور مجھ سے محبت کی گئی ہے۔
لیکن مجھے بھی مسترد کیا گیا ہے اور مجھ سے بے لوث محبت بھی کی گئی ہے۔
میں نے صرف محبت کی خاطر زندگی گزاری ہے اور ابدی محبت کی قسمیں کھائی ہیں۔
میرا دل کئی بار ٹوٹ چکا ہے!
موسیقی سنتے ہوئے اور پرانی تصاویر دیکھتے ہوئے میں رو پڑتا ہوں۔
میں نے کسی کو صرف دوسری طرف اس کی آواز سننے کے لئے کال کی ہے۔
مجھے مسکراہٹ کے ساتھ محبت ہو گئی ہے۔
بسا اوقات، میں سوچتا تھا کہ میں مر جاؤں گا کیونکہ میں نے کسی کو بہت یاد کیا۔
ایک دور ایسا بھی گزرا جب میں خائف تھا کہ کہیں میں کسی خاص شخص کو کھو نہ دوں (جو بہر حال کھو گیا۔ لیکن میں زندہ ہوں!)
اور میں اب بھی ہر روز زندہ رہتا ہوں.
میں صرف زندگی گزار نہیں رہا ہوں... اور آپ کو بھی نہیں گزارنا چاہیے.

جیو!

زندگی میں سب سے اچھی چیز یہ ہے کہ آپ اپنے تمام منصوبوں اور اپنے خوابوں کے ساتھ آگے بڑھیں،

زندگی کو گلے لگانا اور ہر روز جذبے کے ساتھ جینا،

ہارنا اور پھر بھی یقین برقرار رکھنا اور شکر گزار رہوتے ہوئے جیتنا۔

یہ سب اس لیے کہ دنیا ان لوگوں کی ہے جو اپنی مرضی کے مطابق چلنے کی ہمت رکھتے ہیں۔

اور کیونکہ زندگی واقعی بہت چھوٹی ہے سو اسے بے معنی نہ جانو۔"

"اس ریل گاڑی میں جہاں سب چپ چاپ

اپنے آپ میں کھوئے بیٹھے ہیں، جہاں

کسی اجنبی زبان کا سکوت پھیلا ہے

ایک بچے کے روتے ہی مجھے لگتا ہے

جیسے میں نے ہندی سن لی ہو

وہ ہندی ہی تھی ہندی، جس میں ڈچ بھی تھی، فرانسیسی بھی، ہسپانوی بھی، اطالوی بھی...

ہاں، اس بچے کا رونا اور

روتے ہی چلے جانا ہندی ہی تھا

اور ڈچ اور فرانسیسی

اور ہسپانوی اور اطالوی

چپ کرواسے او بھلی عورت، چپ کرو

اتنی ساری زبانوں کے سیلاب کو

تم سہہ نہیں پاؤ گی

چپ کرواسے او بھلی عورت، چپ کرو۔"

اس نے کافی کا سپ بھرا

"دنیا کی بدصورتیوں اور تلخیوں سے فرار حاصل کرنے کا بہترین طریقہ کتب کا مطالعہ ہے۔

To acquire the habit of reading is to construct for yourself a"

Somerset Maugham.W".refuge from almost all the miseries of life

"میں ایک سوال پوچھ سکتی ہوں"۔؟

"ہاں ضرور۔"

"سلسبیل سے محبت ہے؟"۔

"یہ کہنا بہتر ہوگا مجھے سلسبیل سے محبت ہوگئی تھی بس یوں ہی راہ چلتے۔"

ہشام کے لبوں پر مسکان سی بکھر گئی تھی اور اس کی آنکھیں اچانک چمک گئی تھیں۔ان میں ہیرے بھر گے تھے

محبت ایسی ہی روشن ہوتی ہے

شافیہ مبہوت رہ گئی تھی

"یہ جان کر بھی کہ اس کا ریپ ہوا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"۔

"کیا سوچ کی یہ تبدیلی آزاد معاشرے میں رہنے کی وجہ سے ہے جہاں لٹ تو ار پن کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

"سوچ کسی معاشرے کی محتاج نہیں ہوتی اور اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اس کے اپنے ہی گھر میں۔۔"

ہشام نے دکھ سے بتایا

"وہ ٹوٹ گئی تھی۔شاید میں نا ہوتا تو وہ خود کو ختم کر لیتی۔وہ ایک چھوٹی لڑکی ہے۔اور اپنے ہی

گھر والوں کے ظلم اور کم توجہی کا شکار تھی۔اس کی دادی اچھی عورت تھی۔کلی کا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔میں اس کا حوصلہ ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔" شافیہ نے کہا

"اگر مجھے پہلے اس حادثے کا علم ہو جاتا تو میں یہ سب جو آج ہم دونوں ہیں یہ کبھی نا کرتا اور حالات کچھ اور ہوتے۔"

آج پہلی بار ہشام نے اس موضوع پے بات کی تھی۔

"حالات اب بھی بدل سکتے ہیں۔تم نے میرے لیے جو کچھ بھی کیا۔یہ کوئی بھی نہیں کرتا۔"

شافیہ نے تہ دل سے کہا

"میں نے تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔یہ اپنی اس ماں سے کیا وعدہ تھا جسے میں نے پورا کیا اور کچھ بھی نہیں۔وہ میری ماں تھی جس نے مجھے جنم نہیں دیا مگر میں اسی کا بیٹا ہوں۔"

"تو اب کیا کرنا ہوگا؟"۔

شافیہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ دریا کے دو کنارے ہیں جو کبھی مل نہیں سکتے۔ساتھ تو رہ سکتے ہیں

"میں بد عہد نہیں ہوں۔"

"مگر کلی اس کمٹمنٹ میں شامل ہے۔"

"وہ میری زندگی کا حصہ ہے اور تم میری ذمہ داری ہو۔میں چاہتا ہوں تم خود مختار زندگی جیو بغیر کسی سہارے کے۔میں تم کو سپورٹ کروں گا۔تاکہ زندگی میں تم کو کسی جی جی کی وجہ سے اپنی زندگی گروی رکھنی نا پڑے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا مگر اس کے ہاتھ میں موجود کتاب میز پے رکھی تھی آج وہ اپنی کتابوں کی صفائی کر رہا تھا۔

"میں اس سب کے لیے دل سے شکر گزار ہوں کوئی کسی انسان کے لیے اتنا نہیں کرتا۔"

شافیہ نے کہنا چاہا

"یہ سب میری ماں کے لیے ہے۔

وہ اٹھ کر چلا گیا تھا

اور شافیہ نے دیکھا

وہاں کتاب کھلی پڑی تھی

عربی ادب کے معروف شاعر امراؤ القیس کی لازوال نظم کے چند اشعار اس میں موجود تھے۔ ان اشعار میں شاعر اپنی محبوبہ کے حسن اور اس سے ملاقات کا احوال بیان کرتا ہے۔!

مگر یہ خطیب کی طرف سے تحفہ تھا جس میں خطیب نے سلسبیل اور ہشام کا واضح نام بھی لکھا تھا

"فَجِئْتُ وَقَدْ نَضَّتْ لِنَوْمٍ ثِيَابَهَا
لَدَى السِّتْرِ إلاَّ لِبْسَةَ المُتَفَضِّلِ

میں اس کے پاس ایسے وقت میں پہنچا، جبکہ وہ چلمن کے پاس جامہ خواب کے علاوہ سونے کے لیے (سب) کپڑے نکال چکی تھی۔

She had cast off from her every. I stood there.Stealing in

. aal but her night garment,robe but one robe

فَقَالَتْ: يَمِينَ اللهِ مَا لَكَ حِيلَةٌ
وَمَا إِنْ أَرَى عَنْكَ الغَوَايَةَ تَنْجَلِي

(جب میں اس کے پاس پہنچا) تو وہ بولی، خدا کی قسم تیرے لیے اب کوئی عذر نہیں اور میں نہیں

خیال کرتی کہ تجھ سے یہ (عشق کی) گمراہی زائل ہو جائے گی۔

you have no excuse,I swear by God",Then she said to me ;for your wild life

I can not expect that your erring habits will ever be removed ".from your nature

خَرَجْتُ بِهَا أَمْشِي تَجُرُّ وَرَاءَنَا
عَلَى أَثَرَيْنَا ذَيْلَ مِرْطٍ مُرَحَّلِ

میں اس کو ایسے حال میں لے کر نکلا کہ وہ چل رہی تھی اور ہم دونوں کے نشاناتِ (قدم) پر ہمارے پیچھے منقش چادر کے دامن کو کھینچ رہی تھی۔

, and drawing behind us, she walking;I went out with her ,over our footmarks

to erase the,The skirts of an embroidered woolen garment .footprints

فَلَمَّا أَجَزْنَا سَاحَةَ الحَيِّ وَانْتَحَى
بِنَا بَطْنُ خَبْتٍ ذِي حِقَافٍ عَقَنْقَلِ

پس جب ہم قوم کی آبادی سے نکل گئے اور ایک وسیع ریگستان کے درمیان جو ٹیلوں والا تھا، پہنچے (لَمَّا کا جواب اگلے شعر میں ہے)۔

,Then when we had crossed the enclosure of the tribe

with its sandy undulations and,The middle of the open plain

. we sought,sandhills

هَصَرْتُ بِفَوْدَيْ رَأْسِهَا فَتَمَايَلَتْ
عَلَيَّ هَضِيْمَ الْكَشْحِ رَيَّا الْمُخَلْخَلِ

تو میں نے اس کی دو زلفوں کے ذریعہ (اس کو اپنی طرف) جھکایا۔ چنانچہ وہ باریک کمر، گداز پنڈلی والی (معشوقہ) میری طرف جھک آئی۔

and she;I drew the tow side-locks of her head toward me

;leant toward me

. and full in the ankle,She was slender of waist

مُهَفْهَفَةٌ بَيْضَاءُ غَيْرُ مُفَاضَةٍ
تَرَائِبُهَا مَصْقُولَةٌ كَالسَّجَنْجَلِ

وہ معشوقہ نازک کمر، خوبرو، سُتے ہوئے بدن کی ہے۔ اس کا سینہ آئینے کی طرح درخشاں ہے۔

, slender of body, white-skinned,Thin-waisted

.Her breast shining polished like a mirror

كَبِكْرِ المُقَانَاةِ البَيَاضَ بِصُفْرَةٍ
غَذَاهَا نَمِيْرُ المَاءِ غَيْرُ المُحَلَّلِ

(وہ محبوبہ) اس موتی کی طرح ہے جس میں زردی اور سفیدی ملی ہوئی ہو، جس کو (ایسے) صاف پانی سے سیراب کیا ہو جس پر لوگ نہ اترے ہوں۔

,In complexion she is like the first egg of the ostrich—white

.mixed with yellow

, unsullied by the descent of many people in it,Pure water

.has nourished her

تَصُدُّ وتُبْدِي عَنْ أسِيْلٍ وَتَتَّقِي
بِنَاظِرَةٍ مِنْ وَحْشِ وَجْرَةَ مُطْفِلِ

وہ اعراض کرتی ہے اور ایک دراز رخسار ظاہر کرتی ہے اور مقام وجرہ کے بچہ والے وحشی (ہرن) کی آنکھ کے ذریعہ بچتی ہے۔

forbidding, and shows her smooth cheek,She turns away ,with a glancing eye

in the desert of, with young,Like that of a wild animal .Wajrah

وَجِيْدٍ كَجِيْدِ الرِّئْمِ لَيْسَ بِفَاحِشٍ
إِذَا هِيَ نَصَّتْهُ وَلاَ بِمُعَطَّلِ

اور ایک ایسی گردن (کو ظاہر کرتی ہے) جو گردنِ آہو کی مثل ہے جبکہ وہ اس کو بلند کرے تو لمبی (بے ڈول) اور بے زیور نہیں ہے۔

;And she shows a neck like the neck of a white deer

nor,It is neither disproportionate when she raises it .unornamented

وَفَرْعٍ يَزِيْنُ الْمَتْنَ أَسْوَدَ فَاحِمٍ
أَثِيْثٍ كَقِنْوِ النَّخْلَةِ الْمُتَعَثْكِلِ

اور ایسے بال (دکھاتی ہے) جو کمر کو زینت دیتے ہیں، سخت سیاہ ہیں۔ اتنے گھنے ہیں جیسے پھلدار کھجور کا خوشہ۔

adorns, when loosened,And a perfect head of hair which her back

thick like a date-cluster on a, very dark-colored,B l a c k .heavily-laden date-tree

غَدَائِرُهُ مُسْتَشْزِرَاتٌ إِلَى العُــلاَ
تَضِلُّ العِقَاصُ فِي مُثَنًّى وَمُرْسَــلِ

اس (محبوبہ) کی مینڈھیاں اوپر کو چڑھی ہوئی ہیں، جوڑا گندھے ہوئے اور چھوٹے بالوں میں غائب ہوجاتا ہے۔

;Her curls creep upward to the top of her head

and the hair falling,And the plaits are lost in the twisted hair .loose

وكَشْحٍ لَطِيفٍ كَالجَدِيْلِ مُخَصَّــرٍ
وسَاقٍ كَأُنْبُوبِ السَّقِيِّ المُذَلَّــلِ

اور ایسی نازک کمر جو مہارِ (شتر) کی طرح ہے اور پنڈلی جو نرم اور تر بانسی کی پوری کی طرح ہے (دکھاتی ہے)۔

thin as the twisted,And she meets me with a slender waist

.leathern nose-rein of a camel

Her form is like the stem of a palm-tree bending over from

.the weight of its fruit

وتُضْحِي فَتِيْتُ المِسْكِ فَوْقَ فِراشِهَا
نَئُوْمُ الضُّحَى لَمْ تَنْتَطِقْ عَنْ تَفَضُّلِ

وہ (سوتے سوتے) دن چڑھا دیتی ہے، درانحالیکہ مشک کے ٹکڑے اس کے بستر پر پڑے ہوتے ہیں۔ چاشت کے وقت تک خوب سونے والی ہے اور اس نے (کام دھندے کے لیے) معمولی کپڑے پہننے کے بعد پٹکا نہیں باندھا۔

the particles of musk are, when she wakes,In the morning

.lying over her bed

she does not need to gird;She sleeps much in the morning

.her waist with a working dress

وتَعْطُو بِرَخْصٍ غَيْرَ شَثْنٍ كَأَنَّهُ
أَسَارِيْعُ ظَبْيٍ أَوْ مَسَاوِيْكُ إِسْحِلِ

وہ ایسی نرم و نازک (انگلیوں) سے (چیزیں) پکڑتی ہے گویا کہ وہ (انگلیاں) مقامِ ظبی

کے کیچنوے یا اسحل (درخت) کی مسواکیں ہیں۔

as if they were the, not thick,She gives with thin fingers

,worms of the desert of Zabi

تُضِيءُ الظَّلامَ بِالعِشَاءِ كَأَنَّهَا
مَنَارَةُ مُمْسَى رَاهِبٍ مُتَبَتِّلِ

(حسین چہرہ کے ذریعہ) شام کے وقت تاریکی کو روشن کر دیتی ہے گویا کہ وہ تارک الدنیا راہب کا شام کا چراغ ہے۔

as if she were,In the evening she brightens the darkness

.the light-tower of a monk

إِلَى مِثْلِهَا يَرْنُو الحَلِيمُ صَبَابَةً
إِذَا مَا اسْبَكَرَّتْ بَيْنَ دِرْعٍ وِمِجْوَلِ

اس جیسی محبوبہ کی طرف بردبار (انسان بھی) عشق کی وجہ سے نظر جما کر دیکھتا ہے جب کہ وہ قمیص پہننے والی (عورتوں) اور کرتی پہننے والی (بچیوں) کے درمیان کھڑی ہو۔

, the wise man gazes incessantly,Toward one like her

lovingly

She is well proportioned in height between the wearer of a

.long dress and of a short frock

تَسَلَّتْ عَمَايَاتُ الرِّجَالِ عَنِ الصِّبَا
وَلَيْسَ فُؤَادِي عَنْ هَوَاكِ بِمُنْسَلِ

لوگوں کی نوخیز عمر کی (عاشقانہ) گمراہیاں زائل ہو گئیں (مگر اے محبوبہ) میرا دل تیری محبت سے جدا ہونے والا نہیں۔

but my heart does not,The follies of men cease with youth

.cease to love you

ناول سلسبیل کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 12 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

آخری قسط نمبر 22

شافیہ عجیب سے احساس کا شکار تھی۔ سنہرے برنچ کے دوران بھی اور بعد میں بھی۔ وہ خداداد کے اضطراب کے پس منظر سے واقف ہونا چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا اس کے پیچھے کچھ ہے۔ کوئی راز جو پوشیدہ ہو جسے طشت از بام ہونے کی ضرورت تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے آج کے دن کچھ تو لازمی ہوگا۔ ایسا کچھ ہولناک جسے سماعتیں سننا گوارا نہیں کریں گی۔

کچھ لوگ جو مایوس تھے اور کچھ پر امید تھے۔ اسے لگتا تھا مایوس لوگ زیادہ ہیں۔

''مایوسی کے لیے کوئی دقت نہیں، خود ترسی کی کوئی جگہ نہیں، خاموشی کی ضرورت نہیں، خوف کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہم بولتے ہیں، ہم لکھتے ہیں، ہم زبان بولتے ہیں۔ اسی طرح تہذیبیں شفا پاتی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ دنیا زخموں سے بھری ہے اور خون بہہ رہا ہے، اور اگرچہ اس کے درد کو نظر انداز نہ کرنا ضروری ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی برائی کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا جائے۔ ناکامی کی طرح، انتشار میں ایسی معلومات ہوتی ہیں جو فن کی طرح علم و حکمت تک لے جاسکتی ہیں۔

ڈی سوزا کی مثال کافی تھی۔

جو آج کل آزردہ تھی۔ اس نے سنہرے کے ساتھ اسے باتیں کرتے سنا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے دکھ سکھ کہہ رہی تھیں۔

''مجھے لگتا ہے میری کوشش بے کار ہے۔ میرے ڈیڈ کسی مسلم سے میری شادی نہیں کریں گے۔ وہ رومن کیتھولک ہیں۔''

''تو پھر تم کیا کرو گی؟'' سنہرے نے پوچھا۔

''صبر کروں گی اور ڈیڈ کے اگینسٹ جا کر پریشانیاں نہیں خرید سکتی وہ بھی اس صورت میں جب دوسرا فریق آپ کے لیے کچھ خاص جذبات نہ رکھتا ہو۔''

ڈی سوزا ایک دم کیسے بڑی ہو گئی تھی اور انتہائی مدبرانہ گفتگو کر رہی تھی۔ شافیہ اس کی سمجھ داری پہ حیران ہوئی۔

ہنری وارڈ ورتھ کہیں دور سوز بھری آواز میں کہہ رہے تھے۔

''دن ڈھل گیا اور رات کے پروں سے اندھیرا یوں اترتا ہے، جیسے دوران پرواز کسی شاہین کے بال و پر بکھر جائیں۔ میں بارش اور دھند میں لپٹی گاؤں کی روشنیوں کو چمکتا ہوا دیکھتا ہوں، اور اداسی کا احساس یوں میرے اندر در آتا ہے کہ میری روح مزاحمت نہیں کر سکتی۔

اداسی اور آرزو کا احساس،
جو درد کے مترادف نہیں ہے،
اور صرف غم کے مشابہ ہے۔
جیسے دھند بارش سے مشابہ ہے۔
آؤ میرے لیے کوئی نظم پڑھو،
کوئی سادہ اور دل کو چھونے والی،
جو اس بے چین احساس کو سکون دے،
اور دن کے خیالات کو محو کر دے،
یہ عظیم پرانے آقاؤں سے،
نہ ان عالی شاعروں سے،
جن کے دور جاتے قدموں کی چاپ
وقت کی راہداریوں میں گونجتی ہے۔

کیونکہ، عسکری ساز کے تناؤ کی طرح، ان کے زبردست خیالات زندگی کی لامتناہی محنت اور

کوشش کا مشورہ دیتے ہیں۔

اور آج رات میں آرام کی آرزو کرتا ہوں۔ پڑھیے کسی عاجز شاعر کا کوئی کلام،

جس کے گیت دل سے نکلے ہوں،

جیسے ساون کی گھٹاؤں سے بارش کی بوچھاڑ،

یا پلکوں کے بند سے بہتے آنسوؤں کی قطار،

وہ جس نے مشقت کے لمبے دنوں۔

اور آرام سے خالی راتوں میں

اپنی روح میں بسی شاندار دھنوں کی موسیقی سنی۔

ایسے نغمات فکر کی بے چین نبض کو خاموش کرنے کی طاقت رکھتے ہیں،

اور دعا کے بعد درود کی طرح آتے ہیں۔

پھر نسخہ گر بہا سے

اپنی پسندیدہ نظم پڑھو،

اور شاعر کی شاعری کو مستعار دو

اپنی آواز کا ترنم،

اور رات موسیقی سے بھر جائے گی،

اور فکریں، جو دن کو متاثر کرتی ہیں،

اپنے خیموں کو عربوں کی طرح لپیٹ لیں گی،

اور جیسے چپکے سے کھسک جائیں گی۔

ڈی سوزا کی آواز بھیگ رہی تھی، ہاں رونا اس کا حق تھا وہ اسے استعمال کر سکتی تھی مگر اس نے خود پر جلدی قابو پا لیا تھا۔ یہ شافیہ کے لیے حیران کن تھا۔

لڑکیاں مشرق کی ہوں یا مغرب کی محبت میں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔

شافیہ نے یہ بات اس خاص لمحے میں سوچی تھی۔

پھر اس نے دیکھا فلسطینی لڑکا خطیب اس مغرور لڑکے خداداد سے پوچھ رہا تھا۔

''کیا تمہیں اس سے محبت ہے؟''

''محبت؟ معلوہم نہیں۔''

مگر جب وہ دور ہوتی ہے تو لوگوں کے چہروں کی رونق مدھم پڑ جاتی ہے،

ہوا کی مہک میں جیسے دھندلکوں کی ملاوٹ ہو جاتی ہے۔

''تو پھر تمہیں اس سے محبت ہے۔''

''بات کو یوں مت بڑھاؤ، حقیقت اتنی سادہ نہیں۔ اس کی غیر موجودگی ایک تاریک خلاء کی مانند ہوتی ہے، جو میری دنیا کے سارے رنگوں کو نگل لیتی ہے اور جب وہ واپس آتی ہے تو اپنی مسکان کے ساتھ چرائے ہوئے رنگ اور خوشیوں کا عکس پھر لوٹا دیتی ہے۔''

''یقیناً تمہیں اس سے محبت ہے۔''

''خدارا، فیصلے میں جلدی مت کیجیے۔

بات اتنی نہیں جتنی تم سمجھ رہے ہو،

بات بس اتنی ہے کہ جب وہ نہیں ہوتی تو جیسے میں اپنے آپ میں بے وطن ہو جاتا ہوں، اجنبی سا۔

شافیہ تھم سی گئی تھی۔

تو وہ لڑکی بھلا کون تھی؟

کیا یہ شہد رنگ آنکھوں والی لڑکی؟

یہ بھلا کس کس کو قتل کرے گی؟

ڈاکٹر ہشام کو؟

یا خداداد کو؟

اور اس کی شہد رنگ قاتل آنکھیں کس کس کا قتل کریں گی؟

تو یہ لڑکی خونی تھی؟ جو اس قدر مظلوم بنی ہوئی تھی۔ ہر کوئی اس کے عشق میں گرفتار ہو رہا تھا؟

شافیہ کی سوچیں آلودہ ہونے لگیں تو اس نے ایک جھرجھری لے کر خود پر قابو پایا تھا۔

''سلی! تو تم کیا کرو گی؟ کیا یہ بچے اکیلے پال سکو گی؟''

شافیہ کی غیر متوقع آواز سن کر سلی چونک گئی تھی بلکہ ٹھٹک گئی تھی۔

''یہ کیسا سوال ہے؟''

''کچھ مشکل سوال کر دیا ہے؟ پھر دہرا دیتی ہوں، کیا تم یہ بچے اکیلے پال سکتی ہو؟ جبکہ تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے اور تم کیا یہ ذمہ داری اٹھا سکتی ہو؟''

''مجھے ابھی کچھ سمجھ نہیں۔'' سلی آزردہ ہو گئی تھی۔

''تو کیا ہشام نے تم سے ان بچوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔''

شافیہ نجانے کیا سننا چاہتی تھی۔

''ہشام نے کبھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑا۔''

سلی کے چہرے پہ پھولوں کے سارے رنگ اتر آئے تھے۔

''تو وہ تمہارے ساتھ بچوں کی ذمہ داری بھی اٹھا لے گا۔''

شافیہ نے گہرا سانس بھرا۔

''اور اگر ان بچوں کا کوئی حقیقی وارث نکل آیا تو؟''

شافیہ کے اگلے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے تھے جب اچانک خداداد کہیں سے نکل آیا تھا۔

''کیا تم بھول چکی ہو کہ وشام کو احسانات کرنے کی عادت ورثے میں ملی ہے اور جس پر وہ احسان کرتا ہے اسے اکیلا نہیں چھوڑتا، سلی کے ساتھ تو پھر اس کی فیلنگز شامل ہیں۔''

خداداد کے چبھن دیتے الفاظ پر شافیہ یک دم چپ کر گئی تھی۔

دور سے خطیب کی آواز آ رہی تھی۔ اونچی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔

''شاعری وجود کی گہری سطحوں پر رہتی ہے، جب کہ نظریات اور ہر وہ چیز جسے ہم تصورات اور

آراء کہتے ہیں، شعور کی سب سے سطحی تہوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ نظم کسی کمیونٹی کی زندہ زبان، اس کے افسانوں، اس کے خوابوں اور اس کے جذبوں پر پلتی ہے۔ نظم کسی سماج کا سب سے مضبوط اور خفیہ رجحان ہے۔ نظم لوگوں کو اس لیے اسٹیبلش کرتی ہے کہ شاعر اپنی زبان کو پیچھے ہٹاتا ہے اور اصل ماغذ کے گھونٹ پیتا ہے۔ نظم میں سماج اپنی اصل بنیادوں کے سامنے کھڑا ہے، اپنے ابتدائی لفظ کے پاس۔ جب وہ یہ اصلی لفظ بولتا ہے تو انسان کی تخلیق ہوتی ہے۔ ایکلیز اور اوڈیسیہ دو ہیروز کے کردار سے بڑھ کر ہیں، جن کے تناظر میں یونانی تقدیر خود کو تخلیق کرتی ہے۔ نظم سماج اور اس مواد میں، جو نظم تخلیق کرتی ہے کہ بیچ مراقبہ ہے۔ ہومر کے بغیر یونانی جو ہیں آج نہ ہوتے۔ نظم ہمیں بتاتی ہے کہ ہم کیا ہیں اور دعوت دیتی ہے، ہمیں وہ بننا ہے جو ہم ہیں۔"

اس کے پاس فلسفوں کے انبار تھے وہ کسی بھی وقت کسی بھی موضوع پہ گفتگو کر سکتا تھا۔

شاید اس کو ماحول کی کثافت کی خبر بھی نہیں تھی۔

"تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

خطیب کی آواز پھر سے آئی۔ وہ ڈی سوزا سے مخاطب تھا۔

"ہاں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ ہم جلد یہاں سے فرینکفرٹ جا رہے ہیں۔ میرے والد وہاں اپنا بزنس کریں گے۔ ان کے بھائی نے ان کو بلایا ہے اور شاید میری منگنی بھی میرے کزن سے ہو۔"

یہ ایک انکشاف تھا جو خطیب کو کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔

اس نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

وہ خلوص سے بولا۔ "آج شاید انکشافات کا دن تھا۔"

کم سے کم شافیہ کو یہی لگا۔

وہ ایک خوب صورت دن گزارنے آئے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ دن اپنے انجام پہ کیسا ہو گا؟ کبھی کبھی شافیہ کو لگتا تھا کہ ہر ایک کے اندر ایک راز ہے لیکن کبھی کبھی اسے اپنی ہر سوچ بیکار لگتی تھی۔

اس وقت بھی جب بالکل اچانک غیر متوقع روسی اور بروزو آئے تھے جن کے بارے میں سلی کے ریپ میں ملوث ہونے کا خدشہ تھا اور وہ دونوں بالکل اچانک کیسے آئے تھے اور کیوں؟

اس کے پیچھے کیا وجہ ہو سکتی تھی۔

کچھ ہی دیر میں اس کے گھر کے اندر ایک سین کری ایٹ تھا۔

روسی جو پیاری سلی سے کہہ رہی تھا۔

''ٹھیک ہے ہم اچھے نہیں ہیں اور بہت اچھے تو بالکل نہیں ہیں مگر بہت برے بھی نہیں ہیں، تمہاری لالچی ماں نے بہت بار تم کو راستے سے ہٹانا چاہا ار سازشیں رچائیں مگر وہ ہم تھے جو تمہیں نقصان نہیں پہنچانے دے رہے تھے۔''

روسی کی آواز بھیگی تھی جیسے وہ رویا ہو۔

''ہم پولیس کو بیان دینے کے لیے تیار ہیں۔''

بروزو بولا تھا۔

''مانا جا سکتا ہے کہ ہم نے کوئی اچھے کام نہیں کیے مگر زندگی میں اتنے برے کام بھی تو نہیں کیے۔ تمہارے اس مکان کا سب کو ہی لالچ تو تھا کیونکہ تمہاری دادی نے اسے تمہارے نام کر دیا تھا اور جیسے ہی تمہاری ممی کو پتہ چلا وہ سب کو چھوڑ کر چلی گئی اور وہ جہاں ہے بہت خوش ہے اور تمہارا بھائی کھویا نہیں تھا وہ تمہاری ممی کے ساتھ ہی ہے وہ اچھی زندگی جی رہے ہیں۔''

بروزو کی بات سن کر ہر طرف سکوت طاری ہو گیا تھا۔

''تمہارا باپ ایک کمزور آدمی تھا اور وہ حالات کا مقابلہ نہیں کر سکا مگر تمہاری دادی ایک بہادر عورت تھی۔ اس نے بہت بہادری سے زندگی گزاری۔ تم کو اپنی دادی جسا بننا ہو گا سلی۔ یہ اداس سلی تمہاری دادی کا خواب نہیں تھی۔''

بروزو نے ایک رپورٹ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''بہت سارے الزامات کے بعد یہ ہمارا فرض تھا کہ اسے سامنے لائیں تا کہ تم اپنے مجرم تک

پہنچ سکو۔ اس مکان کا اور دکان کا جتنا بھی لالچ ہو مگر سلی، ہم نے تم کو اپنے بچوں جیسا ہی سمجھا ہے۔'' بروزو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سلی بے ساختہ رونے لگ گئی تھی۔

''میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ میرے خواب ادھورے کیوں رہے؟''

وہ سسک رہی تھی۔

''سوال یہ نہیں کہ تمہارے ساتھ یہ سب کیوں ہوا۔ بلکہ سوال یہ ہے اتنا کچھ ہونے کے بعد کوئی اتنا اچھا انسان اب بھی تمہارے ساتھ ہے۔ یہ اللہ بلیسنگ ہے اسے سمجھو اور خود ترسی سے باہر آؤ۔'' روسی نے اسے حوصلہ دیا تھا۔

''تو پھر اس رات میرے گھر میں کون آیا تھا جس نے کوئی چیز نہیں چرائی، اس کا مقصد کیا تھا؟''

وہ چلا اٹھی تھی۔

''اس کا مقصد زیورات اور پیسے نہیں تھے اس کا مقصد شاید ریپ بھی نہ تھا۔ وہ کسی اور مقصد سے آیا تھا اور تم کو اکیلا پا کر اس کی نیت بدل گئی۔''

اس نہج پہ تو کسی نے بھی نہیں سوچا تھا۔ روسی کی بات سن کر سب کو ہی شاک لگا تھا۔

''تو اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ یقینی طور پر وہ کسی کا دشمن نہیں تھا۔ کسی انتقام سے آیا تھا۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ سلی سے محبت کرتا ہو۔''

خطیب کے الفاظ پر ایک دم سب فریز ہو گئے تھے۔

''یہ ممکن ہے۔''

کسی اور نے بھی مدھم آواز میں کہا۔ یہ سنہرے تھی۔

''ہمیں پازیٹیو سوچنا چاہیے۔''

''بالکل۔'' ایک اور آواز آئی تھی۔

''وہ برے ارادے سے نہیں آیا تھا۔''

''مگر اس نے ریپ کیا، وہ مجرم ہے۔''

بہت ساری آوازیں ایک ساتھ تھیں کوئی دھیمی تھی کوئی تیز تھی مگر اس میں ایک آواز مسلسل تھی۔

”اسے محبت تھی۔“

اس آواز پر سلی کا دل ایک پل کے لیے رک گیا تھا۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ سنہرے تھی جو سلی کو ہی دیکھ رہی تھی۔

”اسے محبت تھی یا ہو گی یا ابھی بھی ہو۔“

اس بازگشت سے سلی کا مکان گونج اٹھا تھا۔

چارلز ڈکنز نے کہا۔

محبت مر نہیں پاتی۔ محبت زندہ رہتی ہے۔
محبت تو گرما کی مہکتی سانس کی مانند ہے
کہ جس کو بالائے طاقت رکھنا کیسے ممکن ہے۔
محبت کبھی یادوں سے مٹتی نہیں ہے۔
محبت بیل ہے ایسی،
جو دل کے شجر پہ آن پیوستہ رہتی ہے
محبت تو آسمانوں سے اترا جذبہ ہے
کہ جس کو کوئی خواہش نہیں ہے
عزت کی، شہرت کی،
یا پھر سونے کے سکوں کی
یہ نفسانی خواہشیں جب لہو میں بجھنے لگتی ہیں
کسی چمکتے دن کی آرزو میں محبت زندہ رہتی ہے۔
محبت چپکے چپکے دل کو ایسے کھاتی رہتی ہے
کہ جیسے زنگ کسی لوہے کو رفتہ رفتہ کھوکھلا کرے

ایسے ہی جیسے زندگی کو دیمک لگ جائے۔

''مجھے آنسوؤں نے

تو پوری طرح سے گلے سے اتارا نہیں

جس کے کارن مجھے اشک باری کی عادت ہونے لگی

جلتی راتوں نے رگ رگ کو اتنے تساہل سے جھلسا دیا

مجھ سی شب کوش کو

بعد ازاں

خواب زاری کی عادت سی ہونے لگی

چشم نظارہ وا کیجیے

دیکھیے۔''

یہ آواز اوپر تک جا رہی تھیں۔ بالکل اسی جگہ پر جہاں دو نفوس نیم اندھیرے میں موجود تھے۔ جہاں موت کا سا سکوت طاری تھا۔

جہاں آوازیں سانپ کی طرح پھنپھنا نہیں رہی تھیں۔

جہاں خاموشی بہت سے معنی رکھتی تھی۔ ایک اداس کر دینے والا منظر جس میں دو وجیہہ مرد موجود تھے۔ ایک نے سر اٹھا رکھا تھا اور دوسرے نے سر جھکا رکھا تھا۔

نیچے کچھ لوگ اضطراب میں تھے مگر اوپر موجود دو لوگ اضطراب کی آخری حد پر تھے۔

''بہتر ہے کہ تم خود لب کشائی کرو۔'' ایک سنجیدہ آواز آئی تھی۔

''میں نے سب کچھ تم کو بتا دیا ہے اب اس سے زیادہ میرا ضمیر یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔'' دوسری آواز ندامت سے بوجھل تھی۔

''میں اپنی سزا کے لیے تیار ہوں اعتراف کے لیے بھی۔''

''میں چاہتا ہوں تم پھر اعتراف کرو ایک بار پھر سے۔''

نیم اندھیرے میں ایک مجرمانہ سی آواز آئی تھی۔

اس طوفانی رات میں جب میں اوپر گیا تو خطیب سو چکا تھا میں نے دیکھا کچن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ باہر تیز بارش تھی تو میں کھانے کے لیے کچھ نہیں لا سکتا تھا۔ مجھے ایک خیال گزرا کہ میں نیچے سے کچھ لے آتا ہوں۔ نیچے والے موجود نہیں تھے بلکہ کوئی بھی نہیں تھا ہر طرف خاموشی تھی۔ میں نے کچن کیبنٹ سے کچھ تلاش کرنا چاہا۔

میں ذہنی طور پر بہت شکستہ تھا۔ پردیس کے دھکا بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں۔ ان کو جلد سے جلد سیٹ کرنا، ان کی زندگی بنانا بہت کچھ کرنا تھا۔ معاشی مسائل اور فکریں کیبنٹ میں شراب پڑی تھی او بہت وافر تھی۔ بس میں نے زندگی میں پہلی بار بہت زیادہ ڈرنک کر لی تھی اور اس کے بعد مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ میرا دماغ بند ہو چکا تھا۔ میں دل سے سوچوں تو سلی کو پسند کرتا ہوں جیسے بہت سارے لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔ اس کی معصومیت اور خوب صورتی کی وجہ سے۔ میرا کوئی برا ارادہ نہیں تھا۔ میری کوئی بری نیت نہیں تھی۔ میں نے یہ سب نہیں سوچا تھا وہ سب جو ہوا۔ میں اس سے بہت ڈر گیا تھا۔ مجھے لگا کہ میری زندگی تباہ ہو جائے گی اور میں برباد ہو جاؤں گا۔ میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔

مگر پولیس کا دباؤ اور ضمیر کی چبھن نے مجھے کہیں بھی چین نہیں لینے دیا۔ مجھے لگا کہ یہ اعتراف پولیس سے بہتر ہے تمہارے سامنے کر لوں۔ ہشام! میں تم سے یہ بھی نہیں کہوں گا کہ مجھے بچا لو۔ اگر بچنا ہی ہوتا تو میں یہ اعتراف نہیں کرتا۔ میں سزا کے لیے تیار ہوں اور جرمانے کے لیے بھی اور سارے بچے کے اخراجات کے لیے بھی۔ بس میں اس بوجھ سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔

ہشام نے دیکھا وہ رو رہا تھا۔ وہ بہت شدت سے رو رہا تھا۔ ہشام نے گہرا سانس لیا۔

"دنیا ایک بند دروازہ ہے۔ یہ ایک رکاوٹ ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ راستہ بھی ہے۔ دو قیدی جن کی کوٹھڑیاں ملحقہ ہوں وہ دروازے پر دستک دے کر ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں۔ دیوار وہ چیز ہے جو انہیں الگ کرتی ہے لیکن یہ ان کے رابطے کا ذریعہ بھی ہے۔ ہمارے اور خدا کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ ہر جدائی ایک رابطہ ہے۔"

تو یہ تھا سلی کا مجرم جو ہشام نے جان تو لیا ہی تھا بس وہ چاہتا تھا کہ وہ خود اعترافِ جرم کر لے۔

''میں ذلت بدنامی اور رسوائی سے بچنا چاہتا تھا۔ میں اس لیے اب تک چپ رہا لیکن میں اب تیار ہوں۔ تم میرے لیے جو بھی فیصلہ کرو میں پولیس کو بیان ریکارڈ کروانا چاہتا ہوں۔''

خداداد کی آواز آئی تھی۔ ''مگر تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔ میرے تینوں بھائی اپنی اپنی جگہ پہ محفوظ اور کامیاب ہیں۔ وہ محنت کریں گے اور کامیاب ہو جائیں گے مگر میری بہن، تم اس کا خیال رکھو گے تم مجھ سے وعدہ کرو۔ اس دنیا میں ہشام سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں جو وعدوں کا پاس رکھے۔''

وہ رو رہا تھا۔

''تم چاہتے ہو کہ یہ اعتراف سلی کے سامنے ہو اور وہ دونوں پر اعتماد کرنا چھوڑ دے؟ وکسی پر بھروسہ ہی نہ کرے؟''

ہشام کے الفاظ سن کر وہ زخمی سا مسکرایا تھا۔

''ایسا مشکل ہے مگر میں یہ کر گزروں گا۔ خدا کی قسم! میں نے کچھ بھی ارادتاً نہیں کیا۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے دل پر شدید بوجھ ہے۔ میں اس بوجھ سے آزادی چاہتا ہوں۔''

''اور تمہاری یہ آزادی کسی کے اعتبار کا خون کرے گی۔ وہ کبھی کسی پر بھروسہ نہیں کر سکے گی پھر کوئی ہاؤس فراڈ نہیں بنے گا اور نہ ہی کوئی اتنے کام کرنے پہ کسی کو اپنے گھر میں جگہ دے گا۔''

ہشام نے آہ بھری۔

ندامت کے آنسو

التماس

التجا

پچھتاوا

اور معافی۔

تو پھر ہشام کیا کر سکتا تھا؟

اور ہشام جیسا کیا کر سکتا تھا؟

اس نے ایک فیصلہ کیا اور اس پر مطمئن ہو گیا۔

اگلی صبح بڑی حیران کن اور عجیب تھی۔ اس نے پولیس اسٹیشن پر دی گئی درخواست کینسل کروا دی تھی۔ پھر اس نے بروزو اور روسی سے ملاقات کی اور ان سے کہا۔

''آپ بخوشی واپس جا سکتے ہیں۔ پولیس اب آپ کو تکلیف نہیں دے گی۔''

ان دونوں نے سلی سے آخری ملاقات کی اجازت لی اور دونوں واپس چلے گئے تھے۔

پھر ہشام سلی کے گھر چلا آیا تھا۔ اس نے آج سلی کے حصے کے تمام کام کر لیے تھے۔ سلی حیران تھی کہ آج کیا کچھ ہونے والا ہے۔

''خیریت تو ہے؟ آج کیا ہونے والا ہے؟''

وہ حقیقت میں بہت زیادہ حیران ہوئی تھی۔ اس نے سلی کو اپنے پاس بٹھایا اور ایک تمہید تھی جو بے معنی نہیں تھی۔ وجود کا حقیقی خوف موت کا خوف نہیں ہے بلکہ زندگی کا خوف ہے۔ یہ ہر روز اسی جدوجہد، انہی مایوسیوں اور بار بار ایک ہی درد کا سامنا کرنے کے لیے جاگنے کا خوف ہے۔ یہ خوف ہے کہ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ یہ احساس کہ آپ مصائب کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں جس سے آپ بچ نہیں سکتے اور اس خوف میں، ایک مایوسی کے ساتھ ایک تڑپ ہے کہ اے کاش!

کسی چیز، کسی بھی چیز کے لیے، اس یکجہتی کو توڑا جا سکے اور دونوں کے اس لامتناہی تکرار کو کوئی معنی دی جا سکے۔

وہ بہت سنجیدہ تھا اور سلی سمجھ سکتی تھی کہ اس کے پیچھے کوئی وجہ ضرور ہو گی۔

ہشام نے بہت محبت سے کہنا شروع کیا۔

''زندگی ایک کرہ امتحان ہے اور ہمارے سامنے سوالوں والا پرچہ کبھی کبھی توقع سے ہٹ کر آ جاتا ہے مگر ہم اپنے اعصاب مضبوط رکھیں اور کہیں بھی کمزوری ثابت نہ کریں تو بہتر پرچہ حل کر سکتے ہیں۔ زندگی بھی بالکل امتحانی پرچے جیسی ہے۔ کبھی کبھی بالکل اچانک ایسا کچھ ہو جاتا ہے جس کا تصور

محال ہوتا ہے مگر سلی جیسے لوگ بھی ہار نہیں مانتے۔ بہادر لڑکیوں کو سلی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ مضبوط لڑکیاں سلی جیسی بہترین ہوتی ہیں جو ہر طرح کے حالات سے نمٹ لیتی ہیں تو میں صرف تم کو یہ بتانا چاہتا ہوں جو کچھ تمہاری زندگی میں ہوا۔ وہ ماضی تھا۔ ہم ایک نیا آغاز کریں گے۔ تمہارے جڑواں بچوں کے ساتھ ایک خوب صورت زندگی کے ساتھ۔ ہم ماضی کو بھول جائیں گے اور سلی یہ ضرور کرے گی۔ تو کیا تم خوب صورت آغاز میں میرا ساتھ دو گی؟"۔

یہ ممکن تھا کہ سلی اسے انکار کرتی؟

کیا یہ ممکن تھا کہ سلی اسے جھٹلا دیتی؟

جس کی آنکھیں محبت تھیں۔

جس کی باتیں محبت تھیں

جس کی روح محبت تھی۔

جس کا جسم محبت تھا

جو سراپا محبت تھا۔

اور اس نے کہا تھا کہ سلی سب بھول جاؤ۔ تو اس کی محبت کا بس یہی تقاضا تھا کہ سلی سب بھول جاتی۔ اور سلی بھول گئی تھی کہ اس بھیانک رات اس کے گھر میں کیا ہوا؟

کیسے ہوا؟

کس طرح ہوا؟

اور کرنے والا کون تھا؟

سلی کو بس یہ پتہ تھا کہ جس شخص نے اسے بھول جانے کے لیے کہا تھا اس کے پاس سلی کے لیے اس بھیانک ماضی سے زیادہ حسین مستقبل تھا۔

توصی نے اس کی حسین آنکھوں کو دل میں اتارتے ہوئے اقرار کیا۔

"جھیلیں کیا ہیں؟

اس کی آنکھیں

عمدہ کیا ہے؟

اس کا چہرہ

خوشبو کیا ہے؟

اس کی سانسیں

خوشیاں کیا ہیں؟

اس کا ہونا

تو غم کیا ہیں؟

اس سے جدائی

ساون کیا ہے؟

اس کا رونا

سردی کیا ہے؟

اس کی اداسی

گرمی کیا ہے؟

اس کا غصہ

اور بہاریں؟

اس کا ہنسنا

میٹھا کیا ہے؟

اس کی باتیں

کڑوا کیا ہے؟

میری باتیں

کیا پڑھنا ہے؟

اس کا لکھا

کیا سننا ہے؟

اس کی غزلیں

لب کی خواہش؟

اس کا ماتھا

زخم کی خواہش؟

اس کا چھونا

دنیا کیا ہے؟

اک جنگل ہے

اور تم کیا ہو؟

پیڑ سمجھ لو

اور وہ کیا ہے؟

اک راہی ہے

کیا سوچا ہے؟

اس سے محبت

کیا کرتے ہو؟

اس سے محبت

مطلب پیشہ؟

اس سے محبت

اس کے علاوہ؟

اس سے محبت

اس سے محبت

اس سے محبت

''میں تمہارے لیے حسین مستقبل لایا ہوں۔ یہ کہ ہم تمہارے بچوں کے ساتھ لندن چلے جائیں گے اور ہمارا وہاں خوب صورت گھر ہوگا۔ بہترین زندگی ہوگی اور حسین سفر ہوگا۔ ہر آزمائش کے بعد اس کا انعام ہوتا ہے۔ میری آزمائش کا انعام تم ہو اور تمہاری آزمائش کا انعام میں ہوں۔''

اس نے اپنی بات مکمل کی تھی۔

وہ سلی کے ہی نہیں ان سب لوگوں کی زندگی کے فیصلے کرنے والا تھا جو اچانک اس سے جڑ گئے تھے۔

جانتا تھا، یہ بات کوئی بھی نہیں مگر سب کو اتنا پتہ تھا کہ ہشام کسی کے لیے بھی برا نہیں کرنے والا تھا۔ ہشام اتنا اچھا تھا کہ وہ کسی کے بھی بارے میں کچھ برا کر ہی نہیں سکتا تھا۔

تو وہ واقعی بہت اچھا تھا؟

بہت اچھا؟

کبھی کبھی وہ خود کو ٹٹولتا اور اس کا دل بوجھل ہو جاتا تھا۔

وہ درد محسوس کرتا تھا، مگر اس درد کا کسی کے سامنے اعتراف نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ خداداد جیسا بہادر نہیں تھا۔

اس نے ایک غلطی کی اور اس کا اعتراف کیا۔ اپنی کمزوری کا اعتراف اتنا آسان نہیں تھا مگر خداداد نے کر لیا۔

معافی بھی مانگ لی۔

اب وہ ضمیر کی قید سے آزاد تھا۔

مگر ہشام خود؟

وہ دل کے بوجھل پن سے کیوں نہیں آزاد تھا۔

وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا جو اس کی زندگی کا مکمل سچ تھا کتنا بھیانک تھا۔ کتنا بھیانک؟

”جب وہ میرے ساتھ ہوتا ہے تو میرا غم

خزاں کی بارش کے ان تاریک ایام کو یاد کرتا ہے جو

دیگر ایام کی مانند خوب صورت ہوتے ہیں۔

اس ماہ نومبر کو تو عریاں، مرجھائے ہوئے درخت اچھے لگتے ہیں۔

وہ تر بتر پھیلے سبزہ زار کے طویل راستوں پر بڑھتا جاتا ہے۔

اس کی مسرت و شادمانی مجھے بھی بے چین کرتی ہے۔

وہ مجھ سے مخاطب ہے اور میں فرط مسرت سے سرشار۔

وہ شاداں ہے کہ پرندے بھی پرواز کر چکے ہیں۔

وہ خوش ہے کہ اس کا خواب سرمئی رنگ اب کہر سے مدھم ہو گیا ہے۔

سُونے اور اجڑے درخت

دھندلی دھندلی سی زمین، بوجھل سا آسمان

ایسی خوب صورتی جسے وہ تو دیکھ سکتا ہے

مگر اسے گمان ہے کہ میں ان کے مشاہدے سے محروم ہوں

شاید اسی لیے مجھے پریشان کرتا ہے

لیکن میں تو نومبر کے ان عریاں ایام کی محبت کے بارے میں کل ہی جان پایا

برف باری سے ذرا پہلے

مگر اسے یہ بتانا لاحاصل

کیوں کہ اس کی تعریف کے لیے تو یہ تمام تبدیلیاں ہی کافی ہیں۔

☆......☆......☆

وَیَا مَنْ لَا مَنِی فِی حُبِّ مَنْ لَمْ یَرَہُ طَرْفِی

لَقَدْ أفرَطْتَ فِی وَصْفِکَ لِی فِی الْحُبِّ بِالضَّعْفِ

فَقُلْ: هَلْ تُعْرَفُ الْجَنَّةُ یَوْمًا بِسِوَی الوَصْفِ

''اے مجھے ملامت کرنے والے! اس محبوب کی محبت میں جسے میری آنکھ نے نہیں دیکھا، تو نے میر عشق کو حقیر بیان کر کے بڑا ظلم کیا ہے

تو مجھے بتا ذرا! کیا تو نے آج تک جنت دیکھی ہے، ماسوائے اس کے اوصاف سننے کے۔''

خطیب نے بوجھل دل کے ساتھ سوچا۔

اس کی منگیتر مر گئی تھی اور جو موجود تھی اسے وہ قبول نہیں کرتا تھا کیا برا المیہ تھا۔

اسے کچھ دیر پہلے ہشام سے کیا گیا اپنا مکالمہ یاد آیا تھا۔

جب وہ اسے کہہ رہا تھا۔

''خدا کی رضا میں راضی ہونا ہی بندگی ہے۔ وہ مر گئے جو تم سے جڑے تھے اور تم اپنی زندگی ختم نہیں کر سکتے اس لیے کہ یہ رب کی رضا نہیں ہے تو پھر اپنے لیے آسان رستہ چن لو اس میں تمہاری بہتری ہے اور اللہ کی رضا بھی میں سمجھتا ہوں اگر ایک دل ٹوٹنے سے بچا لیا تو تم نے پوری انسانیت کو بچا لیا تو بہتر ہے کہ تم اس کو اپنا لو جو تم سے محبت کرتی ہے۔ اسے مایوس مت کرو کہ لڑکیاں محبت کرنا چھوڑ دیں۔''

خطیب تب سے لے کر ابھی تک بس یہی سوچ رہا تھا۔

گو کہ اس نے ایسا نہیں سوچا تھا اور جو فیصلہ اس سے نہیں ہو پا رہا تھا وہ فیصلہ اچانک ہو گیا تھا بالکل اچانک جب اس نے ڈی سوزا کو ایک میسج بھیج کر زندگی کی نوید دے دی تھی۔

سنہرے نے بہت دن بعد خطیب کو مسکراتے دیکھا تو وہ بے ساختہ خوش ہو گئی تھی کیونکہ رات سے اس کا اپنا بھائی بھی بہت دن بعد مطمئن نظر آیا تھا۔ شاید ان کی زندگیوں میں کچھ تبدیلی چل رہی تھی جس سے سنہرے ناواقف تھی، مگر وہ خوش ضرور تھی۔

اور یہ سب ہشام کی بدولت تھا وہ اس جہان میں ایک ایسا انسان تھا جس کے لیے صرف ایک

لفظ تھا ''بہترین''۔

کچھ دیر پہلے وہ خداداد سے کہہ رہا تھا جو سنہرے نے چھپ کر سن لیا۔

''وہ لوگ جنہیں اپنا غم سنانے کو کوئی قابل اعتماد دوست میسر نہ ہو، تنہائی کو دوست بنا لیتے ہیں۔ سب سے دور، اکیلے بیٹھ کر خلاء میں بڑبڑاتے ہیں، زمین سے باتیں کرتے ہیں، انہیں اس سے وہی راحت ملتی ہے جو مریض کو کراہنے سے اور مغموم کو سسکنے سے ملتی ہے۔ کیونکہ غم اگر دل میں گھر کر لیں تو گھٹن بڑھ جاتی ہے۔ پھر اگر زبان انہیں بیان نہ کر پائے، اور شکوے کر کے غبار ہلکا کرنے کو کوئی میسر نہ ہو تو یہ غم انسان کو ہلاک کر دیتے ہیں اور یہ افسردگی اس کی جان لے لیتی ہے۔

سچی اور اچھی باتیں وہ جہاں سے سیکھتا تھا وہ عظیم لوگوں کی لکھی ہوئی تھیں۔ سنہرے نے مسکرا کر سوچا۔

''کوئی بھی شخص جذبات سے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ان کا وجود ہوتا اور انہیں روکنے کا کوئی بھی ذریعہ نہیں ہے ہم اپنی کسی حرکت یا کہی ہوئی بات پر تو نادم ہو سکتے ہیں لیکن کسی جذبہ یا احساس سے متعلق ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارا اس پر کنٹرول نہیں ہوتا۔''

ہشام کی آواز میں ایک تاثر تھا۔

''جو تم نے مجھ پر احسان کیا اس کا کوئی بدل ہے؟ اگر ہے تو میں چکانا چاہتا ہوں۔''

خداداد نے رو کر کہا تھا۔

ہاں اس احسان کا کوئی بدل نہیں تھا مگر پھر بھی وہ ایک ذرے جتنی کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا۔

''ہاں ہر احسان کا کوئی بدل ضرور ہوتا ہے۔ اگر کوشش کرنا چاہو تو سمجھ لو اپنے علاوہ کسی اور کے لیے جینا سیکھ لو یہ بہترین بدل ہے۔ اپنے علاوہ کسی ضرورت مند کے لیے خود کو وقف کرنا۔''

پھر وہ چلا گیا تھا اور ان دونوں کے لیے سوچ کے بہت سارے راستے کھلے چھوڑ گیا تھا۔ ان دونوں نے ہی اس سیکھ سے سیکھا کہ اپنے لیے نہیں کسی اور کے لیے جی کر دیکھتے ہیں؟

تو ایک کوشش کر لینے میں کیا حرج تھا؟

تو خطیب نے کچھ سرخ گلاب باغیچے سے توڑے اور ڈی سوزا کے گھر چلا گیا تھا۔

اورڈی سوزا پر تو شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔
کچھ دیر بعد اس کے چھوٹے سے گھر سے ہنسنے کی آواز کو سلی اور سنہرے نے بیک وقت سنا تھا اور وہ دونوں بھی مسکرا دی تھیں۔
تو ہشام! تم جیت گئے۔

☆......☆......☆

شافیہ نے اپنا سامان پیک کر لیا تھا۔
وہ سمجھ سکتی تھی کہ اب ہشام کی زندگی میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ایک ہلکی سی امید تھی کہ اگر سلی کا مجرم سامنے آجائے تو شاید ان کی زندگیوں میں بہت کچھ بہتر ہو سکتا ہے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔
سلی کا مجرم اب تا قیامت سامنے نہیں آ سکتا تھا کیونکہ ہشام نہیں چاہتا تھا اور جو ہشام نہیں چاہتا تھا وہ سلی کیسے چاہ سکتی تھی۔
شافیہ سمجھ چکی تھی اب اس کی جگہ یہاں نہیں تھی۔
اور وہ چاہتی تھی کہ ہشام کے احسانات کا بدل کچھ بہتر طور پر چکا دے اور ہشام کو اس تکلیف سے آزاد کر دے اور اسے مجبوری میں بندھے رہنے کی اذیت سے چھٹکارا دے سکے تو اس نے اپنے سرٹیفکیٹ اور مختصر سامان باندھ لیا تھا گو کہ ہشام نے اسے جانے کے لیے بالکل نہیں کہا تھا۔
شافیہ کے اندر کہیں محمود درویش چلا یا تھا۔
''میں ٹھیک ہوں......
دل کے نہاں خانوں میں
کچھ زخموں کی پرچھائیاں ہیں،
احساسات پر چونوں کے نشان ثبت ہیں،
اور یادوں کی گہرائیوں میں چند خراشیں ہیں......
ڈاکٹر کہتا ہے:

”کچھ بھی جان لیوا نہیں، بس روح کے اندر ایک خلاء ہے۔“

ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔

اس نے حسرت سے ہشام کے کمرے کی طرف نگاہ کی تھی جس کمرے کی طرف دیکھنا اور اندر جانا بس ایک خواب تھا صرف خواب۔

مجھے اندیشہ ہے،
کہیں میں تم سے اتنی محبت نہ کر بیٹھوں،
کہ تمہاری جدائی کا غم
میری روح کو گھائل کر دے
اور تمہارے بغیر
جینے کی اذیت میری زندگی کا مقدر بن جائے۔
لیکن مجھے یہ خوف بھی ستاتا ہے،
اگر میں محبت سے دستبردار ہو جاؤں،
تو کہیں محبت کی خوشبو کو محسوس کرنے کا لمحہ گنوا نہ بیٹھوں،
اور پھر میں تمام عمر پچھتاوے کی بھٹی میں جلتا رہوں
تو بتاؤ، اے دلربا،
میں کیسے تم سے محبت کروں
کہ میری سانسیں اس دکھ سے محفوظ رہیں
اور کیسے تم سے گریزاں رہو
کہ میرے وجود میں پچھتاوے کا ناتا نہ اترے۔“

اس نے ان بیلوں کو دیکھا جو اس کے لمس کی عادت تک نہ ہوئی تھیں۔

”جب ہم پہاڑی کے اس پار پہنچے

خزاں کا کہیں دور دورہ نہ تھا

دروں سے لڑھکتا وہ مکڑی کا جالا

انگشت ہوا سے دریدہ نہ تھا

دیواروں پر لٹکی ہوئی عشق پیچاں

بہاروں کے ہونے کی تمہید تھی

ابھی برگ و گل ٹہنیوں پر تھے قائم

زمین پر کوئی خشک ٹہنی نہ تھی

مگر اس کی جنگلی گلابوں کی مالا

زرد پتوں کی صورت مرجھا گئی۔"

"When we came home across the hill

No leaves were fallen from the tress

The gentle fingers of the breeze

Had torn no quivering cobweb down

The Hedgerow bloomed with flowers still

No withered petals lay beneath

But the wild roses in your wreath

Were faded, and the leaves were brown."

اس نے ایک اپنے لکھے کاغذ کے ٹکڑے کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔

ایک دانا سے استفسار کیا گیا۔

"آپ اس عظیم فہم و شعور کے مقام تک کیسے پہنچے؟ کون سی کتابوں نے آپ کو یہ فکری بلندی عطا کی؟"

دانا نے جواب دیا:

"میں نے کتابوں سے نہیں بلکہ ندی کے نشیب و فراز سے سیکھا ہے۔ پچاس زخموں کی گہرائی میں

اتر کر، ترتگڑوں کی سختیوں میں گھر کر اور بے شمار مصیبتوں کے بوجھ تلے دب کر شعور کی منازل طے کیں۔

اپنوں کی آنکھوں میں جب غداری کی جھلک دیکھی تو احتیاط کا ہنر سیکھا۔

جن سے محبت کی، ان کی نظروں میں جب بے دردی دیکھی تو خاموشی اختیار کرنا سیکھا۔

دوست کہلانے والوں کے ہاتھوں بے وفائی کا زخم کھایا تو رخصت ہونے کا ہنر اپنایا۔

اور جب بار بار اپنے پیاروں کو سپرد خاک کیا تو یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہوئی کہ محبت وہ اثاثہ ہے جسے جینا لازم ہے۔

اگر سیکھنا ہے تو دنیا کو پڑھو۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی وسعتیں لامحدود ہیں۔

یاد رکھو! زندگی میں کوئی سبق مفت نہیں ملتا، ہر سبق کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔"

اس نے کاغذ کے ٹکڑے کر دیے تھے۔

مگر اس کے ساتھ ہی کچھ اور چیزیں تھیں جو زمین پر گری تھیں۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتی ذرا ٹھٹک گئی تھی۔

وہاں کچھ لکھا ہوا تھا۔

اس نے غور سے پڑھا۔

"اپنا سامان رکھ دو جہاں سے اٹھایا ہے۔ سامنے کچن ہے وہاں جاؤ ایک کپ کافی بنا کر سامنے اس صوفے پر بیٹھ کے اپنی زندگی کے سفر کو سوچو وہاں سے جہاں تم بھی۔ یاد کرو اپنی تکلیف دہ زندگی کو اور نرجس خیام کو اور اپنی بے حس ماں کو اور لاپرواہ بیگانہ باپ کو۔ اب تو میکلورڈ روڈ سے کوسوں دور ہو۔ اس تکلیف سے بھی دور ہو، فکر معاش سے بھی دور ہو بہترین جگہ پر ہو تو سوچو!

تم یہاں سے نکل کر کہاں جا رہی ہو؟ باہر اجنبی دنیا ہے اور تم محفوظ نہیں ہوگی۔

یہ گھر تمہارا ہے۔ سامنے کارنر شیلف پر رکھے کاغذات اس مکان کے ہیں جواب تمہارے نام ہے اور وہ چھوٹا سا کیفے بھی جس کی چاہئے تم کو پسند ہے یہ تمہارے محفوظ مستقبل کے لیے ہے۔ میری ماں کے عہد کے مطابق تم بہترین زندگی گزار سکتی ہو، بالکل آزاد اور کسی پہ انحصار کیے بغیر۔ ہاں چاہو تو اپنے لیے اچھے ہم سفر کو منتخب کر سکتی ہو جو تم کو مکمل زندگی کی ہر خوشی دے گا۔

مجھے یقین ہے تم میرے سہارے کے بغیر خود اعتمادی سے جی سکتی ہو۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے اور میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ میں تم سے ملے بغیر جا رہا ہوں اس لیے کہ تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دے سکتا۔

تم ایک مکمل، خوب صورت اور بھرپور لڑکی ہو۔

مجھے یقین ہے ایک مکمل زندگی گزارو گی شاید۔ ہشام کسی کو زندگی تو دے سکتا ہے مکمل نہیں۔

میرا یہ فلسفہ تم سمجھ نہیں سکو گی۔

اگر تمہارے معاملے میں مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو مجھے معاف کر دینا۔ ایک وقت تک کے لیے خدا حافظ!

اور شافیہ کو لگا وہ چکرا کر گر جائے گی۔

وہ عظیم ماں کا عظیم بیٹا جاتے جاتے اسے زیر بار کر گیا تھا۔

کیا اسے سلی سے اتنی شدید محبت تھی کہ وہ چلا گیا۔

شافیہ بے دم سی ان ڈاکومنٹس کو دیکھ رہی تھی جو اس کے لیے تھے۔

اتنا مہنگا مکان اس میں موجود ہر سہولت اور اس کا فیوچر محفوظ کر کے وہ چلا گیا تھا۔

کاش کہ وہ ایک بار اسے مل پاتی۔

مگر وہ بھی تو ہشام سے ملے بغیر چپکے سے یہاں سے جا رہی تھی۔

''ہشام! یہ ایک ہی دل تھا اسے کتنی ہی مرتبہ لوٹ لو گے۔''

اس نے آنکھیں بند کیں تو بہت سارے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

سلی نے آنکھ کھولی اور اسے اپنے اوپر جھکا ہوا پایا۔

وہ اس کا مسیحا تھا۔ وہ اس کے زخموں کا مرہم تھا۔

وہ اس کا عشق تھا۔

اور اس کے دو بچوں کا عظیم سہارا تھا۔

اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کبھی بھی سلی کو یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ڈاکٹر نے اسے مزید ماں بننے سے منع کر دیا تھا۔

اس کی ڈیلیوری میں کچھ پیچیدگیاں تھیں۔ مگر سلی کو کوئی غم نہیں تھا۔ اس لیے کہ ہشام اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس کے بچوں کا بہترین باپ تھا۔

اور وہ لندن میں موجود تھے۔ اس سال وہ جرمنی جانے والے تھے اور جرمنی والے ان کی راہ تک تک تھک چکے تھے۔

وہ سب بے تاب تھے۔

خطیب اور ڈی سوزا جن کی شادی دو سال پہلے ہوئی تھی، ان کی ایک پیاری سی بیٹی تھی۔

اور ڈی سوا سلی کے بچے دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے بے تاب تھی جبکہ دوسری طرف شافیہ کا ایک بیٹا تھا جو چند دن پہلے ہوا تھا۔

شافیہ اسی ہشام والے گھر میں تھی۔ اور اسی کا دیا کیفے چلا رہی تھی۔ سنہرے اور اس کے بھائی شافیہ کے ہیلپر تھے جبکہ خداداد ان کے کاروبار کو ہینڈل کرتا۔

وہ ہی مغرور سا خداداد جو پاکستان میں شافیہ جیسی لڑکیوں کو منہ نہیں لگاتا تھا بلکہ وہ ہی خداداد شافیہ کا کاروبار اور زندگی سنبھالتا تھا۔

جی بالکل خداداد نے اپنے لیے جینا ترک کیا اور خود غرضی سے باہر نکل کر دیکھا تو شافیہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا تھا۔

کچھ وقت دونوں نے ساتھ مل کر کام کیا، ایک دوسرے کو سمجھا اور پھر شادی کر لی تھی۔

شافیہ کی پاکستان میں فیملی اپنی نیت کا پھل پا چکی تھی، سمیرا کو فالج ہو گیا تھا اور عرشیہ لو میرج کر چکی تھی۔

اس کے والد اب اس دنیا میں تھے۔ یہی کرنی کا پھل تھا۔

شافیہ یہاں پرسکون اور خوشحال زندگی گزار رہی تھی۔

خداداد کو لگا کہ زندگی کی اصل خوب صورتی یہی ہے کہ کسی دردمند کے کام آ سکے۔ کسی کا آنسو پونچھ کر جو حقیقی خوشی میسر تھی وہ کسی اور چیز میں نہیں تھی۔

وہ ایک بھرپور زندگی گزار رہے تھے اور اکثر ویک اینڈ پر محفل سجاتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہشام اور سلی بھی ان میں شامل ہوں۔

لندن کی کہر زدہ سویر میں ہشام اپنی جاں نثار بیوی کو فدا ہوتی نظروں سے دیکھتا اس خوب صورت منظر کو سوچ رہا تھا جس میں اس کے جرمنی والے دوست موجود تھے۔

ان کو آباد کرنے اور کامیاب کرنے میں ہشام نے اپنی تمام تر کوششیں صرف کی تھیں، مگر کیا وہ سب صرف اس نے ان تمام لوگوں اپنے دوستوں یا جاں نثاروں کے لیے کیا تھا، یا اس میں ہشام کا بھی کچھ حصہ تھا؟

اس نے لندن کی کہر زدہ سویر سے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سلی سے اسے پہلی نظر میں محبت ہو گئی تھی۔

وہ جانتا تھا سلی بھی اسے چاہتی ہے، وہ عام لڑکیوں سے الگ تھی بہت معصوم اور انجان تھی۔

اسے دنیاداری کا نہیں پتہ تھا وہ لاکھوں میں بس ایک ہی تھی۔

پھر اس کے ساتھ حادثہ ہوا۔

اصل دردناک پہلو یہ تھا کہ اس حادثے کا اصل مجرم ہشام کا دوست تھا۔

پھر بھی ہشام نے اسے معاف کیا۔ اس وعدے کے ساتھ کہ سلی کو کبھی کچھ بھی پتہ نہیں چلنا چاہیے اس کا مجرم ہمیشہ روپوش اور لاپتہ رہے گا۔

بھلا خداداد کو اور کیا چاہیے تھا۔ اس نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اپنے اندر سب کچھ دفن کر لیا۔

کوئی بھی اس حقیقت کو نہیں جان سکا۔

سلی کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی جن کا عزیز از جان باپ انتہائی قابل ترین ڈاکٹر تھا جوان پر جان دیتا تھا۔

سلی کا شوہر دنیا کا سب سے اچھا شوہر تھا۔

اور یہ بہترین احساس تھا۔

سب کی زندگیاں مکمل تھیں۔

مگر یہ مکمل کیسے ہوئی تھیں؟

ہشام نے سب کو ان کے راستے بتا دیے، ان کی منزل دکھا دی، ان کو سمجھا دیا اس راہ سے گزر کر مکمل ہو جاؤ

اور خود وہ کیسے مکمل ہوا؟

سلسبیل کے وجود کی چھاؤں میں جنت کے ان چشموں میں بہتے ہوئے سفید جھرنوں کی چادر نے اس ادھورے مرد کو جس نے ہر ایک کی زندگی کو مکمل کیا تھا کو مکمل کر دیا تھا۔

ہشام کو سلسبیل نے مکمل کیا تو وہ عمر بھر کے لیے اس کا مشکور تھا۔ جبکہ سلسبیل کی نظر میں وہ کوئی فرشتہ تھا یا کوئی دیوتا یا کوئی ایسی ہستی جس کا کوئی متبادل اس کی زندگی میں نہیں تھا۔

ہشام کو سلسبیل نے مکمل کیا،

وہ جو کبھی بھی دنیا کی ساری دولت لگا کر بھی باپ نہیں بن سکتا تھا۔

تو اسے سلی نے مکمل کر دیا تھا۔

جب وہ پاکستان سے واپس آیا تو اس کے کچھ ٹیسٹ رپورٹس اچھے نہیں آئے تھے جب وہ آیا تو سلی کے ساتھ حادثہ ہو چکا تھا۔

دوسرا دھچکا اسے اپنی رپورٹس دیکھ کر لگا تھا، جس میں اسے بتایا گیا کہ اس کے اندر باپ بننے کی صلاحیت نہیں تھی۔

وہ اندر سے ختم ہو گیا۔

مگر گیا۔

مگر سلی نے اسے دوسری زندگی بخش دی تھی۔

تب ہی ہشام نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ ان بچوں کو ختم نہیں ہونے دے گا انہیں زندگی دے گا اور نام بھی۔

وہ اس کے نام سے منسوب ہو کر خود بھی مکمل ہوں گے اور اس کے وجود کو بھی مکمل کریں گے تو شایفہ جیسی مکمل لڑکی کو کیوں سزا دیتا؟

وہ کیوں ماں بننے سے محروم رہتی؟

اس نے شافیہ کو چھوڑ دیا تاکہ وہ بھی مکمل زندگی گزار سکے۔

ہشام نے سلسبیل کو اپنا لیا تاکہ وہ بھی مکمل زندگی جی سکے۔

اور خود وہ سلسبیل یعنی اس بہتے چشمے سے سیراب ہو کر اپنے اندر کی تمام کمزوریوں کو چھپا گیا۔

تو کیا ڈاکٹر ہشام نے ان سب کے لیے اتنا کچھ کیا یا صرف اپنے لیے؟

یہ فیصلہ آپ پر چھوڑ دیا گیا ہے۔